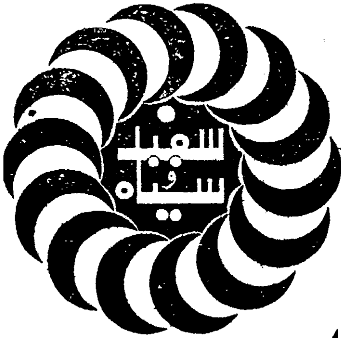
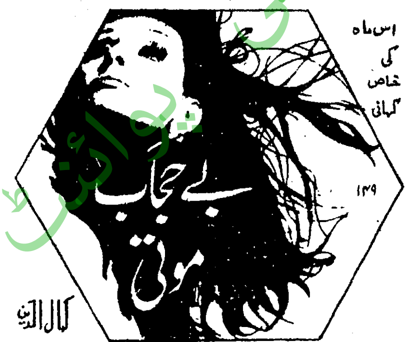
دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

سب رنگ ڈائجسٹ

مدیر: شکیل عادل زادہ



اس ماہ
کی
خاص
کہانی



مصر کی ایک قدیم عبرت انگیز کہانی

شمارہ : ۲	O	جلد : ۳	
قیمت فی پرچا	O	۱/۷۵	روپے
زرِ سالانہ	O	۱۸	روپے
مشرقی پاکستان میں	O	۲	روپے

سرورق طباعت :۔ ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی
پبلشر شکیل عادل زادہ نے قاسم نورانی کے اہتمام میں "پاکستان ہیرالڈ پریس ضیاءالدین روڈ"
کراچی سے چھپوا کر ۵ سی، ۴/۱۳ ناظم آباد کراچی ۱۸ سے شائع کیا

پتا :۔ ۴۷ ـــ ۴۸ پریس چیمبرز۔ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی
فون :۔ ۲۲۵۸۴۴

ذیلی دفتر :۔ لطیف ہاؤس، کرشن پورہ، پشاور

بے غیرت

جو ہو رہا ہے، اُسے خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ اب چرب زبانی اور لسیار گوئی کا موقع نہیں۔ جو لوگ مملکت کی مسند پہ جلوہ افروز ہیں، انہوں نے دوسروں کے حقوق غصب کر کے کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔ اسے غنیمت جانیئے کہ ایسے وقت یہ لوگ آ گئے ہیں۔ جن کے چہرے مانوس ہیں۔ جن کی باتیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں اور جو بہت قربت اور لگاوٹ کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر یہ صورتحال نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔؟ حکومت ان لوگوں کو منتقل ہو گئی ہے جنہیں حکومت کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ ۲۴ سال میں اس قوم نے بڑے کھیل دیکھے۔ کسی ملک کے لوگوں کے ساتھ ان کے لوگوں نے اتنا بڑا مذاق نہیں کیا ہو گا۔ جتنا اس خطۂ ارض میں تسلسل اور بے حیائی کے ساتھ جاری رہا۔ کیا اس سے بڑی رُسوائی ممکن ہے؟ پر اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لوگ بڑے بے حس ہو گئے ہیں۔ گزشتہ رُبع صدی کا زمانہ زہریلا زمانہ تھا۔ اُس نے ایک نسل کو بے غیرت، بے ضمیر اور بے حس بنا دیا۔ ہم خود سے بچھڑ گئے۔ ایک دوسرے پہ الزام تراشی، طعنہ زنی، کاہلی، جہالت، تاریکی اور بنیادی مسائل کو ٹالنے کی جو عادت ہمیں پڑ گئی ہے۔ اُس نے ہمارے قومی مستقبل کو اب بالکل دُھندلا دیا ہے۔ سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ جو باتیں ایسے اندوہناک موقع پر نہیں کہنی چاہئیں۔ وُہ کہی جا رہی ہیں۔ جن مطالبات کو منوانے کا ابھی وقت نہیں آیا اُن کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ علاقائی بُغض، فرقہ وارانہ منافرت، لسانی تعصب، علیحدگی پسندی، حکومت میں صوبوں کے حصّے اور آئینی مسائل پر اختلاف کی تحریکیں ایسے وقت جاری ہیں جب لوگ پوری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ شیرازہ بکھر چکا ہے اور ہمتیں جواب دے چکی ہیں۔

نئی حکومت نے اس ملک کی تاریخ کے سب سے بُرے دنوں میں عنانِ اقتدار سنبھالی ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے مسئلوں پر غیر ضروری توجہ دی گئی اور بہت سے بنیادی معاملوں سے لاپروائی برتی گئی مگر اس انتشار کی حالت میں کوئی بھی آتا، تو اس سے یہ غلطیاں سرزد ہوتیں ۔۔ اور پھر کون ہوتا؟ اقتدار کس کو سونپا جاتا۔ کیا وہی وطن فروش اور بددیانت لوگ برسرِ اقتدار رہتے یا دو چار نمائندوں کی کسی جماعت کو یہ ذمہ داری تفویض کر دی جاتی۔؟؟ ۔۔ اور فرض کیجئے کہ نئی حکومت نے اپنے منشور اور دعووں کے مطابق اس ملک میں بنیادی اصلاحات نافذ نہ کیں اور یہاں کی قومی زندگی کو منقلب نہیں کیا۔۔۔ تو اس حکومت کو بدلنا اتنا مشکل نہ ہو گا جتنا اسلحہ کی بنیاد پر قائم کی ہوئی حکومتوں کو سامنے سے ہٹانا ہوتا ہے۔ اتنی رعایت ضرور دیجئے کہ نئی حکومت کی جماعت کا منشور اس وقت مرتب کیا گیا تھا جب مُلک اتنے ناگفتہ بہ حالات سے دوچار نہیں تھا۔ ان اندھیروں کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسائل عام انداز سے مختلف ہیں۔ ایک پوری قوم داؤ پر لگی ہے۔ جنگ ابھی بند ہوئی ہے اور کسی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔ ایک حصّہ ملک سے چھن گیا ہے۔ سوا لاکھ کے قریب ہمارے عزیز، دشمن کے نرغے میں ہیں۔ اُس کی فوجیں علاقوں میں اندر تک آئی ہوئی ہیں۔ شدید معاشی بحران ہے۔ ہر طرف مایوسی ہے۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ چکا ہے۔ اس تباہ شدہ مکان کے ملبے سے ہی اب ایک آشیانہ تعمیر کرنا ہے۔ کون کہتا ہے کہ یہ کام لمحوں میں ممکن ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک حکومت آئی۔ اُس نے فیصلے کر دیئے اور مسائل سلجھ گئے۔ بُرائیاں بہت گہری ہیں۔ ظاہر ہے کہ انقلاب برپا کرنے کے لئے صرف اقدام، جرأت اور فیصلے ہی کافی نہ ہوں گے بلکہ دانش، منصوبہ بندی اور محتاط روی کی بھی ضرورت قدم قدم پر پڑے گی۔ اس کے لئے وقت درکار ہو گا۔ اگر یہ وقت نہیں دیا گیا اور فتنہ پردازیاں جاری رہیں۔ ناکام لوگوں نے کینے اور انتقام سے کام لیا اور تحمل، اور رواداری کو شعار نہ بنایا تو جو کچھ ہو گا۔ وہ موجودہ صورتحال سے زیادہ ہولناک ہو گا۔ ممکن ہے یہ باتیں کرنے کا بھی موقع نہ ملے۔ بہتر ہے کہ سنجیدگی اختیار کی جائے۔ یا کچھ اور سوچ لیا گیا ہے تو صاف صاف بتا دیا جائے۔

اِن سطور کو لکھنے کے بعد ہم یہ وضاحت ضرور کر دیں کہ ہمارا تعلق کسی جماعت یا گروہ سے نہیں۔ ہمارا شمار انقلاب پسندوں میں کیجئے۔ ہم ان لوگوں میں شامل ہیں جو اس ملک کی قسمت بدلنا چاہتے ہیں ۔۔ اس شکستہ، غیر منظم اور نامستحکم سماج کی پناہ ہمیں انقلاب ہی میں نظر آتی ہے۔ ہم انقلاب کے حامی اور داعی ہیں اور ہمارا اصرار ہے کہ اس کے لئے باقاعدہ کسی "ازم" کی ضرورت نہیں۔ نیت کا خلوص شرط ہے۔

ذاتی صفحہ

کاش لفظوں کی شدت کا کوئی پیمانہ مقرر ہو جاتا۔ یہ بات طے ہو جاتی کہ کون سے درجے اور شدت کے اظہار کے لئے کن لفظوں کو منتخب کیا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کا سب سے بڑا فائدہ ان لوگوں کو ہوتا جو نامہ شوق لکھتے ہیں۔ جو محبت کرتے ہیں اور اپنا دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر بھی مضطرب رہتے ہیں کہ اظہار میں بلاغت اور فصاحت کی کوئی کمی رہ گئی ہے کہیں کچھ رہ گیا ہے۔ اگر لفظ جذبوں کا احاطہ کرنے پر قادر ہوتے تو میں اس صفحے میں اپنے اظہار شوق کے لئے انتہا انتہا لفظ منتخب کرتا۔ سب رنگ سے میری رفاقت کا آپ کو اندازہ ہے۔ جنہیں کسی سے وابستگی کامل کا دعویٰ ہے میرے دل کا احوال کچھ وہی محسوس کر سکیں گے۔ سب رنگ میری کمزوری ہے۔ یہ ذاتی تحریر میرے جنوں کی عکاسی ہے۔ سب رنگ کے سوا میرا کوئی اور وصف نہیں۔ میرا وصف سب رنگ میرا جذبہ سب رنگ ہے۔ یہ ہے تو میں ہوں۔ یہ نہیں تو میں نہیں۔ میرے اس دعوے میں میرا اظہار مضمر ہے۔ لفظ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ تو بہت بے مایہ ہیں۔ بین السطور میں جو لکھا ہے اسے پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ اسے محسوس کیجئے۔ ذاتی صفحے میں مجھے ہمیشہ لفظوں کی تنگ دامنی کا احساس ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح جب آج سے چند سال پہلے میں اسی قسم کے نامے لکھا کرتا تھا۔ تب بھی مجھے یہ شکایت رہتی تھی۔ اب کوئی نہیں جسے وہ تحریریں لکھی جائیں۔ اب تو سب رنگ ہے۔ جسے سب پر فوقیت حاصل ہے۔ گزشتہ دنوں جب میرے ماہ و سال کا تجزیہ میرے دوست کہیں کرتے تھے تو کہہ رہے تھے کہ اگر ایسا ہو جاتا تو سب رنگ نہ نکلتا۔ بہتر ہوا کہ چند لوگوں نے وفا نہ کی۔ سب رنگ نکل آیا۔ سب رنگ نے میری تمام مایوسیوں کی تلافی کر دی اور مجھے یقین ہے کہ میرا یہ محبوب اوروں کی طرح بے وفا نہ ہوگا۔

تو دوستو تمہارے ذہن کو جو لفظ سب سے زیادہ متاثر کرتے ہوں تم میرے اظہار کے لئے انہیں تصور کرو۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سب رنگ اور اس کے ہر کار کنوں سے میرے تعلقات پر بعض اوقات نظر انداز کر جاتے ہیں۔ میں نے ایک بار کہا تھا کہ سب رنگ ایک شخص ہے۔ میں کہتا ہوں اسے زندہ رہنے دیجئے۔ سب رنگ زندہ ہو جائے گا۔ جب مجھ پر زوال آئے گا تو سب رنگ پر زوال آ جائے گا۔ میں نے تنہا سب رنگ کا اہتمام کیا تھا۔ میں تنہا بہت ہوں۔ میرے ساتھ میرے جذبے ہیں۔ جو عشق کرتے ہیں وہ دوسروں کے عشق کو حسد کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ بہرحال ہو گا یہ کہ ان کے ہاں کوئی کھوٹ ہے۔ دو سال بہت ہوتے ہیں۔ خوب۔ اب تو میرے صبر و ضبط کا امتحان ہو گیا۔ دیکھا سب رنگ نے کیسا رنگ جمایا۔ کیسا تماشا کیا۔ اب سب رنگ ایک مکمل، جامع، معیاری اور مقبول ترین رسالہ ہے۔ اس کا اپنا ایک علیحدہ انداز ہے۔ جہاں جہاں لوگوں نے تعاقب کیا۔ اس نے راستے بدل دیئے۔ اس نے اپنی پناہ اور سکون کے نئے ٹھکانے ڈھونڈے۔ نئے حلاوتوں کو تلاش کیا اور نت نئے تجربے کئے۔ اس دنیا میں اگر تقلید و تطبیق کا عمل نہ ہوتا تو انسانی تاریخ یہاں تک آتی۔ میں نے جو کچھ دیکھا سنا اور سیکھا تھا۔ اس کا یہ سب ماحصل ہے۔ لیکن میں نے پہنے ہوئے پر کوشش ضرور کی ہے کہ گزشتہ تجربوں کا ایک ایسا مرکب تیار کیا جائے جو نیا معلوم ہو۔ جس کا ذائقہ مختلف ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب رنگ کی ترتیب ہے۔ یہ نیا راستہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ سب رنگ کی مثال سامنے ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جو نمایاں خصوصیات سب رنگ کا امتیاز ہیں۔ جو سب رنگ میں تمام تر اہتمام کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی تردید و تنقیص سے تو صرف سب رنگ کو فائدہ پہنچے گا۔ اس سے تو سب رنگ کی شان اور بڑھے گی۔ سچ تو سب رنگ کا مرتبہ بلند کرنے کا فریضہ شعوری فریضہ انجام دیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے لئے کچھ نہیں کر رہے بلکہ ونسل مہلک ہوتی ہے یہ تو بیدی سادہ تجارتی اور نفسیاتی نکتہ ہے۔ یہ شمارہ کاغذ کے قحط میں شائع کیا گیا ہے۔ کوئی ہمارے حال پر ترس نہیں کھاتا۔ حیرت ہے کہ اس ملک میں کاروبار اشاعت ایک سال سے بند ہے۔ حکومت کی نظر میں صرف اخبارات ہیں۔ گویا خبروں کے سوا کسی قسم کا لٹریچر اس ملک کے لوگوں کو نہیں پڑھنا چاہیئے۔ صرف چند سرمایہ دار اخبارات کو معقول کاغذ ملنا چاہیئے جو کنٹرول ریٹ پر کاغذ لیتے ہیں۔ کم صفحات چھاپتے ہیں اور اخبار کی قیمت میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہر ماہ ایک بار سب تمام رجسٹر دیکھ کر متعلقہ محکمے نے جس اشاعت کا تخمینہ لگایا تھا اس سے نصف کاغذ دیا گیا۔ پھر دس فی صد کم۔ اور اب شاید بند کر دیا جائے۔ کوئی بتائے کہ کس طرح خود و ملکان کرکے یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا۔ اس ملک کی ریت عجب ہے۔ جب مسائل ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ تب یہاں کچھ سوچنا شروع کیا جاتا ہے۔ کاغذ کا مسئلہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو آپ دیکھتے کہ سب رنگ میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتیں۔ ایک مہینے سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اب کہیں بڑی مشکل سے یہ قسط سب رنگ تیار ہوا ہے۔ اس کے باوجود قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ نہ صفحات کم کئے گئے ہیں اور نہ سائز چھوٹا کیا گیا ہے۔

اس مہینے مجھے بہت سے خطوط کا تذکرہ کرنا تھا۔ لوگ سب رنگ سے اپنے اشتیاق کا طرح طرح سے مظاہرہ کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں مجھے بہت دلچسپ خطوط موصول ہوئے۔ "ہیلو سب رنگ" "ڈارلنگ سب رنگ" "میرے سب رنگ" "سب رنگ عادل زادہ" "میری جان سب رنگ" کس کس انداز سے سب رنگ کو مخاطب کیا گیا۔ ایک جواں سال شاعرہ نے تو ایک نظم لکھ دی۔ پوری نظم کی اشاعت ممکن نہیں۔ چند سطریں پڑھئے۔

تو کہ جو پھول ہے نافشگفتہ
شفق رنگ، دھنک رنگ، صد رنگ کھلا
تیرے ہر رنگ سے نکھری نئی خوشبو کی حدیث
جس کے سینے میں جنم لیتے رہے حرف سکوں، رازِ جنوں
تپتے ماحوں میں دن بھر کے تھکے لمحوں نے
جس کی مہکار سے آسودہ نگاہی پائی
تو کہ اطراف ترے چاہنے والوں کا ہجوم

وغیرہ وغیرہ۔ ایک بات مجھے اور لکھنی تھی کہ سب رنگ میں کہانیوں کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔ اب میں آئندہ اشاعت میں تفصیل سے لکھوں گا۔ موجودہ شمارہ اپنے معیار اور دلچسپی پوری طرح برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جو مجھے پسند آیا ہے اور جو آپ کو پسند آتا ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان اتنی مفاہمت تو ہو ہی گئی ہے۔ صفحہ پلٹیے اور میرے دل کے اس قصے کو ختم کیجئے۔ میں خود کو ایک ماہ کیلئے پھر آپکے تصور میں گم کرتا ہوں۔ دیکھنے اس بار میں نے اپنا بھرم کہاں تک برقرار رکھا ہے۔






الیاس سیتاپوری

شنازی کو لکھنؤ بالکل پسند نہ آیا۔ اس نے پیر پنجال کی ہیبت سے مہینوں سفر کی صعوبتیں اور دشواریاں اس توقع میں جھیلی تھیں کہ اس کے خیال میں پوری دنیا اس کے وطن کشمیر کی طرح حسین اور دلکش ہوگی لیکن جب وہ دریائے راوی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گنگا جمنا کے دوآبے میں داخل ہوئی تو اسے یہاں کی ہر چیز اپنے وطن سے مختلف اور تکلیف دہ محسوس ہوئی۔ یہاں نہ تو پہاڑ تھے نہ دلربا گھاٹیاں نہ سرسبز وادیاں، گنگناتے چشمے نہ خنک ہوائیں اور پر دور بلندی پر دھوپ میں چمکتے ہوئے برف کے تختے، انواع و اقسام کے پھلوں سے لدے مہکتے درخت طرح طرح کے پھولوں سے آراستہ قطعات جنت کی ساری نشانیاں تو وہ اپنے وطن میں چھوڑ آئی تھی۔ اودھ میں ان کے بدلے اسے کیا ملا؟ خاک دھول، بدوضع لوگ سانولے کالے گندے گندمی کرن سا رنگ تھا جو یہاں والوں میں تھا۔ یہاں کی ہر چیز میں انتشار اور بدنظمی پائی جاتی تھی یہاں چنار کی جگہ املی، پیپل، جامن اور آم کے بڑے بڑے درخت ہر طرف پھیلے ہوئے تھے شنازی کی طبیعت میں لالچ نہ ہوتا تو وہ ایک پل بھی لکھنؤ میں نہ ٹھہرتی۔

اسے اس کا استاد میر قدو بڑے سبز باغ دکھا کے لکھنؤ لایا تھا۔ میر قدو اس کا استاد بھی تھا اور ایک طرح سے باپ بھی کیونکہ شنازی نے جب سے ہوش سنبھالا تھا میر قدو ہی اس کا سب کچھ تھا۔ حالانکہ بعض لوگوں نے اسے یہ بتا دیا تھا کہ میر قدو اسے بچپنے ہی میں کہیں سے اغوا کر لایا تھا اور نہایت محنت اور توجہ سے اس کی پرورش کی تھی۔ میر قدو ناچ گانے کا بے مثل استاد تھا چنانچہ شنازی نے یہ دونوں فن اسی سے حاصل کیے تھے۔ طبیعت میں فطری طور پر فنونِ لطیفہ کا مذاق موجود تھا اس لیے وہ رقص و موسیقی میں بڑی جلدی بہت اچھی رقاصہ اور مغنیہ بن گئی۔ جب وہ گاتی تو طبیعت میں ایک لہر سی اٹھتی اور اس لہر میں ایک نشہ سا ہوتا جس کی سرخوشی اس کے سارے وجود کو سرشار اور پُرخمار کر دیتی اسی طرح جب وہ محوِ رقص ہوتی تو اس کا سر سے ہر عضو تھرکنے پھڑکنے لگتا۔ گھنگھروؤں کی آواز پر پیروں میں حرکت، دل میں ولولے، طبیعت میں جوش و سرور اور خون میں تیزی اور گرمی پیدا ہو جاتی۔ ان دونوں کمالوں کے سوا اسے حسن بھی ایسا عطا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑا سرکش بھی اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اپنی گردن جھکا دینے پر مجبور ہو جاتا۔

میر قدو نے جب دیکھا کہ کشمیر میں شنازی کے صحیح قدر دان کا ملنا ناممکن ہے تو اس نے ایک دور دراز خطے اودھ کا رخ کیا۔ اودھ کے نوابوں کی رنگین طبع، عیش پرستی اور داد و دہش کا دور دور شہرہ تھا اس نے سن رکھا تھا کہ یہاں کا نواب عقل کا اندھا لیکن گانٹھ کا پورا ہے۔ بخشش اور انعام میں جتنی بے اعتدالی یہاں پائی جاتی تھی، پورے ہندوستان میں اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی تھی۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد دربارِ اودھ میں رسائی ایک دشوار مسئلہ تھا۔ ہم پیشہ حضرات میں ایک قسم کی جلن پائی جاتی تھی اور حسد اور رقابت میں وہ ایسی تدبیریں کرتے رہتے کہ شنازی نواب نصیر الدین حیدر تک نہ پہنچ سکے لیکن میر قدو ہار ماننے والا کب تھا۔ شنازی کے حسن اور رقص و موسیقی کا شہرہ خود بخود ہوتا تھا۔ ایک دن شہر کوتوال بختاور سنگھ کے کانوں میں بھی یہ بات پہنچی رات کے اندھیرے میں لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا بختاور سنگھ شنازی کے در پر پہنچ گیا۔ اگر لکھنؤ کی جگہ یہ کوئی اور شہر ہوتا تو بختاور سنگھ ذرا بھی خوف نہ کھاتا اور بے دھڑک دن دہاڑے شنازی کے پاس پہنچ جاتا لیکن یہ لکھنؤ تھا۔ اودھ کا دارالخلافہ، اودھ کا شوقین مزاج اور حسن پرست نواب نصیر الدین حیدر اسی شہر میں رہتا تھا اور یہ بات نواب کے لیے بےحد ہتک آمیز اور افسوسناک تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے شنازی جیسی حسین اور باکمال رقاصہ اور مغنیہ کسی دوسرے شخص کی آغوش کی زینت بنے۔ ریاست کے ہر شخص کی ذمہ داری تھی کہ وہ جب اور جہاں کہیں بھی کوئی حسین اور باکمال عورت کو دیکھے تو اس کی اطلاع نواب تک ضرور پہنچائے ورنہ خیانتِ مجرمانہ کا مجرم ٹھہرتا اور کسی خوفناک سزا کا مستحق قرار پاتا۔

شنازی جس مکان میں ٹھہری تھی وہ کچھ زیادہ شاندار نہ تھا۔ اس کے اوپری حصے میں صاحبِ خانہ کا خاندان رہتا تھا جو انگریزی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھا اور اس کی زیادہ تر رہائش کانپور میں رہتی تھی۔ کبھی کبھار ایک آدھ ماہ کے لیے آتا اور پھر واپس چلا جاتا۔ ان دنوں کی بات ہے جب کمپنی اور نوابِ اودھ کے مابین یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ نواب اودھ فوج نہیں رکھ سکے گا۔

معمولی قسم کے جھاڑ فانوس روشن تھے۔ ان کی روشنی میں جب بختاور سنگھ اپنے مخصوص لباس میں پستول لگائے میر قدو کی اجازت سے اندر داخل ہوا تو شنازی خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں [illegible] کی طرح

اُدھر کڑھی ہوئی مونچھیں کچھ زیادہ ہی خوفزدہ کر رہی تھیں، موقع شناس
میر فدّو ذرا بھی خائف نہ تھا اسے خوب اندازہ تھا کہ خوش قسمتی سے خُدا
نے خود ہی ایک ایسے آدمی کو اس کے پاس بھیج دیا ہے جو اس کی تنازی کو
بآسانی نواب اوَدھ کی خدمت میں پہنچا سکتا ہے۔ بختاور سنگھ کو میر فدّو
کی ذہانت یا چالاکی کا کوئی علم نہ تھا۔

جب وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے نوابوں کی طرح تنازی کے
روبرو بیٹھا اور فانوس کی روشنی میں اس نے تنازی کے قیامت خیز حسن
پر نظر ڈالی تو وہ کہیں کا بھی نہ رہا۔ بس دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ تنازی کے
کالے کالے گھونگھریالے بالوں کی موٹی چوٹی جس میں سُرخ موباف پڑا ہوا تھا
پشت پر پڑی ہوئی تھی آب رواں کا باریک دوپٹہ سر پر پڑا تھا اور اس نے
دونوں شانوں کو کچھ اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ بازو جو بھی کھلے ہی رہتے تھے
اور یہ بذات خود اتنا باریک تھا کہ اندر سے نظر آنے والی ہر شے دلکشی اور
حسن میں دوبالا ہو گئی تھی۔ زرد چمکدار رومی اطلس کا پاجامہ اس کے سڈول
کولھے پر ایسی بہار دکھا رہا تھا کہ بختاور سنگھ کی کوتوالی کا نشہ ہرن ہو گیا۔
تھوڑی دیر پہلے جب وہ یہاں داخل ہوا تھا تو اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے
عہدے کے دھونس پٹّے سے کام نکال کے اپنی راہ لے گا لیکن جب تنازی کو
دیکھا تو پتا چلا کہ یہ معاملہ صرف چند لمحوں کا بھی نہیں ہے بلکہ وہ اس کا
مستقل اسیر ہو چکا ہے۔ بختاور سنگھ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی
طرح تنازی کو مستقل ہی اپنے گھر میں ڈال لے لیکن مصیبت یہ تھی کہ تنازی
مسلمان تھی اور بختاور سنگھ ہندو۔

میر فدّو نے نہایت ادب سے اس کے سامنے پیچوان رکھ دیا اور تنازی
خاصدان میں گلوریاں لگا لائی۔

بختاور سنگھ حقے کا کش لے کر دھویں کو چھوڑتا ہوا میر فدّو سے مخاطب
ہوا ”تمہیں کشمیر سے یہاں آئے کتنا عرصہ ہوا؟“

میر فدّو نے ہاتھ باندھ کے عرض کیا ”بندہ پرور! صرف ایک ہفتہ!“

”یہ مکان کرائے کا ہے؟“

”جی بندہ پرور!“

بختاور سنگھ نے تنازی کو لگاوٹ کی نظروں سے دیکھا اور میر فدّو
سے مخاطب ہوا ”اب کیا ارادے ہیں؟“

میر فدّو نے دفعتاً تیر چلایا ”غریب پرور! کیا غریب اور کیا غریب

کا ارادہ“ فدّو نے دربار اوَدھ کی بڑی تعریفیں سُن رکھی تھیں، معلوم ہوا تھا
کہ اوَدھ کا نواب حسنِ فن اور ہنر کا سچا قدر دان ہے اور ان چیزوں کی صحیح
قیمت لگاتا ہے بس اسی خوش خیالی اور خوش فہمی میں بندہ لکھنؤ وارد ہوا
تھا سو اب یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ نواب اوَدھ کی پابوسی کس طرح
حاصل ہو؟“

بختاور سنگھ کسی سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر
مُردہ سی آواز میں بولا ”نواب اوَدھ کی سرکار بہت بڑی چیز ہے وہاں تک
ہر کس و ناکس کی رسائی بڑی دشوار بات ہے ظاہر ہے کہ تمہارے فن اور
ہنر کی جو قیمت قبلہ نواب صاحب ادا کریں گے ہم تابعداروں کی کیا حیثیت جو
اس کا تصور بھی اپنے دل میں لائیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم بھی چونکہ اسی دربار
سے وابستہ ہیں اس لیے حسنِ فن اور ہنر کی پرکھ ہمیں بھی آ گئی ہے اور ان کی
صحیح قدر و قیمت سے ہم متوسلان دربار بھی کسی حد تک آگاہ ہو گئے ہیں گو کہ
ہم کسی شے کی وہ قیمت نہیں ادا کر سکتے جس کی نواب اوَدھ سے توقع کی
جا سکتی ہے لیکن پھر بھی قریب قریب کچھ کمی کے ساتھ تو قیمت ادا ہی
کر سکتے ہیں!“

میر فدّو ایک ہی کائیاں تھا کہنے لگا ”قبلہ! اگر راگ رنگ سے دل
بہلانا مقصود ہے تو تنازی کو حکم دیجئے آپ کی طبیعت خوش کر دے گی، رہا
اس کے حسن، ہنر اور فن کی قیمت کا معاملہ تو غریب پرور! بندہ اپنے طور پر کوشاں
ہے کہ یہ دُرِ بے مثال قبلہ نواب نصیر الدین حیدر تک پہنچ جائے بس وہ شرف
باریابی ہی اگر بخش دیں گے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنتوں اور تنازی کے
بے مثل حسن و ہنر کی قیمت مل گئی!“

بختاور سنگھ چپکا ہو رہا یہ لکھنؤ خاص لکھنؤ کا معاملہ تھا اگر کسی طرح یہ
خبر نواب تک پہنچ جاتی تو اس کی زندگی محال ہو جائے گی مجبوراً صبر و ضبط
کے گھونٹ اتار لئے تنازی معصومیت سے دونوں کی باتیں سُن رہی تھی
ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

بختاور سنگھ نے افسردگی سے حکم دیا ”موسیقی چھیڑی جائے!“

میر فدّو ذرا سی دیر کے لیے سامنے سے ہٹ گیا وہ سنگت
والوں کو بلانے گیا تھا جو مکان کی باہری کوٹھری میں ٹھہرے ہوئے تھے،
ذرا تخلیہ جو ملا تو بختاور سنگھ نے معصوم صورت بھولی بھالی تنازی پر طمع
کا جال پھینکا ”تمہارا نام کیا ہے؟“

"شنازی!"

"نام تو بڑا پیارا ہے!"

"شکریہ، نوازش!"

"سنو، کیا تم کو اپنی اس زندگی سے گھن نہیں آتی؟"

"کیسی گھن؟" شنازی نے بڑی بڑی مخمور آنکھوں سے اسے دیکھ کر بھولپن سے سوال کیا۔

"یہی کہ تمہیں مالِ تجارت کی طرح استعمال کیا جاتا ہے!" بختاور سنگھ نے ابھی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ میر قدو کے ساتھ کئی آدمیوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ بختاور سنگھ نے جلدی جلدی لیکن آہستہ سے کہا "شنازی، میں تم سے پھر ملوں گا اور تفصیل سے باتیں کروں گا۔"

شنازی نے کوئی جواب نہ دیا۔

میر قدو کے ساتھ سنگت کے کئی آدمی مختلف سازوں کو سنبھالے ہوئے شنازی کے اردگرد آکر بیٹھ گئے۔ میر قدو نے بختاور سنگھ کا ان سے تعارف کرایا۔ کوتوال صاحب کے جھک جھک کر کورنش و تسلیمات بجالائی گئی۔

سازوں پر انگلیاں انگوٹھے اور نغمے کی چوٹیں پڑیں، شنازی نے "آ" سے منہ کھولا اور ذرا سی دیر میں ایک سماں بندھ گیا۔ کوتوال صاحب کے قلب و جگر میں ایک آگ سی لگ گئی، ہوش و خرد ساز و آواز کے شکار ہو گئے۔ ایک ایک مصرعے اور ایک ایک شعر پر بختاور سنگھ کی وہ کیفیت ہوئی جو محفلِ سماع میں اللہ والوں کی ہوا کرتی ہے۔

یہ محفل ایک گھنٹے جمی رہی اور ساز و آواز کے جادو جگائے جاتے رہے۔ اوپر سے صاحب خانہ کے بیوی بچے بھی مزے لے رہے تھے وہ اپنی چھت کے کناروں پر جھکے ہوئے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اختتام پر خوش ہو کے بختاور سنگھ نے شنازی کو بیس اشرفیاں پیش کیں۔ اس نے اشرفیاں وصول کر کے میر قدو کی طرف بڑھا دیں اور مسکراتے ہوئے شکرانے کے طور پر کئی تسلیمات بجالائی۔

اس محفل سے اٹھنے کو جی تو نہ چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا کہ یہ خبر کہیں کسی طرح نواب صاحب تک نہ پہنچ جائے! اٹھا اور اس طرح اٹھا۔ گویا اپنا سب کچھ اسی محفل میں شنازی کے پاس چھوڑ کے اٹھ رہا ہو۔ جاتے جاتے کئی بار رکا۔ اور شنازی کو دیکھا تو شنازی نے یہ ستم کیا کہ جب بھی نظریں ملیں، مسکرا دی اور کچھ اس طرح دیکھا گویا کہہ رہی ہو کوتوال صاحب! پھر تشریف ضرور لائیے گا!"

اور کوتوال جیسا جہاں دیدہ اور تجربے کار بھی اسی خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ اس کی جسمانی وجاہت، اعلیٰ منصب، شاندار مونچھیں اور بیس اشرفیوں کی بخشش نے ضرور شنازی کے دل کو جیت لیا ہے، دل میں سوچا کہ "چلو جی اگر میر قدو مخالفت بھی کرے گا تو ہمارا کیا لے گا۔ اگر شنازی کے دل کو جیت لیا جائے تو پھر دشوار مسئلہ ہی کیا رہ جائے گا!" اور شنازی کی لگاوٹ کی مسکراہٹ اور نظروں سے ٹپکنے والا دوبارہ بلانے کا پیغام، یہ دونوں ایسے اشارے تھے کہ بختاور سنگھ نے اپنی دانست میں بازی جیت لی تھی۔

بختاور سنگھ کے چلے جانے کے بعد میر قدو کا موڈ ہی بگڑ گیا۔ خوش اخلاقی اور نرمی کے وہ آثار جو اس کے چہرے اور اس کی ذرا ذرا سی حرکت سے ظاہر ہو رہے تھے ایک دم زائل ہو گئے اور اس کے چہرے پر درشتی اور نفرت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے سازندوں کو واپس جانے کا حکم دیا جو فوراً ہی چلے گئے۔ شنازی اپنی چوٹی سے کھیل رہی تھی، پہلے بالوں پر انگلیاں پھیرتی رہی پھر چوٹی کے موباف کی ڈھیلی بندش کو سخت کرنے لگی، وہ سوچ رہی تھی کہ بختاور سنگھ آدمی کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن چند دنوں تک کے لیے اس کی قربت اور رفاقت بری نہیں ہو سکتی، اس نے صرف ایک گھنٹے کی تفریح کی قیمت بیس اشرفیوں سے ادا کر دی تھی، شنازی سمجھتی تھی کہ اس کی یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ اسے بختاور سنگھ کی بچھو کی دم جیسی مونچھ بڑی دلچسپ لگی تھی اس میں اگر کوئی عیب شنازی کے نزدیک تھا تو یہ تھا کہ وہ ہندو تھا بس یہی بات اس کے لئے تکلیف دہ یا ناقابل برداشت تھی۔

وہ انہی خیالات میں گم تھی اور میر قدو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور غور و فکر سے اس کے دل میں اترا چلا جا رہا تھا۔ یکایک اس کی اشرفیوں والی مٹھی اوپر اٹھی اور اس نے پوری قوت سے غصے کے ساتھ انہیں گاؤ تکیے پر دے مارا، تیز چھنکے کی آواز پر شنازی بھی چونک پڑی۔

میر قدو غصے میں بڑبڑا رہا تھا "قدر ناشناس، ہندو بنئے کی اولاد، کوتوالی کے نشے میں بیس اشرفیاں دے کر احمق یہ سمجھتا ہے کہ اس نے میری شنازی کی آواز اور فن کی بڑی بھاری قیمت ادا کر دی ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اگر یہی ایک گھنٹا نواب نصیر الدین حیدر کی خدمتِ عالی میں صرف کیا جاتا تو وہاں سے کم از کم ایک ہزار اشرفیاں ضرور ملتیں۔" اس کے



بعد اچانک شازی کی طرف گھوم گیا۔" او شازی! میری بات سن بیرکل پھر آئے گا جیسے ہی آئے چپ چاپ اندر چلی جانا اور سر میں رومال باندھ کر بیٹ رہنا۔ گویا تیرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ بنیا پھر کبھی بھی یہاں آئے۔"

شازی نے دبے لفظوں میں کوتوال کی وکالت کی بولی" ایک گھنٹے کی بیس اشرفیاں یہ کوئی معمولی اجرت تو نہیں ہے۔"

میر فدو اور آگ ہو گیا۔ وہ گرجا۔" تجربہ میرا زیادہ ہے یا تیرا؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تیری قیمت کیا ہے یہ بنئے کی اولاد کیا تیری قیمت لگائے گا۔"

شازی چپ ہو رہی۔ میر فدو کچھ دم لے کر بولا۔" اور پھر تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ تو مسلمان ہے اور بختاور سنگھ ہندو، آخر قومی غیرت بھی تو کوئی چیز ہے!"

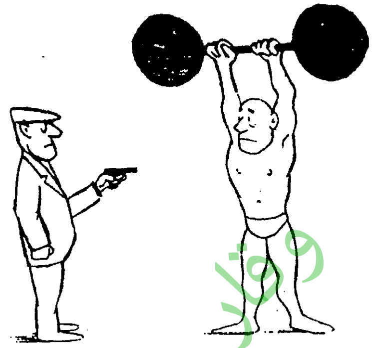
شازی کو اس کی باتیں سخت ناگوار گزر رہی تھیں، جل کر بولی۔ "گستاخی معاف، اگر ہم دکان کھول کے تاجر بن کے بیٹھے ہیں تو ہمیں اس کی فکر بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ گاہک ہندو ہے یا مسلمان۔ دکانداری میں تو ہر مذہب و ملت کے گاہک آئیں گے!"

میر فدو نے مشتعل ہو کے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اوپر صاحب خانہ کے بیوی بچے بھی ان کی باتیں سن اور دیکھ رہے ہیں، بغیر مارے ہی ہاتھ نیچے گرا دیا اور دانت کٹکٹا کر بولا۔

"بہتر ہے اگر تو یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ تیرے لئے یہ کوتوال بہت اچھا آدمی ہے تو اب جب آئے تو اس کا دامن پکڑ کے اس کے گھر چلی جا، تو جہاں اس کی ایک بیوی، بہت سارے بچے اور کئی داشتائیں تیرا شاندار استقبال کریں گی"

شازی روہانسی ہو گئی، کہنے لگی" آپ تو خواہ مخواہ مشتعل ہو رہے ہیں، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کوتوال کے بچے سے میں ذرا بھی متاثر نہیں، مجھے تو اس کے سراپے اور مونچھوں پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے"

میر فدو کی طبیعت ذرا ٹھکانے آئی" شازی! ہم تیرے دشمن نہیں ہیں!" وہ دھیمے دھیمے سمجھانے کے انداز میں بولا" ہم نے تیری تعلیم و تربیت پر کیسی کچھ محنت کی ہے اور کتنا پیسہ خرچ کیا ہے ہم نے اپنے اس پیشے میں ایک دنیا دیکھی ہے اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ تیرے حسن اور ہنر کی اصل قیمت کیا ہے۔ اگر تو نے ہمارا کہنا مانا اور ہمارے مشوروں پر عمل کیا تو میں تجھے یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس شہر لکھنؤ میں کثیر نقدی اور بے شمار ساز و سامان کے علاوہ کئی شاندار حویلیاں تیری ملکیت میں ہوں گی اور کوئی عجب نہیں کہ تو شازی سے کوئی "بیگم" یا "محل" بن جائے اس وقت ہم بھی اپنی محنتوں کا کچھ صلہ پالیں گے اور تیرے زیر سایہ رہ کے



زندگی کے آخری دن گزار دیں گے!"

میر قدّو کی باتوں کا اُس پر گہرا اثر ہوا اُس نے سوچا کہ اب کچھ بھی ہو بختاور سنگھ کیسے ہی بُرے رنگ کیوں نہ دکھائے، وہ اس کی باتوں میں نہیں آئے گی اُدبلے مہری اور کجروی کا اظہار کرے گی لیکن جب وہ یہ سب سوچ رہی تھی، اسی عالم میں میر قدّو کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا "لیکن اب اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم بختاور سنگھ کو بالکل نظر انداز ہی کر دو۔ میرا ان تمام باتوں سے یہ مقصد تھا کہ کہیں تو اس چالاک اور عیار آدمی کی باتوں میں نہ آجائے اگر تو میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہے تو اب جب بھی بختاور سنگھ آئے، خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کرنا، بات بات پر اور ہر ہر ادا سے لگاوٹ کا اظہار کرنا اور اپنی ان باتوں کی آڑ میں اس سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی کوشش کرنا۔" پھر گاؤ تکیے کی طرف بڑھا اور اشرفیاں سمیٹتا ہوا بولا "میرا خیال ہے تو میری بات خوب اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی جیسا کہ تو نے ابھی ابھی یہ کہا تھا کہ ہم تو کلا کار تاجر لوگ ہیں ہمیں اپنے نفع سے کام ہے کون کیا کرتا ہے، ہندو ہے یا مسلمان، ہمیں واقعی ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیئے۔"

اس نے ساری ہی اشرفیاں چُن لیں اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کے نہایت شفقت سے شازی کے سر پر ہاتھ پھیرا، وہ میر قدّو کے سینے سے لگ گئی اور وہ اس کی پُشت آہستہ آہستہ تھپتھپاتا رہا۔

کئی دن گزر گئے لیکن بختاور سنگھ پھر نہ آیا۔ شازی اور میر قدّو دونوں ہی اس کے منتظر تھے ان کا خیال تھا کہ جب تک نواب اَوَدھ کے دربار تک رسائی نہیں ہوتی، اس قسم کے قدردان بہت ضروری ہیں میر قدّو کو شبہ گزرا کہ ضرور بختاور سنگھ کو یہاں کی کوئی بات گراں گزری ہے جس سے وہ کھنچ گیا ہے۔ اس نے شازی سے دریافت کیا "بیٹی شازی! ذرا اپنے ذہن پر زور دے کے سوچ کے یہ بتا کہ اُس رات تجھ سے کوئی ایسی حرکت تو نہیں سرزد ہوگئی ہے جس کا بختاور سنگھ بُرا مان گیا ہے۔"

شازی کو شوخی سوجھی، سنجیدگی سے بولی "جہاں تک مجھے یاد آتا ہے مجھ سے تو کوئی ایسی ویسی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی جس کا کوتوال صاحب بُرا مانتے لیکن سوچتی ہوں کہ آپ کی اشرفیاں پھینکنے والی بات ان کے کانوں تک کسی طرح ضرور پہنچ گئی ہے۔"

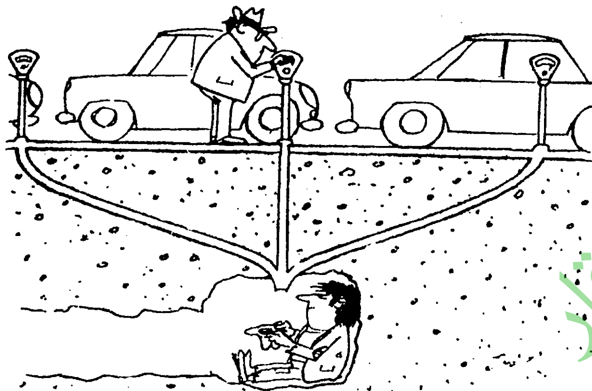
میر قدّو فکرمند ہو گیا "یہ بات اُس کے کانوں تک کس طرح پہنچی؟ اسے تو میرے اور تیرے سوا کوئی بھی نہ جانتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ آپ ہی کا خیال صحیح ہو!" وہ کہنے لگی "لیکن مجھے کچھ شُبہ گزرتا ہے کہ ہمارے سازندوں میں سے کسی ایک نے آپ کی یہ حرکت دیکھ لی تھی اور شاید چھپ کر ہماری باتیں بھی سن لی تھیں، ممکن ہے بختاور سنگھ کسی وقت آیا ہو اور باہر ہی اسے ہماری ساری باتیں معلوم ہو گئی ہوں اور وہ ناراض ہو کے واپس چلا گیا ہو۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا" میر قدّو اور زیادہ فکرمند ہو گیا "ہمیں کوشش کر کے اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہیئے ورنہ یہ یاد رکھو کہ وہ شہر کوتوال ہے ہمارے خلاف کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔"

اسی دوران ایک دس گیارہ سال کا لڑکا اندر داخل ہو گیا۔ ڈھیلے ڈھالے پاجامے اور تن زیب کے کرتے میں ملبوس، آستینیں کہنیوں سے نیچے تک چُنی ہوئی، کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہوئے، سر پر دو پلی، پیروں میں سلیم شاہی، رنگ گھُٹتا ہوا گندمی، اس نے ایک نظر شازی پر ڈالی اور پھر جیسے ہی میر قدّو سے نظریں چار ہوئیں، اُلٹے پیروں واپس ہوا اور یہ جا وہ جا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ میر قدّو تو پہلے ہی خوفزدہ ہو رہا تھا لڑکے کے پیچھے باہر آیا اور اِدھر اُدھر اس لڑکے کو تلاش کرنے لگا۔ سازندے نے سامنے کی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ گھر سے نکل کر اس گلی میں داخل ہوا تھا پھر آگے جا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں مڑ گیا۔

میر قدّو تیز تیز قدم اُٹھاتا اس طرف چل پڑا اور جلدی ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔



اسی لمحے معلوم نہیں کدھر سے وہی لڑکا پھر اندر داخل ہو گیا، تیر کی طرح شازی کے پاس پہنچا اور اس کے ایک ہاتھ میں لفافہ اور دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلی تھما دی اور فوراً واپس ہوتا ہوا بولا۔ "میں شام تک کسی بھی وقت دوبارہ آؤں گا اس کا جواب تیار رکھیے گا میں اسے لے جاؤں گا۔"

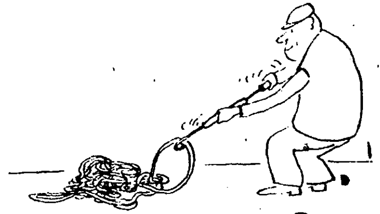
اور وہ اسی وقت واپس چلا گیا۔

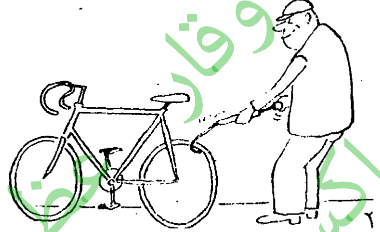
شازی نے لفافے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اس پر خطِ شکست میں تحریر تھا:۔ اپنی جان شازی کے لیے

اس کے بعد اس نے تھیلی کو ٹٹولا اس کا منہ کھول کر اُلٹ دیا۔ کھنکھناتی ہوئی بہت ساری اشرفیاں باہر نکل پڑیں۔ اس نے انہیں گنا پوری سو تھیں۔ اس کے بعد اس نے لفافے کو چاک کیا اور اس میں سے خط کا پرزہ نکال کر پڑھنے لگی اس میں لکھا تھا:۔

"شازی! میری جان تم یقیناً یہ سوچ رہی ہو گی کہ میں تم سے دوبارہ کیوں نہیں ملا؟ لیکن تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔ میں شہر کوتوال ہوں۔ مجھے اپنے منصب کے وقار کا بڑا پاس رہتا ہے اور پھر یہ کہ تم جس مکان میں رہتی ہو اس کا مالک انگریزی فوج میں ملازم ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ انگریزی فوج کا معمولی سا سپاہی نواب اودھ کے شہر کوتوال سے زیادہ بااثر ہوتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے صاحبِ خانہ اور مجھ میں کسی قسم کی رقابت کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ صاحبِ خانہ لکھنؤ میں موجود ہی کہاں ہے جس سے رقابت کا ڈر ہو۔ یہ درست ہے لیکن تم یہ نہیں جانتیں کہ صاحبِ خانہ کا برادرِ نسبتی ناظر اُوپر اپنی بہن کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ ناظر نہ صرف بہترین شاعر ہے بلکہ عاشق مزاج بھی ہے اور اس کی نواب نصیر الدین حیدر تک رسائی ہے۔ تم نہیں جانتیں لیکن میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ناظر عنقریب تم سے راہ و رسم استوار کرنے کی کوشش کرے گا۔ ان حالات میں میں تمہیں یہ مشورہ دوں گا کہ تم جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس مکان کو چھوڑ دو۔ اگر کہو تو میں کسی دوسری جگہ تمہاری رہائش کا بندوبست کر سکتا ہوں۔

شازی! میری روح! اب ایک آخری بات یہ کہ اس دن میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکا تھا۔ شازی! خدا نے تمہیں لاجواب حسن دیا ہے اور بے مثال ستھرا مذاق عطا فرمایا ہے۔ اپنے اوصاف پر بھی اگر دربارِ شاہی کی ناصیہ فرسائی پر تمہیں مجبور کیا جائے تو یہ تمہارے حسنِ خداداد اور بے مثل مذاق کی بہت بڑی توہین ہو گی۔ تم تو خود اس لائق ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے۔ تمہیں پوجا جاتا ہے۔ میں بڑی سنجیدگی





والا آدمی ہوں، لیکن اگر مجھے تم یہ یقین دلا دو کہ تم مجھ سے "تاحیات پیمان وفا باندھنے پر آمادہ ہو تو میں اپنی زندگی کے ہر سابق رشتے کو یک لخت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے توڑ دینے پر تیار ہوں۔ میں تمہیں اشرفیوں میں تول دوں گا، زیورات میں غرق کردوں گا۔ حریر و پرنیاں میں چھپا دوں گا۔ تمہارے آگے پیچھے خدمتگاروں کی فوج لگا دوں گا اور تمہیں اپنے گھر میں اس طرح رکھوں گا جس طرح پُجاری مندر میں لکشمی کی مورتی رکھتا ہے۔ شازی! یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے تمہارے لئے لکھا ہے تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے اپنی ذاتی مرضی اور رائے سے کرنا ہے بہتر یہی ہے کہ میر فدّو کو ہمارے اس خط کا کوئی علم نہ ہو۔
سو اشرفیاں حقیر نذرانے میں پیش کر رہا ہوں، جواب ملنے پر اور نذر کردوں گا۔"

نیچے بختاور سنگھ کے دستخط نہیں تھے، جو از راہِ احتیاط نہیں کئے گئے تھے۔ شازی نے اس خط کو کئی بار پڑھا، وہ چکرا گئی وہ بہکنے لگی اس کے جی میں آئی کہ اس خط اور اشرفیوں کو چھپا دے اور چپ چاپ بختاور سنگھ سے معاملہ کر کے عزت آبرو کی زندگی اختیار کرے لیکن یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اس کی خاطر بختاور سنگھ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ دے گا اور اس کا گناہ شازی کی گردن پر ہوگا۔ وہ چپکے سے اٹھی، خط کو گاؤ تکیے کے اندر چھپا دیا اور اشرفیاں بکس میں رکھ آئی۔ دوبارہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی۔ خط میں جو سبز باغ دکھاتے گئے تھے ان سے طبیعت میں ترنگ اور جولانی آگئی تھی۔ آنکھیں بند کئے ان کے حسین تصور سے لطف اندوز ہوتی رہی اسی عالم میں اسے صاحبِ خانہ کے برادر نسبتی ناظر کا خیال آ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ اگر یہ شخص اوپری منزل میں رہتا ہے تو اب تک اسے دکھائی کیوں نہ دیا۔ بختاور سنگھ نے یہ بھی تو لکھا تھا کہ ناظر شاعر بھی ہے اور عاشق مزاج بھی، جس کی نواب اودھ کے دربار تک رسائی بھی ہے نجانے کیوں وہ اس شاعر کو دیکھنا چاہتی تھی۔

اسی لمحے کسی کی بو سونگھتا ہوا میر فدّو اندر داخل ہوا۔ اسے باہر ہی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ وہ لڑکا دوبارہ پھر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی دریافت کیا۔ "کیا وہ لڑکا یہاں دوبارہ پھر آیا تھا؟"

"ہاں آیا تو تھا!"

میر فدّو سراپا سوال بن گیا۔ "کیوں؟ کیا کہتا تھا؟"

شازی کے اخفائے راز کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے سچ خود بخود منہ سے نکل گیا۔ "بختاور سنگھ کا خط لے کر آیا تھا!"

میر فدّو لال بھبھوکا ہوگیا۔ مشتعل ہوکر بولا۔ "آخر یہ کوتوال کا بچہ چاہتا کیا ہے؟ کہاں ہے وہ خط؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ لکھتا کیا ہے؟"

شازی نے بلا چون و چرا گاؤ تکیے سے خط نکال کے میر فدّو کے حوالے کر دیا۔ اس نے عجلت اور اضطراب میں خط کی تہیں کھولیں اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے خط پڑھتا جاتا اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا اور چہرے کی نرمی پر سختی غالب آتی گئی جب پورا خط پڑھ چکا تو صبر کا پیالہ چھلک گیا۔ بختاور سنگھ کو گالیاں دیتا ہوا بولا۔ "اس لئے تم اس گھر میں آتے تھے کہ میرے گھر کو اجاڑ دو؟ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کوتوال ہو اور ناتجربے کار بھولی بھالی شازی کو پھسلا لوگے تو سخت بھول میں ہو شازی میری شاگرد ہے میری بچی ہے وہ خوب اچھی طرح جانتی ہے کہ تمہارے عشق کا نشہ کے گھڑی کا ہے!" اس کے بعد ایک دم شازی سے مخاطب ہوا اور پوچھا۔ "تم نے اس کا جواب لکھا؟"

شازی نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس نے حکم دیا۔ "تم اسی وقت اس کا جواب لکھ دو!" لیکن پھر کچھ

سوچ کے نرمی سے بولا "ہاں تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس خط کا تم نے کیا
اثر لیا ؟ "

شازی پان کھا رہی تھی، اسے میر فدّو کی تلملاہٹ میں بڑا مزہ
آرہا تھا، اس نے جواب میں ہلکا سا تبسم بکھیر دیا اور بدستور منہ چلاتی رہی، میر
فدّو تڑپ گیا، جل کر بولا "یہ معاملہ ہنس کر ٹال دینے کا نہیں ہے، بختاور سنگھ
شہر کوتوال ہے، وہ اپنے معاملے میں سنجیدہ ہے تو ہم غیر سنجیدہ رہ کر اسے
کس طرح مطمئن کر دیں گے ؟"

شازی نے جواب دیا "میرے دل اور دماغ تو آپ ہیں جو آپ
سوچیں گے وہی میرا جواب ہوگا "

میر فدّو شازی کی سعادتمندی پر باغ باغ ہوگیا۔ فرطِ محبت میں
آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں، کہنے لگا "شازی! تیری خوشی میں میری
خوشی ہے اگر تو خوش ہوگی تو میں بھی خوش ہونگا۔ اگر تجھے دکھ پہنچے گا تو
میں بھی دکھی ہوجاؤں گا یہ کل بچھا کوتوال جو تجھے عیش و عشرت کے سبز باغ
دکھا رہا ہے، تجھ سے دو دن لطف و لذت حاصل کر کے اس طرح بھلا
دے گا جس طرح باسی پھولوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میں تجھے نواب
نصیر الدین حیدر کی بارگاہ تک پہنچانا چاہتا ہوں، تیرا صحیح قدر دان وہی
ثابت ہوگا "

شازی نے کروٹ بدلی، دوسری طرف منہ کرتی ہوئی بولی "لیکن
نواب کے بارے میں بھی یہی سننے میں آیا ہے کہ ان کے حرم میں بھی لاتعداد
عورتیں موجود ہیں اور حسین ترین عورت بھی انہیں چند دنوں سے زیادہ
متاثر نہیں کر سکتی "

میر فدّو کا موڈ بگڑنے لگا "لیکن پھر بھی نواب، نواب ہی ہے
اس کا کسی اور سے کیا مقابلہ، اگر نواب نے تجھے چند ہی دنوں کے لئے کوئی
اعلیٰ عزت بخش دی تو صلے میں اتنا کچھ بخشش دیں گے کہ تیری کئی پشتوں
عزت و آرام سے گزار دے گی "

شازی نے مزید بک بک جھک جھک میں دماغ کھپانا
فضول سمجھا، چپ ہو رہی۔

میر فدّو دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہوا بولا "تیری طرف سے
بختاور سنگھ کو میں جواب لکھتا ہوں، تو اسے نقل کر کے دے دینا، ایسا
جواب دوں گا کہ بیٹا کنتے سے کٹ جائیں گے "

میر فدّو نے جواب میں لکھ دیا کہ "آپ کی ذرہ نوازی اور کرم فرمائی کا شکریہ،
بندی بھی آپ کی محبت میں گرفتار ہوچکی ہے۔ ہم دونوں اگر چاہیں تو ایک دوسرے
سے وابستہ ہو کر گھڑی دو گھڑی کا لطف اٹھالیں۔ لیکن ہم دونوں کی بود و
باش اور معاشرت کا باہمی فرق ایسا نہیں ہے کہ ہماری محبت پائیدار ثابت ہو،
ہم نے آزاد پنچھی کی طرح پرورش پائی ہے ہم بازار کی چیز ہیں، اور آپ کی حیثیت
گاہک جیسی ہے۔ آپ نے ہمیں بازار میں پایا ہے کل اسی بازار میں کوئی ہم سے بھی
اچھی چیز پا سکتے ہیں اور آپ کی گاہکانہ ذہنیت اس کے مول تول پر مائل ہو
جائے گی۔ ایسی صورت میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان
موجودہ رشتہ ہی زیادہ اچھا ہے۔ ہم جنسِ تجارت ہیں اور آپ خریدار، آپ
بشوق غریب خانے میں قدم رنجہ فرمائیں ہم اپنے ناز و انداز اور رقص و موسیقی
سے آپ کے لئے سامانِ دلبستگی پیدا کریں گے۔"

لڑکا سہ پہر کو چھپتا چھپاتا آیا، میر فدّو اس کی جھلک پاتے ہی کمرے
میں چھپ گیا۔ لڑکے نے جواب لیا اور فوراً واپس چلا گیا۔

بعد میں جب میر فدّو شازی کے سامنے آیا تو اس نے شکایتاً کہا۔
"آپ نے خط میں سو اشرفیوں کا شکریہ نہیں ادا کیا اور میرے ذہن سے بھی
یہ بات نکل گئی۔"

میر فدّو ہنستا ہوا بولا "لیکن وہ اشرفیاں ہیں کہاں، مجھے تو تو نے
دی نہیں، پھر میں شکریہ کیوں ادا کرتا" اور پھر زور سے قہقہہ مار کے ہنس دیا
کہنے لگا "خیر یہ تو سخن گسترانہ بات تھی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے خط لکھنے
کے دوران ان اشرفیوں کا خیال تھا اور میں نے قصداً ان کا شکریہ نہیں ادا
کیا، جو چیز ہم نے اپنے حق کے طور پر وصول کی ہو اس کا شکریہ ادا کرنا کیا
معنی ؟" اور وہ ایک بار پھر بے ہنگم ہنسی ہنسنے لگا۔

مغرب کے فوراً بعد ہی بختاور سنگھ کی دیوانگی و آشفتہ سری نے زور
کیا اور وہ پندار اور مصلحتوں کا خون کر کے ایک بار پھر نیازمندانہ شازی کی
بارگاہ میں حاضر ہوگیا۔ میر فدّو نے بظاہر خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے،
لیکن اندر ہی اندر مشتعل مزاجی سے کوتوال کا استقبال کیا۔ شازی آرائش و
زیبائش کے کمرے میں بن سنور رہی تھی۔ میر فدّو نے بختاور سنگھ کو ان کی
مخصوص نشست پر بٹھا دیا اور زور سے شازی کو مخاطب کیا۔ "شازی
بیٹی! اپنے کوتوال صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اگر طبیعت سنبھل گئی
ہو تو ذرا سی دیر کے لئے باہر آجاؤ۔" اس کے بعد کوتوال صاحب سے کہا

"معلوم نہیں کیا بات ہے کہ آج دوپہر سے اسے چکر آ رہے ہیں۔ سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی۔ دیکھو میں بلا کر لاتا ہوں باہر۔" اس کے بعد وہ شازی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے سمجھاتا ہوا بولا۔ "شازی! وہ کمبخت پھر آ گیا ہے میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تجھے دوپہر سے چکر آ رہے ہیں اور تو سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہی ہے، چنانچہ تو فوراً اپنے سر سے رومال باندھ لے اور اپنے چہرے پر ایسی کیفیت طاری کر لے جس سے واقعی یہ محسوس ہونے لگے کہ تو بیمار ہے، اس طرح تو اس وقت تو ناچ گانے کی خواہ مخواہ کی مشقت سے بچ جائے گی اور اس سے چھٹکارا بھی جلدی ہی مل جائے گا۔"

شازی نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور سر سے رومال باندھ لیا، جب وہ اس حلیے میں منہ لٹکائے افسردہ افسردہ بجھی بجھی اور تھکی تھکی بختاور سنگھ کے سامنے پہنچی تو کوتوال کا گھائل دل کچھ اور گھائل ہو گیا۔ سر کے گرد بندھے ہوئے رومال نے اس کے حسن میں کچھ زیادہ ہی اضافہ کر دیا تھا۔ بختاور سنگھ کے دل سے آہ نکلی اور دل ہی میں ڈوب گئی۔ اس نے شازی کے احترام میں کھڑا ہو جانا چاہا لیکن شازی نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔

اس نے پریشانی سے سوال کیا۔ "کسی حکیم کو دکھایا یا نہیں؟"

شازی نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا تو بختاور سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں ابھی لاتا ہوں حکیم صاحب کو بلا کر۔ تم ذرا توقف کرو۔"

میر فدو نے سوچا کہ اگر حکیم آیا تو جھوٹ پکڑا بھی جا سکتا ہے۔ اس لئے بات رفع دفع کرتا ہوا بولا۔ "کوتوال صاحب! اصل میں بات یہ ہے کہ ہم لوگ کشمیر کے رہنے والے ہیں، لکھنؤ کی گرمی ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ جیسے جیسے رات گزرے گی، گرمی کم ہوتی جائے گی اور شازی کی طبیعت بھی بحال ہوتی جائے گی۔ اس لئے حکیم وغیرہ کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بختاور سنگھ بھی اس تاک میں رہا کہ کاش وہ شازی کی کوئی خدمت انجام دے سکتا۔ کچھ دیر تک کشمیر اور اودھ کے موسموں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان علاقوں کے لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں کی باتیں چل نکلیں اور گفتگو عشق و عاشقی اور شعر و شاعری تک جا پہنچی۔ آج چونکہ شازی کے رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونا محال تھا۔ اس لئے یہ طے پایا کہ شعر و شاعری کا ذکر چھڑے۔ بختاور سنگھ میر فدو کی موجودگی میں ایسے اشعار زبان پر لانے سے جھجک رہا تھا جن میں عشق و محبت کا بیان کیا گیا ہو اور جن میں

سوز پایا جاتا ہے اور جن کے ذریعے کھل کے اظہارِ عشق کیا جا سکتا تھا۔ میر فدو کی ذات کوتوال کے دل میں گھٹن پیدا کر رہی تھی۔

میر فدو کو شازی پر اعتماد تھا۔ کوتوال کو مزید بیوقوف بنانے کے لئے اس نے دونوں کو تنہا چھوڑ دیا اور کسی کام کا عذر کر کے باہر چلا گیا۔ جب بختاور سنگھ کو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ اس کے آس پاس میر فدو موجود نہیں ہے تو اس نے شازی سے دریافت کیا۔ "شازی! تم نے میرا خط میر فدو کو دکھایا تو نہیں؟"

شازی نے گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں آپ نے منع جو کیا تھا۔"

بختاور سنگھ نے فرطِ محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ "شازی میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے تمہاری بے مثال محبت کا سپاس نامہ پیش کیا جائے۔"

شازی بس مسکراتی رہی۔ کوتوال آہستہ آہستہ پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ "میں نے تمہارا خط پڑھا، بلاشبہ وہ ادب کا ایک بے مثل ٹکڑا ہے تم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی صداقت غیر مشتبہ ہے لیکن تم نہیں جانتیں کہ میں نے تمہیں مالِ تجارت کبھی بھی نہیں سمجھا اور نہ ہی میں اپنے تئیں تمہارا گاہک سمجھتا ہوں۔"

شازی نے شوخ نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔ "ہم مالِ تجارت ہیں اور آپ ہمارے گاہک۔ اگر آپ کا دل یہ باتیں نہیں مانتا تو نہ مانے، اس کے نہ ماننے سے معاملے کی صداقت تھوڑی بدل جائے گی۔"

بختاور سنگھ کی کوتوالی لاجواب ہو گئی۔ "شازی" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا "میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ میرا دل ایک ایسی آگ میں جل رہا ہے! شازی جس میں تمہاری محبت کے سوا ہر شے جل کر راکھ ہو گئی ہے تم میری بات کیوں نہیں سمجھتیں۔"

شازی نے دکھتا ہوا سوال کیا۔ "آپ کی کتنی بیویاں ہیں؟"

"دو۔" بختاور نے جواب دیا۔

"اور داشتائیں؟"

"پانچ!"

"خانگیاں؟"

"دو۔ صرف دو۔"

"ان سے ایسی اولادیں کتنی ہیں جو کل آپ کے بعد آپ کی جائیداد اور املاک کی وارث قرار دی جا سکتی ہیں۔"

"صرف چھ۔"

شازی نے بھرپور وار کیا۔ "اگر ہم آپ کے ساتھ بہنے پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو معلوم ہے کہ اس صلے میں ہم آپ سے کیا کچھ چاہیں گے۔"

"جانتا ہوں!" بختاور سنگھ نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کر سکتی ہو کہ میں یک لخت تمہاری خاطر ان سب سے پیچھا چھڑا لوں۔" پھر ذرا چپ رہ کر پوچھا۔ "کیوں شازی یہی بات ہے نا؟"

"ہاں"۔ شازی نے جوشِ مسرت میں کہا۔ "بالکل یہی بات لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی بڑی قربانی آپ کے لئے اتنی آسان نہیں ہے، جتنا آپ ہماری محبت کے وقتی جذبے کے تحت محسوس کر رہے ہیں!"

بختاور سنگھ نے علی الاعلان کہا۔ "یہ تمہاری خام خیالی ہے شازی، میرے لئے تمہاری محبت کی یہ قربانی دینا اتنا ہی آسان ہے جتنا تمہارے لئے میری خاطر رقص و موسیقی پر آمادہ ہونا۔"

شازی نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور دوسری مشکل پیش کی۔ "چلئے ہم نے یہ مان لیا کہ آپ ہماری خاطر یہ ساری قربانیاں دے ڈالیں گے۔ لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ آپ ہندو ہیں اور ہم مسلمان۔ پھر ہم کس طرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

بختاور سنگھ نے جواب دیا۔ "عشق کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ تم اپنے مذہب پر رہو، میں اپنے دھرم پر قائم رہوں۔"

شازی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ بات اتنی آسان نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں۔ ہم بہرحال یہ پسند نہیں کریں گے کہ ایک ہندو کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں۔"

بختاور سنگھ بھی کھڑا ہو گیا۔ بے بسی سے بولا۔ "تم اگر مجھے یہ یقین دلا دو کہ تا زیست ساتھ نہ چھوڑو گی تو میں تمہارے لئے اپنے ہندو دھرم کو بھی خیرباد کہہ سکتا ہوں۔"

شازی نے طنز سے کہا۔ "آپ ہماری ہر بات نہایت آسانی سے مانتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ اپنے رشتے داروں اور دھرم کے معاملے میں اگر ایسے ہی بودے واقع ہوئے ہیں اور یہ سارے بندھن اتنی آسانی سے توڑ سکتے ہیں تو پھر آپ ہمارے نزدیک بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ٹھہر سکتے ہیں۔"

بختاور سنگھ نے نہایت بیچارگی سے عرض کیا۔ "شازی! تم ایسا سوچنے میں بالکل حق بجانب ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم نے میرے دل و دماغ پر کچھ اس طرح قبضہ جما لیا ہے کہ اپنے حق میں جیسا فیصلہ چاہو با آسانی کرا لو۔"

شازی اندر جانے لگی تو بختاور سنگھ نے اسے روکنا چاہا، پوچھا "تم اب کہاں جا رہی ہو؟"

شازی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے گا۔ ہم ذرا آرام کرنا چاہتے ہیں!"

بختاور سنگھ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ "شازی!" وہ راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "میں یہاں زیادہ دیر کے لئے نہیں آیا ہوں۔ ذرا دیر بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی بھی بے رخی کس کام کی۔"

شازی نے سنگدلی سے جواب دیا۔ "اللہ قسم آپ کی محبت میں ہم تکلیف کے باوجود آپ کے پاس چلے آئے تھے۔ لیکن اب مزید بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے، پھر کسی دن تشریف لائیے گا تو دیر تک بیٹھیں گے اور آپ کا جی خوش کر دیں گے۔"

بختاور سنگھ سراپا التجا بن گیا۔ "اچھا، بس ایک سوال، اسے پورا کر دو اس کے بعد چلی جانا۔"

"وہ کیا؟" شازی نے دزدیدہ نگاہوں کا زہریلا تیر چلا دیا۔

بختاور سنگھ کی نظریں اس کے سرخ و سپید سیبوں جیسے رخساروں پر جم گئیں۔ "بس دو بوسے"۔

"اوئی ہوں!" وہ ایسی لجا گئی جیسے پہلی رات کی دلہن۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

بختاور سنگھ نے اپنی دونوں جیبوں سے مٹھیاں بھر بھر کے اشرفیاں نکالیں اور انہیں شازی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ "میں اپنے ان دو بوسوں کی یہ قیمت پیشگی ادا کر دینا چاہتا ہوں۔"

شازی نے اندازہ لگایا کہ یہ اشرفیاں کسی بھی طرح پچاس ساٹھ سے کم نہ تھیں۔ سودا با آسانی طے پا گیا۔ اشرفیاں شازی کے قبضے میں چلی گئیں اور دو پرجوش بوسے بختاور سنگھ کے حصے میں آئے۔ جب حساب کتاب چکایا جا چکا تو شازی نے تڑپ کر بختاور سنگھ کو مخاطب کیا۔

"کوتوال صاحب! کہاں گئے آپ کے وہ مقدس احساسات اور خیالات جو ہماری پاک محبت کے روپ میں آپ کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے۔ ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم مالِ تجارت ہیں، اور آپ گاہک۔ اور ہمارے اور آپ کے درمیان یہی رشتہ وجہ ربط و ارتباط ہے لیکن آپ اس حقیقت کو نہیں مان رہے تھے بالآخر اب آپنے بوسوں کی قیمت ادا کر کے عملاً اس تلخ حقیقت کا اعتراف کر لیا۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

بختاور سنگھ کھسیا گیا۔ یہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں ــــــ

یہ منظر ابھی اپنے اختتام کو پہنچا تھا کہ میر قدو ایک اجنبی کو لئے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ان صاحب کا حلیہ کچھ عجیب و غریب تھا۔ پشت پر بھینسے کے کھال کی ڈھال لٹکی ہوئی، جس پر پیتل کے پھول جڑے ہوئے، طمنچوں کی جوڑی دائیں بائیں لٹکی ہوئی تلوار بائیں طرف نیام میں پھنسی ہوئی، سر پہ دو پلی ٹوپی، ٹوپی کے باہر گدی پر بالوں کے پٹے نمایاں، رنگ کھلتا ہوا، قد و قامت میں بلا کی وجاہت، چہرے پر ہلکی سی داڑھی، سیاہ گھنیری مونچھیں، ململ کا کرتہ اور ڈھیلی مہریوں کا پاجامہ یہ صاحب اس حلیے میں اکڑتے برتے میر قدو کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے ایک چھوٹی سی کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ میر قدو نے دور ہی سے شور کرنا شروع کر دیا۔ "ارے کدھر گئی شازی! دیکھ یہ تجھ سے کون ملنے آیا ہے!" پھر کوتوال صاحب کو مخاطب کیا۔ "کوتوال صاحب! وہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں آپ ادھر تشریف لائیے۔ دیکھیے یہ ہیں کتنے بڑے آدمی سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں۔"

شازی اور بختاور سنگھ پھر اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔ اجنبی مہمان کے لئے ایک گاؤ تکیہ اور لایا گیا۔ وہ اس کے سہارے ڈھال اور تلوار کو الگ رکھ کے، نہایت متانت اور وقار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بختاور سنگھ اپنی جگہ بیٹھ گیا اور شازی نے اپنی جگہ سنبھالی۔

میر قدو نے درمیان میں کھڑے ہو کے ہر ایک کا تعارف کرانا شروع کیا۔ "جناب کوتوال صاحب! یہ ہیں اپنے مالکِ مکان کے برادرِ نسبتی جناب ناظر! سنا ہے کہ یہ شعر بڑے بانکے کہتے ہیں، ادھر کے بہترین شاعر ہیں۔" اس کے بعد اس نے بختاور سنگھ اور شازی کا تعارف ناظر سے کرا دیا۔ شازی نے کنکھیوں سے اس تیکھے نوجوان کو دیکھا۔ اس نے سوچا کہ یہ شاعر خوب ہے جو شاعر سے زیادہ اوچھی ہے۔

میر قدو نے مزید کہا۔ "جناب والا! یہ کسی طرح یہاں آنے کے خواہشمند تھے یہ مکان جس میں ہم رہتے ہیں ان کے بہنوئی کا ہے۔ یہ خود یہاں نہیں رہتے لیکن آتے جاتے رہتے ہیں، میں خود بھی انکے چکر میں کئی دن سے تھا۔ آج بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں۔"

بختاور سنگھ ناظر کو خوب پہچانتا تھا۔ کیونکہ وہ اس شخص سے نواب کے دربار میں اکثر ملتا رہتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نواب صاحب اس کی شاعری کو پسند بھی فرماتے ہیں۔ بختاور سنگھ کو اپنی محبت کا قلعہ مسمار ہوتا محسوس ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میر قدو ناظر کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہاں لایا ہے چونکہ وہ شازی کو نواب کی بارگاہ تک پہنچانا چاہتا ہے اس لئے جب اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ ناظر جو صاحبِ خانہ کا برادرِ نسبتی ہے، ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نواب کی مصاحبت بھی رکھتا ہے تو اس نے ناظر کو بحیثیت ایک ذریعے کے استعمال کرنے کی ٹھانی ہو گی۔ اب ان حالات میں شازی سے ربط ضبط بڑھانا اور تعلقات محبت استوار کرنے کی کوشش کرنا ایک نہایت خطرناک عمل ثابت ہو گا۔ کیونکہ اب یہ یقینی ہو گیا تھا کہ شازی نواب تک پہنچ کے رہے گی اور جب نواب کو یہ معلوم ہو گا کہ شازی ان کے پاس پہنچنے سے پہلے بختاور سنگھ کی نظرِ التفات کی شکار رہ چکی ہے تو اس وقت معلوم نہیں نواب کے کیا احساسات ہوں اور وہ اس کے بارے میں معلوم نہیں کیسا فیصلہ صادر کر دیں۔ کیونکہ نواب صاحب نوعمر اور ناتجربہ کار ہونے کے ساتھ ہی مغلوب الغضب بھی ہیں۔

ناظر نے شاعرانہ بے نیازی اور فنکارانہ ادا سے بختاور سنگھ کو دیکھا اور طنزیہ دریافت کیا۔ "تو کوتوال صاحب آپ شہر کا انتظام اس گوشے میں بیٹھ کر فرماتے ہیں؟"

بختاور سنگھ اس چوٹ سے کچھ زیادہ ہی بوکھلا گیا۔ فوراً جانے کے لئے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "ناظر صاحب! میں یہاں مستقلاً نہیں آتا۔ شاید دوسری مرتبہ آیا ہوں بس کبھی کبھی جب زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں تو یہاں غم غلط کرنے چلا آتا ہوں۔" ناظر مسکرانے لگا۔ "جناب شہر کے ہنگاموں سے گھبرا کے پناہ لینے تو یہاں آجاتے ہیں لیکن اگر یہاں سے آگ لگا کے اٹھے تو کہاں جائیں گے؟" شاعر کی اس بات پر سبھی مسکرا دیئے اور بختاور سنگھ بدحواس ہو کے ایسا بھاگا کہ پلٹ کے بھی نہ دیکھا۔ اس کے جاتے ہی میر قدو

نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنستا ہوا بولا۔ "جناب ناظر صاحب! میں آپکا بے حد شکر گزار ہوں، ورنہ یہ کوتوال تو میرے لئے مصیبت بن گیا تھا آپ میرے لئے فرشتۂ غیبی سے کسی طرح بھی کم نہیں۔"

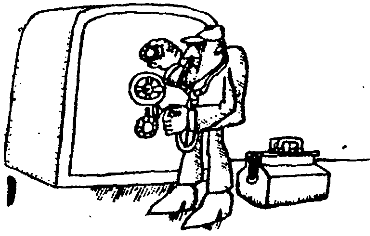
اب ناظر نے شازی کے سراپا کا بغور جائزہ لیا اور دہی رنگ خود کو لگا بیٹھا جس کا بختاور سنگھ پہلے ہی شکار ہو چکا تھا۔ اتنے متناسب اعضا کے صحت مند اور نستعلیق حسن کا شاہکار ناظر نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے اپنے اشعار پھیکے اور بے مزہ محسوس ہونے لگے۔ وہ تا دیر نہایت انہماک سے شازی کو دیکھتا رہا۔ اس محویت کو میر فدو نے بھی محسوس کیا لیکن اسے اس شاعر کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ زر، زور اور عمل سے محروم شاعر سے ڈرنا کیسا۔

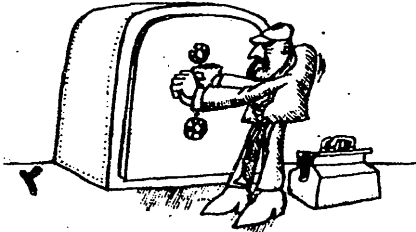
ناظر کو دنیا داری نہیں آتی تھی۔ کیسی زمانہ سازی اور کہاں کا تکلّف اور لحاظ، کہنے لگا۔ "خوب! ہمیں آپ کی موجودگی کا کوئی علم ہی نہ تھا، ہم خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ ہمیں پتا ہی نہ تھا کہ بہار گھر میں آ چکی ہے۔" اس کے بعد میر فدّو سے پوچھا۔ "کیوں قبلہ! اگر ہم گھڑی دو گھڑی کو دل بہلانے کے لئے یہاں آ جایا کریں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔"

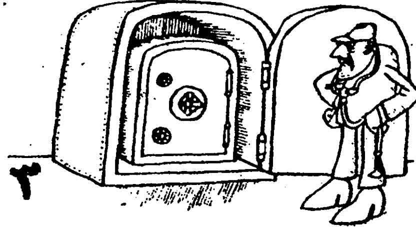
میر فدّو کو ناظر سے کچھ اہم کام لینا تھے۔ اس لئے بخندہ پیشانی آنے جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

ناظر دیر تک بیٹھا ان دونوں سے باتیں کرتا رہا۔ اسے شازی کی باتیں بڑی اچھی لگیں۔ اس کی آواز میں شہد کی مٹھاس اور سازوں کی کھنک تھی۔ جب وہ مسکرا کر کسی بات کا جواب دیتی تو ناظر کو ایسا لگتا جیسے اس کے دل کی حرکت رک گئی ہے۔ زور سے ہنستی تو ایک بجلی سی کوند جاتی اسے اپنی شاعری کے لئے ایک جیتا جاگتا مثالی محبوب میسر آ گیا تھا۔

شازی کو بھی اس نوجوان میں کچھ انفرادیت نظر آتی تھی۔ یہ دوسروں سے بہت مختلف تھا۔ گفتگو میں ایک خاص سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کا مذاق ستھرا اور معنی خیز تھا۔ اس مہذب اور شائستہ انسان پر ڈھال، طپنچوں کی جوڑی اور تلوار کچھ عجیب سی لگتی تھیں۔ شازی نے سوچا کہ کیا یہ شخص بھی صاحبِ سیف ہو سکتا ہے۔ کیا یہ شخص بھی کسی سپاہیانہ انداز میں نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ کیا یہ شخص بھی کسی کو قتل کر سکتا ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے جن کا اس کے پاس کم از کم اثبات میں کوئی جواب نہ تھا۔ بہت کچھ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچی کہ کچھ بھی ہو، اس دلچسپ







اور پرکشش انسان کے ساتھ گفتگو کر کے اور اس کی صحبت میں کچھ وقت گزار کر لطف اندوز ضرور ہوا جا سکتا ہے۔

❖ ❖ ❖

ناظر اور شازی کچھ اتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے کہ میر فدو کی دوررس نظریں خطرے کا احساس کر کے بہت زیادہ خوفزدہ ہونے لگیں۔ شازی اب ناظر ہی کی غزلیں گانے لگی تھی اور اب ناظر کی غزلوں میں بھی بلا کا درد و سوز پیدا ہو گیا تھا۔ غزلوں میں درد و سوز کی بات شاہی محلات اور دربار تک پہنچ چکی تھی۔ خود نواب نصیر الدین حیدر نے کئی بار اس کا اعتراف کرتے ہوئے ناظر سے کہا تھا۔ "بھئی ناظر! ان دنوں تمہاری شاعری اپنے جوبن پر آئی ہوئی ہے۔ آخر کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

ناظر سہم گیا کہ کہیں شازی کے حسن و خوبصورتی کی خبر نواب تک

تو نہیں پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اس خبر کے بعد شازی لمحوں کے اندر نوابی حرم میں داخل کر لی جائے گی۔ ناظر نے نواب کی بات کا کوئی معقول جواب تو نہ دیا، لیکن قریب ہی موجود بختاور سنگھ کو ناظر کی پریشانی پر بڑا مزہ آیا۔ اس نے مزید لطف لینے کے لئے مؤدبانہ عرض کیا، "اگر قبلہ نواب صاحب اس غلام کو شرف ہمکلامی مرحمت فرمائیں تو بندہ جناب ناظر کے اشعار میں پائے جانے والے درد و سوز کی بات کچھ نقاب کشائی کر سکتا ہے۔"

ناظر کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے بختاور سنگھ کو دیکھا اور گردن جھکالی۔

نواب صاحب نے حکم دیا، "اجازت۔ بختاور سنگھ اجازت ہے۔"

بختاور سنگھ نے ہاتھ باندھ کے عرض کیا۔ "حضور تو غلام کے فرائض منصبی سے واقف ہی ہیں۔ چنانچہ اس دوران شہری امن اور نظم و نسق کے پیش نظر یہ غلام جب مختلف اوقات اور ایام میں حسن فروش مہوشوں اور گلرخوں میں پہنچا تو وہاں اپنے ناظر صاحب بھی نظر آئے۔ ہو سکتا ہے وہیں سے کسی آتش گل سے اپنے دل میں آگ لگا لائے ہوں اور اسی کے زیر اثر ان کے اشعار میں درد و سوز پیدا ہو گیا ہو۔"

نواب اس طرح ہنسے جیسے کسی مٹکے سے پانی انڈیلا جا رہا ہو، تیز تیز نظروں سے ناظر کو گھورا اور ارشاد فرمایا۔ "کیوں بھئی! تو یہ معاملے ہیں؟ بھئی خوب، یعنی آپ زنان بازاری سے عشق فرمانے لگے ہیں۔ لیکن خاطر عاطر میں ہماری یہ بات ضرور ڈال لو کہ یہ شوق تم غربا کے بس کا نہیں ہے، نہیں ہماری اتباع سے بچنا چاہیے۔" اس کے بعد بختاور سنگھ سے کہا، "بختاور سنگھ! ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اس نوجوان شاعر کا خیال رکھو اور اب جب کبھی یہ کسی ایسی ویسی جگہ پر نظر آئے تو تم ہمیں اس سے مطلع کرو ہم نہیں چاہتے کہ یہ نوجوان اور شریف شاعر چالاک اور عیار حسن فروشوں کے چکر میں پھنس کر تباہ و برباد ہو جائے۔ قسم ہے اللہ کی کہ اپنے درباری شرفا کی عزت و آبرو کا تحفظ ہمارا فرض ہے اور ہم انہیں اس سے بچائیں گے۔"

بختاور سنگھ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ اب ناظر پوری طرح اس کے قابو میں آ چکا تھا۔ اب وہ بختاور سنگھ کے رحم و کرم پر تھا جب سے شازی کے یہاں ناظر کی آمد و رفت بڑھی تھی، بختاور سنگھ نے وہاں جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ لیکن آج کے بعد ناظر بالکل بے بس ہو گیا تھا۔ بلکہ نواب کے حکم نے اس کے پر تینچ دیئے تھے۔ اس نے سوچا۔ اب بختاور سنگھ ایک بار پھر آزادی کیساتھ شازی کے گھر آنے جانے لگا۔

ناظر جب دربار سے واپس ہوا تو اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ شازی سے قطع تعلق بہت دشوار تھا اور نواب صاحب کی حکم عدولی خطرناک۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ ان حالات میں آخر کیا کیا جائے۔ وہ سیدھا بہن کے گھر پہنچا اور منہ لپیٹ کے پڑ رہا۔ بہن نے کچھ پوچھا تو کہہ دیا طبیعت خراب ہے۔ اس پریشانی میں بھی اس کے کان شازی کی آواز ہی پر لگے ہے۔ لیکن نیچے تو بالکل سناٹا تھا۔ شازی تو شازی، میر فدو تک کی آواز نہ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نیچے کوئی موجود ہی نہ ہو اس کے درد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

مغرب کے بعد اچانک میر فدو کی آواز گونجی "آیئے آیئے کوتوال صاحب! تشریف لایئے۔ بڑے دنوں بعد تشریف لائے۔ خیریت تو ہے" اور پھر بختاور سنگھ کی آواز سنائی دی۔ "ہاں خیریت سے ہوں۔ آج اپنے ناظر صاحب نظر نہیں آتے۔"

اس کا کوتوال کو کیا جواب ملا۔ آواز صاف نہیں سنائی دی لیکن میر فدو کی بے ربط آواز کانوں میں پڑی ضرور۔ ناظر تلملا کر رہ گیا۔ بار بار اس کا یہی جی چاہتا کہ وہ اٹھ کر اسی وقت نیچے پہنچ جائے۔ لیکن پھر اس کے انجام سے ڈر جاتا۔

کافی رات گئے شازی کی آواز بھی سنائی دی۔ مختلف سازوں کے ساتھ اس کی آواز اس طرح لہرائی کہ ناظر کا دل مچلنے لگا اور اس محفل میں پہنچنے کے لئے تڑپنے لگا۔ شازی جو غزل گا رہی تھی وہ فراقیہ تھی اور اس کی دھن بھی المیہ تھی۔ اس نے سوچا یہ ضرور بختاور سنگھ کو خوش کرنے کے لئے غفل بھی ہے۔ اسے شازی پر غصہ آیا کہ آخر اس نے کیوں موسیقی چھیڑی۔ اسے میر فدو پر بھی غصہ آیا کہ وہاں تو جو بھی پہنچتا ہے اس کا اس طرح خوش اخلاقی سے استقبال کرتا ہے گویا وہی اس گھر کا سب سے معزز مہمان ہے۔ پھر گھنگرو بھی کھنکنے لگے۔ شازی ناچ رہی تھی، بختاور سنگھ کو خوش کرنے کے لئے۔ ناظر انگاروں پر لوٹنے لگا۔

دوسری طرف بختاور سنگھ اتنا خوش تھا کہ اس نے شازی، میر فدو اور سازندوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینے کے لئے ایسی داد و دہش کی کہ شازی اور میر فدو کے سوا سازندے تو اس کے دل سے [illegible]

میر فدّو حیران تھا کہ آج بختاور سنگھ اتنا خوش کیوں ہے اور ناظر کیوں نہیں آیا۔ آج تو کوتوال صاحب کی جسارتوں کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کسی کا پاس و لحاظ بھی نہ کیا اور نہایت ڈھٹائی سے شازی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیئے اور اس کے رخسار کو مسل کے سُرخ کر دیا۔ شازی کی "سی" نکل گئی۔

میر فدّو نے سوچا کہ اگر اس وقت یہاں ناظر موجود ہوتا تو بختاور سنگھ کی اتنی ہمت نہ پڑتی۔ اس نے کوتوال کی جسارتوں کو نفسیاتی حملے سے روکنے کی کوشش کی۔ بولا۔ "ناظر صاحب اب تک معلوم نہیں کیوں غائب ہیں، شاید اب ضرور آتے ہوں گے۔"

بختاور سنگھ نے اس کا مذاق اُڑایا۔ بولا "اب وہ یہاں کبھی بھی نہ آئے گا۔ بات ہی کچھ ایسی ہوگئی ہے۔ اگر آئے تو مجھے بتانا، پھر جو بھی آئے تو میرا ذمہ۔"

شازی نے بے چینی سے پوچھا "کیوں، اب ناظر صاحب یہاں کیوں نہ آئیں گے؟ انھیں یہاں آنے سے کس نے منع کیا ہے؟"

بختاور سنگھ سب کچھ صاف صاف بتانا بھی نہ چاہتا تھا۔ بات ٹال گیا۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد شازی بہت پریشان ہوگئی۔ رات کا کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا گیا۔

ساری رات کی فکر مندی اور غور و فکر کے بعد ناظر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر کسی طرح شازی اس سے شادی کرلے تو وہ نہ صرف یہ کہ فراق و جدائی کی آگ سے بچ جائے گا بلکہ نواب صاحب کے عتاب سے بھی محفوظ رہے گا اور شادی کے بعد اگر نواب صاحب کو شازی کے بے پناہ حسن کا علم بھی ہوگیا تو وہ اخلاقاً ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی تباہ کرنے سے باز رہیں گے۔ لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ میر فدّو اس پر کبھی تیار نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کسی طرح شازی ناظر سے شادی کرنے پر آمادہ بھی ہو جائے تب بھی میر فدّو دونوں کی اس کوشش کو ناکام بنا دے گا۔ پھر بھی اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اسے اس معاملے میں شازی سے مشورہ ضرور کرنا چاہیئے۔ مشورے کے لئے شازی کی قیام گاہ بالکل نامناسب تھی چنانچہ اس نے شازی اور میر فدّو کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کا منصوبہ بنایا اور اس دعوت میں شازی سے گفت گو کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس تجویز پر جلد از جلد عمل درآمد کے لئے وہ صبح سویرے ہی شازی کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت تک وہ اپنے بستر پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ میر فدّو اس کی شکل دیکھتے ہی استقبال کو آگے بڑھا اور خیریت پوچھنے لگا۔ ناظر کی نظریں شازی کو تلاش کر رہی تھیں۔ میر فدّو اس کا مطلب سمجھ گیا۔ منہ بنا کر کہنے لگا۔ "جناب کیا عرض کروں، رات کوتوال صاحب آگئے تھے۔ رات گئے تک ہلکان کرتے رہے۔ ان کے جاتے ہی شازی اس طرح بستر پر گئی کہ رات کا کھانا بھی اس سے نہ کھایا گیا۔ سچ کہتا ہوں، ایسا ڈھیٹ اور بے شرم آدمی بھی نہیں دیکھا۔"

ناظر نے ناگواری سے جواب دیا۔ "جناب صبح صبح کس منحوس کا ذکر لے بیٹھے۔ کچھ اور باتیں کیجیے۔"

موقع غنیمت تھا۔ شازی بھی موجود نہ تھی۔ اس نے نہایت عزت و احترام سے ناظر کو بٹھایا اور ناشتے کی بابت پوچھنے لگا۔ ناظر نے کہا۔ "ناشتہ کر کے آئے ہیں۔ تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میر فدّو نے کہا۔ "حضور! اگر اجازت دیں تو ایک درخواست کروں۔"

"کہیئے!" ناظر سراپا سوال بن گیا۔ "بشوق عرض کیجیے۔"

میر فدّو نے کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس آسرے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے معاملے میں اگر میں اپنے ہم پیشہ حضرات سے اعانت چاہوں گا تو مثل مشہور ہے کہ ہم پیشہ، دشمن ہمیشہ۔ ہمیں اُن کے حسد و جلن سے نقصان ہی پہنچ جانے کا خطرہ لاحق

رہے گا۔ بہت دنوں سے آپ جیسے سہارے کی تلاش میں تھے۔ بندے کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی نواب صاحب کے دربار میں بڑی عزت ہے اگر ہم آپ کی وساطت سے وہاں تک رسائی حاصل کر لیں گے تو ہماری سات پشتیں آپ کے اور آپ کے خاندان کے حق میں دعاگو رہیں گی۔"

ناظر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ کہنے لگا۔ "بہتر ہے جناب آپ کے لئے ضرور کچھ کریں گے۔ لیکن اس سلسلے میں ہم بھی کچھ عرض کریں گے۔"

"ضرور، ارشاد!" میر فدّو نے جواب دیا۔ "اور ارشاد بھی کیا حکم دیجیے۔ تعمیل ہو گی۔"

ناظر نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ ہم آئندہ یہاں آ جا نہیں سکیں گے اور اگر کبھی آئے بھی تو آپ اس کا بطورِ خاص خیال رکھیں گے کہ ہماری آمد کی اطلاع بختاور سنگھ کو ہرگز نہ ہو۔"

"اس کا خیال رکھوں گا، اور کچھ؟"

"دوسری بات یہ کہ ہم شازی اور آپ کی اپنے گھر دعوت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ وہاں تشریف لائیں۔ وہیں اس موضوع پر کھل کے بات ہو گی۔"

میر فدّو نے یہ بات بھی مان لی اور ناظر نے دونوں کو دوسرے دن شام کو اپنے گھر بلا لیا۔

اس دن ناظر کی طبیعت بہت ہلکی رہی۔ دربار میں بختاور سنگھ اسے دیکھ دیکھ کے مسکراتا رہا۔ لیکن آج ناظر بھی خوفزدہ نہ تھا۔ جب وہ دونوں دربار سے باہر نکلے تو ناظر نے بختاور سنگھ کو متنبہ کیا اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "بختاور سنگھ! تم جو کچھ کر رہے ہو، اچھا نہیں، ہم بھی زبان رکھتے ہیں۔ یہ جب چلے گی تو تمہیں پناہ بھی نہ ملے گی۔"

بختاور سنگھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، بولا۔ "یہ ارمان بھی نکال لو، ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔ جب یہ دیکھیں گے کہ پرندہ جال میں نہیں پھنس رہا ہے تو اپنا جال کھینچ لیں گے اور نواب کا جال آگے بڑھا دیں گے۔ جس کا ہمیں کم از کم یہ فائدہ تو ضرور پہنچے گا کہ نواب کے مزاج میں کچھ زیادہ رسوخ حاصل کر لیں گے، اور شازی بھی ہماری احسان مند رہے گی۔"

ناظر نے سوچا یہ اور برا ہے۔ بختاور اس کے مقابلے میں زیادہ شاطر تھا۔ ناظر کو ایک بار پھر خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو جانا پڑا۔

☆ ☆ ☆

ناظر نے ان دونوں کی شاندار دعوت کی تھی۔ مکان سے ملحقہ باغیچے میں اس دعوت کا اہتمام ہوا تھا۔ یہاں کا سبزہ اور پھولدار درختوں کی روشیں عجب بہار دے رہی تھیں۔ بیچ میں فوارہ تھا۔ ناظر نے فوارے کے پاس ہی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت کی طرفہ حیثیت یہ تھی کہ اس میں کئی قسم کے کھانوں اور پھلوں کے ساتھ ہی کئی طرح کے ساز بھی رکھے ہوئے تھے۔ میر فدّو اور شازی انھیں ایک میز پر سلیقے سے رکھا ہوا دیکھ کر ذرا حیران ہوئے۔ انھیں خیال گزرا کہ شاید یہاں ان کے سوا کسی اور کو بھی بلایا گیا ہے۔ سازوں کے قریب ہی ایک کتاب رکھی ہوئی تھی۔ کئی نوکر بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے۔

شازی نے پوچھا۔ "یہاں ہمارے علاوہ بھی کسی کو مدعو کیا گیا ہے؟"

ناظر نے سر کو نفی میں ہلکی سی جنبش دی۔ "نہیں۔"

میر فدّو نے سراپا عجز و نیاز بن کے عرض کیا۔ "خدا حضور کو سلامت رکھے۔ کیا پُر فضا مقام ہے! واہ وا، واہ وا۔"

ناظر خاموش رہا۔

کھانے کا دور چلا۔ پھر پھل کھائے گئے، خشک میوے چابے گئے۔

آخر میں میر فدّو نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟"

ناظر نے جواب دیا۔ "صرف والدہ صاحبہ، جو بوڑھی ہو چکی ہیں۔" پھر اپنے حویلی نما مکان کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "اتنا بڑا مکان اور صرف دو نفر۔ تنہائی سے جی اکتا گیا ہے اگر یہ ملازم نہ ہوتے تو ہمیں وحشت ہو جاتی۔"

میر فدّو نے اور ٹٹولا۔ "بندہ پرور! اور کتنی املاک ہے حضور کے تصرف میں؟"

ناظر نے جواب دیا "گومتی کے اس پار تین گاؤں ہیں، شہر کے مختلف علاقوں میں پانچ بڑے بڑے مکانات ہیں جن کا کرایہ اچھا خاصا آ جاتا ہے۔ نواب صاحب خاندانی نجابت، ذاتی شرافت اور شعری کمال کے بڑے قدر دان ہیں اور وقتاً فوقتاً انہیں انعام و اکرام سے نوازتے رہتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے ایک ملازم کو آواز دی "بیرن! انھیں مکان کی سیر کرا دو۔" پھر میر فدؔو سے کہا "جائیے بیرن ہمارے مکان کو اچھی طرح دکھا دے گا۔"

میر فدؔو کو جانے میں تامل ہوا لیکن جانا ہی پڑ گیا، ناظر نے شازی سے مفصل بات کرنے کے لیے یہ منصوبہ پہلے ہی سے تیار رکھا تھا۔ میر فدو بھی ناظر کی چال سمجھ گیا تھا لیکن اسے شازی پر بڑا اعتماد تھا۔

میر فدو جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا، ناظر شازی کے قریب ہو گیا۔ شازی سکڑ گئی۔

"شازی!" اس نے شازی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

شازی نے موجود ملازم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "احتیاط، یہاں کوئی اور بھی تو موجود ہے۔"

ناظر کی آواز کپکپا گئی "اس کی پروا نہ کرو۔ جانتی ہو ہم نے یہ دعوت کیوں کی ہے؟"

شازی نے اک ادائے بے نیازی سے جواب دیا "نہیں!"

ناظر نے افسردگی سے کہا "آج ہم زیادہ تکلف سے کام نہیں لیں گے، جو کچھ کہنا ہے سیدھے سادے لفظوں میں کہہ دیں گے۔"

شازی اس کی صورت تکنے لگی۔

ناظر نے اس کی چوٹی ہاتھ میں لے لی اور کہنے لگا "شازی اس ناگ نے ہمیں ڈس لیا ہے۔ اس کا زہر تیزی سے چڑھ رہا ہے، کیا تم بھی ہمیں چاہتی ہو؟"

شازی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس صورت دیکھتی رہی۔

ناظر کا دم گھٹنے لگا "شازی تم بولتی کیوں نہیں، میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

شازی نے اداسی سے جواب دیا "ہمیں محبت راس نہیں آتی۔ اگر آپ واقعی ہم سے محبت کرنے لگے ہیں تو آپ کو اس بارے میں احتیاط برتنی چاہئیے۔ آپ ہمیں حاصل نہیں کر سکتے۔"

ناظر کا حوصلہ بڑھا "شازی! تم اس کی فکر نہ کرو، بس ایک مرتبہ اپنی محبت کا اقرار کر لو اور ہمیں یہ یقین دلا دو کہ تم شادی کر کے ہمارے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو، اس کے بعد کیا ہوگا، تمہیں کچھ بھی نہ سوچنا پڑے گا۔"

شازی نے موضوع بدلنے کے لئے میز پر رکھے ہوئے سازوں اور کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ کیوں رکھے ہیں۔ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔"

ناظر کے چہرے پر تازگی آ گئی، کہنے لگا "ہمیں موسیقی سے بڑی دلچسپی ہے۔ یہ ساز ہم خود بجا سکتے ہیں۔"

شازی نے کہا "لیکن آپ نے اس کا اظہار پہلے کبھی تو نہ کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، اس وقت اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہم نے کئی دن سے یہ طے کر رکھا تھا کہ تمہاری شاندار دعوت کریں گے اور اس موقع پر تم پر اپنے اس شوق کا اظہار کریں گے۔" پھر آہستہ سے بولا "سازوں کے پاس رکھی ہوئی کتاب ہماری بیاض ہے۔ ہم بہت خیالی آدمی ہیں اور ہم نے یہ طے کیا ہے کہ جب ہم تمہیں اپنی دلہن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہم دونوں یہاں اس سبزہ زار پر اسی طرح بیٹھا کریں گے اور تم ہماری غزلیں گایا کرو گی۔ ہم یہ ساز بجایا کریں گے۔"

شازی نے جواب دیا "ایں خیال است و محال است و جنوں۔"

ناظر بے چین ہو گیا "کیا تمہیں ہم سے محبت نہیں ہے؟"

"ہے کیوں نہیں!"

"پھر ہمارا یہ خیال محال اور جنون کس طرح ہوا؟"

"جناب والا! ہم دونوں کا ایک دوسرے سے محبت کرنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک بھی ہو جائیں گے!"

ناظر بچوں کی طرح اڑ گیا۔ "اگر ہم دونوں کوئی حتمی فیصلہ کر لیں تو ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔"

شازی نے کہا۔ "چلئے ہم اپنی محبت کا آپ کو یقین دلاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں آپ مشکلات کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔"

ناظر مارے خوشی کے اندھا ہو گیا، بے ساختہ اٹھ کے شازی کو گلے لگا لیا اور خوب بھینچ بھینچ کے پیار کرنے لگا۔

شازی کا دم گھٹنے لگا۔ "بولی، یہ سب ابھی تو نہ کیجئے، کہیں کوئی دیکھ نہ لے ہمیں۔"

ناظر نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں، دونوں ایک دوسرے کی سانس اپنے چہرے پر محسوس کر رہے تھے۔ ناظر نے کہا: "ہم ایک شرط پر تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔"

"کس شرط پر؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ اسے مان لوگی!"

"پہلے شرط تو بتایئے اگر ماننے والی ہوگی تو ضرور مان لیں گے"

"شرط مشکل نہیں ہے، بہت آسان ہے"

"آخر بتانے میں کیا حرج ہے؟"

"پہلے وعدہ کردو!"

"پہلے وعدہ!"

ناظر نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "چلو وہاں چلتے ہیں ہم ساز بجائیں گے اور تم ہماری بیاض میں سے کوئی غزل گاؤ گی، ہم چاہتے ہیں کہ وہ بات تم سے آج کہہ ہی دیں، جس کے لئے ہم بڑے مضطرب ہیں۔"

شازی تیار ہوگئی۔ دونوں میز کے پاس آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

شازی نے میز سے بیاض اٹھائی اور اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ ناظر نے ستار سنبھالا۔ شازی نے کہا: "غزل کے انتخاب اور اس کی دُھن میں عجلت کے پیش نظر ہم یہ وعدہ نہیں کرسکتے کہ ہم جو کچھ گائیں گے، اس سے آپ خوش بھی کرسکیں گے۔ اگر اس میں کمی رہ جائے تو للہ نکتہ چینی نہ کیجئے گا۔ معاف کردیجئے گا۔"

ناظر نے تاروں کو زخمہ دیا۔ بولا: "ہمارے لئے یہی خوشی کیا کم ہے کہ ہم نے جو ایک حسین خواب دیکھا ہے اس کی تعبیر کا ہلکا سا عکس اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس وقت نکتہ چینی کا ہوش ہی کس کمبخت کو ہے۔"

شازی نے غزل شروع کردی۔

"ہمارا ناکارہ ناصح مجھ سے کہتا ہے تو محبت مت کر، میں نے اسے جواب دیا۔ اس نصیحت کے سوا تو اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

محبت کی آگ نے گوشت اور پوست کو تو جلا ہی دیا تھا، اب اس کی آنچ ہڈیوں پر بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔

چاند میں وہ متناسب اعضا کہاں ہیں جو میرے محبوب کے جسم میں پائے جاتے ہیں، بھلا چاند سے میرے محبوب کا مقابلہ!!

خدا کی قسم اگر میرا محبوب مجھ سے یہ وعدہ کرے کہ میں ماگھ پوس کی کڑکڑاتی سردیوں میں تیرے پاس آؤں گا۔ تو برہنہ تن میرا انتظار کرنا، میں پورے دو ماہ بغیر لباس کے گزار دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں عشق کی تپش اور مفارقت کی آگ میرے وجود کو گرم رکھے گی۔"

لیکن اس حسین اور پُرکیف محفل کو ایک آواز نے درہم برہم کردیا۔ باغیچے کے باہر بختاور سنگھ کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کررہا تھا شازی کی سانس رُک گئی اور ناظر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بختاور سنگھ کہہ رہا تھا: "ابھی قبلہ ناظر صاحب! یہ خاکسار دیر سے آپ کی قدم بوسی کا طالب کھڑا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اندر حاضر ہوجاتے۔"

ناظر جوشِ غضب میں اندھا ہوگیا۔ شازی سے کہنے لگا: "اس کمبخت کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔ یہ یوں نہ باز آئیگا۔"

جوش میں ناظر باہر پہنچ گیا اور بختاور سنگھ کو ڈانٹتا ہوا بولا: "کوتوال صاحب! واللہ ہم نے آپ کا بڑا لحاظ کیا لیکن آپ کی رگوں میں کسی بنئے کا خون گردش کررہا ہے۔ آپ نے ہمارا یوں پیچھا پکڑ رکھا ہے جس طرح بنیا اپنے مقروض کا پکڑتا ہے۔"

بختاور سنگھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا ہنس کر بولا: "قبلہ ناظر صاحب بات یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ شازی کی حیثیت ایک کرائے کے مکان جیسی ہے جو اس کا کرایہ ادا کرے اس میں رہ سکتا ہے۔ آپ کرایہ ادا کریں گے آپ رہیں گے میں ادا کروں گا میں رہوں گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں ہی کرایہ ادا کریں اور مفاہمت کرکے دونوں ہی ایک ساتھ رہنے لگیں۔"

"گستاخ!" ناظر چیخا۔ "ہم تجھے قتل کردیں گے تو ٹھہر تو جا، ہم طپنچہ لاکے ابھی تجھے ڈھیر کئے دیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ناظر تیزی سے مکان میں داخل ہوگیا اور طپنچہ لیکر فوراً باہر آگیا لیکن اس وقت تک بختاور سنگھ فرار ہوچکا تھا۔ اس کا دور دور کہیں پتہ نہ تھا۔ ناظر غصے میں کانپتا تھر تھراتا شازی کے پاس پہنچا، طپنچہ میز پر رکھتا ہوا بولا: "واللہ اس بقال کی اولاد کی زندگی تھی جو بچ کر نکل گیا ورنہ اس وقت وہ خون و خاک میں لوٹ رہا ہوتا۔"

اسی لمحے میر فدو بھی واپس آگیا۔ جب اسے حالات کا علم ہوا تو اس نے ناظر کے رشتۂ امید کو توڑنے کی کوشش کی۔ کہنے لگا: "حضور! اپنے کوتوال صاحب بھی بڑے کرم فرما ہیں۔ یہاں آتے تھے تو میزبانی کا تقاضا بھی تھا کہ

انھیں بھی اندر بلا لیا جاتا۔" پھر کھو کھلی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔ "آپ کا گھر ہے آپ کا اختیار، جیسا کیا، اچھا کیا۔ میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ میں کچھ کہوں گا تو چھوٹا منہ، بڑی بات کہلائے گی۔"

ناظر کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "میر فدّو! یہ آپ کیا کہتے ہیں؟"

میر فدّو نے پھر وہی الفاظ دُہرائے۔ "بندہ پرور کوتوال صاحب نے ہم پر بڑے احسانات کیے ہیں۔"

"کیا احسانات کئے ہیں گناؤ کہ ان کا حساب چکتا کر دیا جائے۔"

میر فدّو میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اسی طرح غیر جذباتی آواز میں کہتا رہا۔ "کوئی ایک احسان ہو تو بتا دیا جائے، ایک ایک نشست میں سو سو، دو دو سو اشرفیاں شازی کو دے کر گئے ہیں۔ بات حق و انصاف کی کہوں گا جیسا ہے۔ اس کی ویسی ہی تعریف کروں گا۔"

ناظر ایک بار پھر تیزی سے اندر گیا اور ذرا سی دیر بعد ہی اشرفیوں کی تین تھیلیاں لے کر واپس آ گیا۔ انھیں میر فدّو کی طرف اُچھالتا ہوا بولا۔ "میر فدّو، تمھیں ابھی تک ہماری طبیعت کا صحیح علم نہیں ہے، ہم پوتر ٹوں کے رئیس ہیں، کسی بنئے بقال کی اولاد نہیں ہیں۔ یہ اشرفیاں لے جائیں اور جب پھر ضرورت ہو تو تشریف لائیں۔ انشاء اللہ اسی طرح پیشانی پر بل ڈالے بغیر اتنی ہی اشرفیاں اور پیش کر دیں گے۔"

میر فدّو نے تینوں تھیلیاں شازی کی طرف بڑھا دیں۔

ناظر کو اتنا غصہ چڑھا تھا کہ اسی وقت ملازم کو حکم دیا کہ بگھی تیار کی جائے اور ان دونوں کو ان کے گھر پہنچا دیا جائے۔"

حکم کی تعمیل ہوئی اور بگھی دروازے پر آ کر لگ گئی۔

شازی کا چہرہ اتر گیا وہ کبھی میر فدّو کی شکل دیکھتی تو کبھی ناظر کی صورت تکنے لگتی۔

میر فدّو نے اجازت طلب کی۔ "اچھا بندہ پرور! تو اجازت ہے؟"

ناظر نے سر کی جنبش سے اجازت دے دی۔

شازی نے نظروں سے اجازت طلب کی تو ناظر کا جوش ذرا کم ہوا، کہنے لگا۔ "تم اپنی طبیعت ملول نہ کرو۔ ہم جلدی ہی تمھارے پاس آئیں گے اور جو کچھ ہم نے سوچا ہے اس سے مطلع کریں گے۔"

لفظ "سوچا" پر میر فدّو کے کان کھڑے ہوئے معنی خیز نظروں سے شازی کو دیکھا اور اشرفیوں کی تینوں تھیلیاں سنبھال کر باہر نکل گیا۔







ناظر نے شازی کو بگھی پر بٹھا کر رخصت کر دیا۔

واپس آ کے وہ اسی میز پر بیٹھ گیا، جہاں ساز اور بیاض کے علاوہ بھرا ہوا طبنچہ بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ میز پہ سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ جب غصہ ذرا کم ہوا تو اسے اپنی غلطی کا شدّت سے احساس ہوا۔ بختاور سنگھ کے ساتھ جو سلوک سرزد ہوا تھا۔ اس کے نتائج سے وہ خوفزدہ تھا۔ اس نے سوچا کہ کوتوال اس کے خلاف معلوم نہیں کیا گل کھلاتے۔ اس نے اسی فکر اور تردد میں باغیچے میں نصف رات گزار دی۔

ناظر کئی دن تک دربار بھی نہ جا سکا۔ شازی سے ملنے کو جی چاہا لیکن غیرت پیر پکڑ لیتی تھی۔ بڑی ہمت کی پھر بھی قدم نہ اُٹھ سکے۔ اس عالم میں تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن ہمت کر کے بہن کے گھر پہنچ گیا یہاں پہنچتے ہی اس نے پہلی بات جو محسوس کی وہ یہ تھی کہ شازی جس گھر میں رہتی تھی اس میں بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ ناظر کا دل دھک سے

رہ گیا کہ خدا خیر۔

اور بہن کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھنے پر بس اتنی سی بات اور معلوم ہو سکی کہ کل وہ لوگ مکان خالی کر گئے۔ کر توال انھیں معلوم نہیں کہاں لے کر چلا گیا۔ ناظر کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا آ گیا، بہن سے زیادہ باتیں بھی نہ کر سکا۔ چپ چاپ مسہری پر جا کر پڑ رہا۔

اس بات کو بھی کئی دن گزر گئے اور ناظر بدستور خانہ نشین رہا، دربار بھی نہ جا سکا۔ اب اس کی عقل کچھ بھی کام نہ کرتی تھی۔ اسے بختاور سنگھ پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا، بار بار اسے قتل کر دینے کو جی چاہتا لیکن مآل اندیشی آڑے آ جاتی۔ کچھ دن تو یہ آس بھی رہی کہ شازی اس سے محبت کرتی ہے ایک نہ ایک دن وہ ضرور واپس آئے گی لیکن ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ واپس نہ آئی۔

ایک دن نواب کے دربار سے اس کا بلاوا آ گیا، نوابی فرستادے نے اسے یہ پیام دیا تھا کہ نواب صاحب اس کی غیر حاضری سے ناراض ہیں اور ان کا حکم ہے کہ ناظر اپنی اولین فرصت میں نواب کی بارگاہ میں حاضر ہو اور دست بستہ معافی کا طالب ہو۔

ناظر نے جلدی جلدی تیاری کی اور دربار میں حاضری دینے کے لئے بگھی پر روانہ ہو گیا، راستے بھر وہ اپنی غیر حاضری کے جواز کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کوئی زوردار عذر سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جب وہ نواب کے محل میں پہنچا تو پتا چلا کہ نواب صاحب اپنے دربار میں نہیں ہیں، اٹھ چکے ہیں۔ اور اس وقت کہیں اپنے مخصوص مصاحبین کے ساتھ انتہائی ذاتی مشاغل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ وہ واپس بھی نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اسے بلایا گیا تھا۔ اور نواب کی طلبی کے دوران واپسی کا حکم ملے بغیر چلے آنا سنگین جرم تھا۔ ناظر کو وہیں ٹھہرنا پڑا اور اس نے اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح نواب کو اس کی آمد کی اطلاع ہو جائے۔ بڑی دیر بعد اچانک حکم ملا کہ ناظر کو محفلِ خاص میں طلب کیا گیا ہے۔ وہ دھڑکتے دل، مرتعش اعضا اور لڑکھڑاتے قدموں سے نواب کے خواجہ سرا کے ساتھ محفل خاص کی طرف روانہ ہو گیا، وہ مختلف کمروں اور برآمدوں سے گزرتا ہوا محل کے انتہائی اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جس کے ملحقہ حصے سے بے ہنگم ہا ہو، شور غل اور رنج بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ خواجہ سرا اسے یہیں روک کر دوسری طرف چلا گیا اور کافی دیر بعد ناظر کی باریابی کی اجازت کے ساتھ واپس آیا، جب ناظر نے نواب کی بارگاہ میں حاضری دینے کے لئے آخری بار قدم اٹھائے تو وہ بہت بھاری ہو رہے تھے۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا لیکن وہ اپنے وجود کو زبردستی گھسیٹتا ہوا خواجہ سرا کا ساتھ دے رہا تھا۔

اندر کا سماں ہی نرالا تھا، ایک لمبی سی میز کے سامنے نواب نصیر الدین حیدر نشے میں بدمست بیٹھے ہوئے تھے، میز پر آلاتِ میکشی رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے مورچھل بردار خواتین کی قطار مورچھل ہلانے کی خدمت اس طرح انجام دے رہی تھیں کہ دو دو خواتین مورچھل ہلاتی ہوئی آگے بڑھتیں اور پھر جب وہ واپس ہوتیں تو دوسری دو خواتین ان کی جگہ لے لیتیں۔ یہ خواتین اتنی حسین تھیں کہ ناظر کے ہوش و حواس جاتے رہے، متناسب جسم سے چپکا ہوا چست لباس ان کے ایک ایک عضو کے زیر و بم کی اس طرح نمائش کر رہا تھا کہ آدمی کے جذباتِ شہوانی میں آگ لگ جاتی تھی۔ گھنیرے سیاہ گھونگھریالے بالوں کی چوٹیوں میں رنگین زرتار موباف قیامت ڈھا رہے تھے۔ ان کے زرد، سرخ اور نیلے لباسوں پر آب رواں کے دوپٹے حشر کا سامان تھے۔ ناظر تو اس جگہ کے ایک ہی منظر میں کھو گیا۔ اس عالمِ سرگشتگی میں اچانک اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی عام جگہ نہیں ہے۔ نواب نصیر الدین حیدر، والیٔ اودھ کی محفل خاص ہے۔ وہ مؤدب ہو گیا اور نواب کے سامنے جھک کر آدابِ شاہی بجا لایا۔ نواب نشے میں کچھ اتنے دھت تھے کہ انہوں نے ناظر پر کوئی توجہ ہی نہ دی۔ اچانک اس کی نظر اس حسینہ پر پڑی جو اس محفلِ خاص میں نواب کے لئے ساقی گری کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے تاریکی پھیلنے لگی۔ یہ شازی تھی، جس کے ایک شانے پر نواب کا ہاتھ تھا اور وہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے نواب کو جام پیش کر رہی تھی، ناظر کو اس منظر پر یقین نہ آیا اس نے فرطِ کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل سینے میں اس بری طرح ڈوب رہا تھا کہ اسے موت کا مزہ آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تو نواب صاحب شازی کو اپنی آغوش میں لے چکے تھے اور اس کے لب و رخسار پر بے تحاشا بوسوں کی بارش فرما رہے تھے۔ اس عالم میں شازی کی

نظریں ناظر سے مل گئیں اور وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ ناظر نے اس کی آنکھوں میں موجود حسرت و ناکامی کی افسردہ کیفیات کو محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہی ہو "ناظر! میں مجبور تھی، ناظر میں مجبور ہوں"۔

اچانک خواجہ سرا نے نواب کے کان میں کچھ عرض کیا اور نواب نے جھرجھری لے کر ناظر کو گھورا، غریب شاعر ان نظروں کی تاب نہ لا سکا پیر تھرتھرائے اور وہ دھم سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی نواب نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "واللہ! ہمارا بڑا رعب ہے۔ لوگ ہماری نظروں کی تاب نہیں لا سکتے" اس کے بعد خواجہ سرا کو حکم دیا "اس شاعر کو ہوش میں لایا جائے۔ ما بدولت اس سے چند باتیں کریں گے"۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ ناظر کو ہوش میں لایا گیا اور اسے دو آدمیوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کے نواب کے حضور لے جا کے کھڑا کر دیا۔ نواب صاحب انتہائی ترنگ میں تھے، بدمست شرابی کی طرح سر ہلاتے ہوئے ناظر کو ایک نظر دیکھا اور حکم دیا "اسے ہمارے داہنی جانب بٹھایا جائے"

اس حکم کی بھی تعمیل کر دی گئی۔ ناظر کو داہنی جانب کی ایک کرسی پر زبردستی بٹھا دیا گیا۔ ناظر کو اس وقت اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ اس نے خواب جیسے عالم میں یہ محسوس کیا کہ شرکاء محفل اسے تمسخر و استہزا سے دیکھ دیکھ کر کچھ مسکرا رہے ہیں اور کچھ زور زور سے ہنس رہے ہیں۔

نواب نے بہکے بہکے لہجے میں ارشاد فرمایا "واللہ یہ شاعر بہت خوش قسمت ہے، اس کے دل پر ہمارا رعب بیٹھ گیا ہے۔ ما بدولت سمجھتے ہیں کہ جو خود ہی مر رہا ہو اس کا مارنا فضول ہے"۔ اس کے بعد شازی سے پوچھا "کیوں لے دلنواز کشمیری کلی! اس بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

شازی نے سر جھکا کے عرض کیا "حضور کا ارشاد فرمان خداوندی ہے یہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا" اس نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن ان چند لفظوں کی ادائیگی میں اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ ناظر کے دل پر شازی کے یہ الفاظ برق بن کے گرے اور اس میں شازی سے متعلق سارے سہانے خواب جل کر خاک ہو گئے۔

نواب صاحب نے دیوانوں کی طرح شازی کو دیکھا اور ارشاد فرمایا "شازی ہم تجھ سے بہت خوش ہیں آج تو اس محفل کی جان ہے ہم تیرا رقص دیکھنا چاہتے ہیں اور کوئی درد بھری غزل بھی چھیڑ"۔

شازی تعمیل حکم میں فوراً جدا ہو گئی اور رقص پر آمادہ ہو گئی۔

نواب صاحب نے ہوشمند شرابی کے انداز میں ناظر کو دیکھا اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے فرمایا "او نادان کم عقل شاعر! کیا یہ درست ہے کہ تو اس بے مثل حسینہ کے عشق میں اتنا پاگل ہو رہا تھا کہ یہ جو ہماری امانت تھی تو اس سے عشق لڑا رہا تھا اور اس سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا؟"

ناظر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نصیر الدین حیدر نشے میں بہکتے رہے "لیکن تو نے دیکھا ہم ظل اللہ ہیں۔ ہماری امانت کی خدا حفاظت کرتا ہے۔ آج تو نادم و شرمسار ہے اور ہم کامران و بامراد۔ خبردار جو آئندہ ایسی نادانی کی حرکت کی۔ ہم تیری اس ادا سے بہت خوش ہیں کہ تیرے دل میں ہمارا رعب بیٹھ گیا ہے۔ آج اب جو کچھ بھی یہاں ہو گا تیری ضیافت میں ہو گا۔ ہم چاہتے ہیں کچھ تو بھی خوش ہو لے"۔

لیکن ناظر اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ نواب اس کرم فرمائی اور شاعر نوازی کے پردے میں اسے خوب اچھی طرح ذہنی کوفت اور قلبی اذیت پہنچا رہا تھا۔

اس کے بعد وہ دھما چوکڑی مچی اور نواب صاحب نے وہ ہنگامہ کیا کہ شازی رقص و موسیقی کا مظاہرہ بھی نہ کر سکی۔

جب نواب صاحب بالکل بے حال ہو گئے تو نیم وا مخمور آنکھوں سے شازی کو دیکھا اور اشارے سے اپنے قریب بلایا اور کسی کو حکم دیا "ارے کوئی ہے اس نازک اندام کشمیری کلی کو ہزار اشرفیاں عطا کی جائیں۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں"۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ نواب نے شازی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ہم اندر جائیں گے"۔

شازی نے بھاری بھرکم نواب کو بھرپور سہارا دیا اور نواب لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ حرم سرا کی طرف چل دیئے۔

اندر بیگمات شاہی نے شازی کو دیکھ کر منہ بنایا لیکن نواب نے انہیں ڈانٹ دیا۔ "منہ کیا بناتی ہو، یہ ہماری بیگم ہے۔ اس کا حسن دیکھو ہم اسے سونے کا مکان بنوا دیں گے اسے اپنی ملکہ بنائیں گے"۔ پھر ہنستے ہوئے شازی کو دیکھا اور گال پر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے دریافت کیا "کیوں ری! تو ہماری ملکہ بنے گی؟"

شازی نے بیگمات کی موجودگی میں شرما کر گردن جھکا لی کوئی جواب نہ دیا۔

نواب نے بیگمات کو ڈانٹا "تم سب دفعان ہو جاؤ یہاں سے، ہمیں اپنی شازی کے ساتھ چھوڑ دو، تخلیہ، تخلیہ!" ساری بیگمات ایک دم اِدھر اُدھر ہو گئیں اور وہاں نواب اور شازی کے سوا تیسرا کوئی شخص بھی نہ رہ گیا، پھر جو ندی چڑھتی ہے اور طوفان اٹھتا ہے تو وہ بڑی دیر تک شازی کو زیر و زبر کرتا رہا اور شازی تنکے کی طرح اس طوفان کی زد میں رہی۔

***

جب ناظر محل سے باہر آیا تو اس کی بختاور سے مڈبھیڑ ہو گئی ناظر بالکل بے جان ہو رہا تھا، اس کا دم خم اس سے چھن چکا تھا۔ اس نے بختاور سنگھ کو دیکھا اور اس طرح لاتعلق بن گیا گویا دونوں میں کبھی صاحب سلامت بھی نہ تھی۔

بختاور سنگھ نے اسے چھیڑا، پوچھا "کہاں سے آرہے ہیں؟ دربار سے؟ وہاں کچھ دیکھا؟"

ناظر نے کوئی جواب نہ دیا، اپنی بگھی کی طرف بڑھا۔

بختاور سنگھ بالکل قریب آگیا اور ایک بار پھر چھیڑا "نواب صاحب سے ملاقات ہوئی؟ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔"

ناظر پر جذبات کی شدت کا غلبہ تھا، اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس نے ایک نظر بختاور کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

بختاور سنگھ حیران تھا کہ اس گرم مزاج شاعر کو ہو کیا گیا۔ وہ ناظر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بولا: "اُس دن اگر میں بھاگ نہ آتا تو کیا آپ واقعی مجھے قتل کر دیتے؟"

ناظر بگھی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے بختاور سنگھ کو جھڑک دیا۔

"اپنی راہ لو، ہمیں مت چھیڑو، ہم اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔"

"دوست!" بختاور سنگھ کہنے لگا۔ "تم نے شازی سے اکیلے ہی اکیلے معاملہ کرنا چاہا۔ وہ بازار کی چیز تھی۔ ہم سب کو اس سے لطف اندوز ہونے کا حق پہنچتا تھا۔ لیکن تم نے خود غرضی سے اسے صرف اپنے لئے ہتھیا لینا چاہا اور مجھ سے اہانت آمیز سلوک کرنے لگے، پھر تو تم یہ جانو کہ تمہارے یار کو بھی ہزار ہتھکنڈے آتے ہیں۔ میں نے یہ سوچا کہ اب معاملہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے، تو بہتر یہی ہے کہ شازی نہ تمہیں ملے نہ ہمیں۔ جو اس کا اصل مستحق ہے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ حق بہ حقدار رسید کے مصداق اسے نواب صاحب کے حوالے کر دیا گیا اور اس سے متعلق اِدھر اُدھر سے کچھ روداد بھی گوش گزار کر دی گئی۔"

ناظر نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں، پائیدان پر پیر رکھ کر بگھی پر چڑھ گیا اور سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کوچوان کو حکم دیا "گھر!"

بگھی چل دی اور بختاور سنگھ اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا یہاں تک کہ بگھی چھوٹی ہوتی چلی گئی، اور پھر ٹیڑھے میڑھے راستوں میں کہیں گم ہو گئی۔

ناظر کچھ ایسی بے کیفی، مایوسی اور دل برداشتگی کا شکار ہوا کہ ہر کہیں کا آنا جانا موقوف ہوا۔ سارا سارا دن گھر اور باغیچے کے چکر لگاتا رہتا۔ شعر و شاعری پر بھی طبیعت آمادہ نہ ہوتی، کبھی منہ لپیٹ کے پڑ جاتا کبھی رونے لگتا، کبھی سوچنے لگتا، رنگین ماضی سے سوگوار حال اور ویران مستقبل تک اب کچھ بھی نہ رہ گیا تھا، اب اسے کسی کا خوف بھی نہ تھا۔ دربار کی آمد و رفت بھی موقوف ہو گئی، اسے نوابی عتاب کا بھی ڈر نہ تھا۔ معلوم نہیں اسے اب بھی یہ امید کیوں تھی کہ نواب کا ظالم و جابر ہاتھ شازی کو زیادہ دنوں تک اپنے قابو میں نہ رکھ سکے گا اور شازی محلسرا کی پُر پیچ چہار دیواریوں کو نانگتی پھلانگتی اس کے پاس آجائے گی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جائے گی۔ دل کا بوجھ اُتارنے کے لئے اس نے شازی کو خط لکھنا شروع کر دیا، اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ یہ خط شازی تک پہنچے گا کس طرح؟ اسے تو بس دل کی بھڑاس نکالنا تھی اُس نے لکھا:

"شازی! میرے تیرہ و تار غم خانے کے آفتاب! بالآخر تم محلسرا کے اُفق میں غروب ہو گئیں، کیا تم وہاں خوش ہو؟! اس دن تم نے میری بڑی جان جلائی، لیکن تم بھی کیا کرتیں، مجبور تھیں، شازی! تم نہیں جانتیں یہ نواب لوگ کتنے ظالم اور بے وفا ہوتے ہیں۔ یہ محبت نہیں کرتے یہ بوالہوس ہوتے ہیں، ان کی محبتیں، عنایتیں، کرم فرمائیاں اور نوازشیں وقتی ہوتی ہیں۔ چند دنوں یہ تم سے کھیلے گا اور پھر تم بھی ان سینکڑوں اور ہزاروں محلسرائی بدنصیبوں میں داخل کر دی جاؤ گی جن کی زندگیاں بقیہ زندگی کی آخری سانسوں تک مہجور و محروم رہیں گی، با

پھر اپنے جذبات اور خواہشات کی آگ بجھانے کے لئے اَن ادنیٰ خدمت گاروں کی منت کش ہوں جو ان کے آس پاس ان کی خدمتگاری اور نگرانی پر متعین ہیں۔

شازی: میں اب بھی تمہارا منتظر ہوں، جب چاہو آجاؤ، باغیچے میں میز بچھی ہے، شام ہوتے ہی، جب چراغ جل جاتے ہیں میں سازوں کو قرینے سے میز پر سجا کر ان کے قریب ہی اپنی بیاض رکھ دیتا ہوں اور باغیچے کے در پر نگاہیں جما کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تم ایک نہ ایک دن آؤ گی ضرور، کیونکہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے، جب تم آجاؤ گی تو میں اپنے منصوبے کے مطابق ستار بجاؤں گا اور تم میری غزلیں گایا کرو گی اللہ کیسا پُرلطف سماں ہوگا لوگ ہم پر رشک کریں گے اور ہاں ایک بات اور، اب بختاور سنگھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اپنی دانست اور اختیار میں ہمیں جو بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا پہنچا چکا، اب وہ ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔"

ناظر ہر روز اسی نوعیت کے خطوط اور منتقبل نامے شازی کے نام لکھتا رہتا اور رکھ کر احتیاط سے ایک صندوق میں جمع کرتا رہتا۔ اِدھر دربار میں بختاور سنگھ موقع موقع سے ناظر کے خلاف نواب صاحب کو ورغلاتا رہتا، کبھی کہتا: ناظر اب دربار میں بھی نہیں آتا۔ کبھی کہتا، ناظر "حضور کو نازیبا الفاظ میں یاد کرتا رہتا ہے"۔ لیکن نواب کو ایک معمولی شاعر بازاری زادے سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، ہاں بختاور سنگھ کا مرتبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ روزمرہ کے نوابی اخراجات بختاور سنگھ کی نگرانی میں ہونے لگے تھے جس سے اس کی دولتمندی میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ میر فدو بھی بہت خوش تھا کیونکہ شازی کا نصیبہ بڑے عروج پر تھا۔ اس کا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات تھی۔ میر فدو کی دولت بھی خوب بڑھ رہی تھی۔

محفلِ خاص سے مسلسل تک شازی کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ چرچے کسی نہ کسی طرح ناظر کے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔

ایک دن سہ پہر کو ناظر کا بے حد دل گھبرایا تو اس نے بگھی تیار کرائی اور اس پر سوار ہو کے دریائے گومتی کی طرف روانہ ہو گیا، جب بگھی دریائے گومتی کی سڑک پر پہنچی تو نوابی سپاہیوں نے اس کی گاڑی کو سڑک کے کنارے روک دینے پر مجبور کر دیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب کی سواری گزرنے والی ہے، ناظر کے جی میں آئی کہ کسی طرح وہ یہاں سے فرار ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اب تو بھاگنے کا وقت بھی نہ تھا، خوفزدہ اور پریشان سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد نواب کی سواری گزری، اس وقت نواب صاحب اپنی گاڑی سے دریائے گومتی کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ دفعتہً ان کی نگاہ ناظر پر پڑ گئی۔ نواب نے ایک خدمتگار کو حکم دیا کہ اس شاعر کو ان کے قریب لایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور لوگ ناظر کی طرف دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں ناظر کو لے کر نواب کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

نواب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ تاہم صبر و ضبط سے کام لیا اور ناظر سے دریافت کیا، "کیوں جی تم دربار کیوں نہیں آتے؟"

ناظر نے عذر کیا، "قبلۂ عالم پچھلے دنوں میں سخت بیمار رہا ورنہ یہ غلام حاضری سے محروم نہ رہتا"۔

اس نے محسوس کیا اندر سے کسی کی دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں اسے شبہ گزرا کہ یہ آنکھیں شازی کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتیں، اس کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے عجز و انکسار سے گردن جھکا لی۔

نواب نے حکم دیا "ہم راستے میں گفتگو کے قائل نہیں، یہ رسم شرافت کے خلاف ہے، کل تم دربار میں آؤ گے!" اور نواب کی سواری آگے بڑھ گئی۔

دوسرے دن دل نہ چاہنے کے باوجود وہ دربار چلا گیا، جس وقت وہ دربار میں پہنچا، نواب بختاور سنگھ سے مصروف گفتگو تھے اور طبیعت بڑی موزوں تھی، بختاور سنگھ ایک چونگلا لئے مؤدب خمیدہ سر کھڑا تھا۔

ناظر کورنش و تسلیمات بجا لایا، نواب نے ایک نگاہ غلط انداز سے اسے دیکھا اور بختاور سنگھ سے دریافت کیا "اس چونگلے میں کیا ہے"؟

بختاور سنگھ نے مختصر جواب دیا۔ "قبلۂ عالم کے ماہانہ خرچ کی فرد ہے یہ"۔

نواب نے کسی کو حکم دیا۔ "اس چونگلے کی پیمائش کی جائے"۔

بختاور سنگھ نے چونگلے کا ایک سرا پکڑ کے چھوڑ دیا جس سے وہ دور تک کھلتا چلا گیا۔ گز آچکا تھا اور دو آدمی چونگلے کی پیمائش کر رہے تھے۔ معلوم ہوا اس کی لمبائی ساڑھے چار گز اور چوڑائی نصف گز ہے۔ چونگلے کا طول و عرض ادب کے ساتھ اونچی آواز میں بتا دیا گیا۔

"کیوں جی! کل خرچ کتنا ہوا ہوگا؟"

بختاور سنگھ نے خود حساب کے میزان پر نظر ڈالی اور بآواز بلند عرض کیا، "قبلۂ عالم کل بانوے ہزار روپے۔"

"بس" نواب صاحب نے کہا، "یہ تو مہینے کے اخراجاتِ معمولہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے!"

بختاور سنگھ نے عجز و انکسار سے وضاحت کی "قبلۂ بندگاں! اس میں دو ہاتھیوں کی قیمت بھی شامل ہے!"

"خیر، خیر" نواب نے آخر میں دستخط کر دیئے "جاؤ اسی وقت خزانچی سے یہ رقم وصول کر لو۔"

جب بختاور سنگھ چلا گیا تو کسی مصاحب نے کہا "قبلۂ مومناں! اخراجات میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔"

نواب نے اسے ڈانٹ دیا "خاموش! ہم بھی سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ بختاور سنگھ دولتمند ہو جائے تو کیا تم ہمیں بخشش و عنایات سے روک لو گے؟"

معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اسی وقت اندرونی دروازے سے شنازی نمودار ہوئی۔ ناظر نے اسے جیسے ہی دیکھا، اپنے آپ میں نہ رہا۔ کچھ عجب سی کیفیت ہو گئی۔ شنازی ناز و انداز سے اٹھلاتی آہستہ آہستہ نواب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نواب نے اسے دیکھتے ہی کراہت سے کہا "بھئی کیا مصیبت ہے۔ یہ تو بلائے بے درماں ہو گئی ہے۔ اس سے خدا اپنی پناہ میں رکھے۔"

نواب کے ان فقرات سے ناظر کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ نواب کا دل اب شنازی سے بھر چکا ہے اور اسے بہت جلد قربت سے محروم کر دیا جائے گا۔

شنازی نواب کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ نواب کے التفاتِ بیجا اور کرم بے پناہ نے اس میں خو تے بے نیازی پیدا کر دی تھی۔ نواب نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

آج نواب کے مصاحبین میں چند انگریز بھی شامل تھے۔ نواب کو انگریزوں سے خصوصی اُنس تھا۔ شنازی کو حکم ملا کہ انگریز مصاحبین کے اعزاز میں کوئی غزل چھیڑی جائے۔ اس موقع پر ناظر کو یہ محسوس کر کے بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ شنازی اس کی موجودگی کو قطعاً نظر انداز کر رہی تھی۔ ناظر کے دل کو سخت دھچکا لگا۔ اسے شنازی سے ایسی امید نہ تھی۔

نواب کا حکم پاتے ہی شنازی پھرتی سے اٹھی۔ اس کے آس پاس اس کے سنگتی بھی آ کر کھڑے ہو گئے۔

شنازی نے وہی غزل چھیڑی جو وہ ایک بار ناظر کے باغیچے میں گا چکی تھی۔

"اسّی سالہ ناکارہ ناصح مجھ سے کہتا ہے تو محبت مت کر۔ میں نے اسے جواب دیا۔ اس نصیحت کے سوا تو اور کر ہی کیا سکتا ہے"

محبت کی آگ نے گوشت اور پوست کو تو جلا ہی دیا تھا۔ اب اس کی آنچ ہڈیوں پر بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔

چاند میں وہ متناسب اعضا کہاں ہیں جو میرے محبوب کے متناسب جسم میں — پھر چاند سے میرے محبوب کا مقابلہ؟!

خدا کی قسم اگر میرا محبوب مجھ سے وعدہ کرے کہ میں ماگھ اور پوس کی کڑکڑاتی سردیوں میں تیرے پاس آؤں گا۔ تو برہنہ تن میرا انتظار کر، تو میں پورے دو ماہ بغیر لباس کے گزار دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں عشق کی تپش اور مفارقت کی آگ میرے وجود کو گرم رکھے گی۔"

آج نواب پر سرد مہری کی کیفیت طاری تھی۔ کوئی داد نہ دی، نہ آواز کی نہ کلام کی۔ آخر میں طنز سے پوچھا۔ "کیوں جی! یہ کس احمق کا کلام ہے؟"

شنازی نے نہایت ادب کے ساتھ ناظر کی طرف اشارہ کیا۔ نواب صاحب نے اپنے مصاحبین کی توجہ کو اس طرف منعطف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "نابدولت کا خیال ہے کہ غزل کا اسّی سالہ سٹھیایا ہوا ناکارہ ناصح خود شاعر ہے جو ایسے بے سروپا مضامین اپنی غزل میں باندھ رہا ہے۔ دیکھو تو یہ احمق کیا کہتا ہے؟ کہتا ہے ماگھ پوس کی سردیاں برہنہ جسم پر جھیل سکتا ہے اور اس کے عشق کی آگ اسے حرارت بخشے گی۔ نری بکواس، سرتاپا ہذیان۔" اس کے بعد شنازی پر نزلہ گرا "اور تم؟ تم بھی سٹھیا گئی ہو احمق کشمیرن۔ تمہیں ایسی غزل کا انتخاب ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہر روز، ہر لمحہ تم، ہر آن تم — واللہ تم نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔" اس کے بعد ایک انگریز مصاحب سے دریافت کیا۔ "کیوں جی! اگر اس کشمیرن کو انگریز عورتوں کا لباس پہنایا جائے، تو یہ کیسی لگے گی؟"

انگریز مصاحب نے جواب دیا "جواب میں کچھ عرض کرنا فضول ہے اگر ارشاد عالی ہو تو یہ لباس منگوائے لیتے ہیں۔ اسی وقت پہنا کر دیکھ لیا جائے

حکم ہوا "اسی وقت ابھی منگاؤ، ہم انگریزی لباس میں اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

انگریز مصاحب فوراً وہاں سے چلا گیا اور ذرا سی دیر میں اپنی میم کا لباس لے آیا۔ اس کی میم موٹی تازی رہی ہوگی اور شازی اکہرے جسم کی تھی۔

نواب نے حکم دیا۔ "شازی! یہ لباس پہن کے آؤ۔"

حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات، بددلی سے اٹھی اور اندر جا کر مشرقی لباس اتارا اور یورپی لباس پہن لیا۔ جب پہن کر باہر آئی تو اس کا عجیب مضحکہ خیز حلیہ بن چکا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا، جھاڑ جھول، بدنمائی کے ساتھ کچھ اِدھر لٹکتا تھا اور کچھ اُدھر لٹکتا تھا۔ اس کی ساری نزاکت پر پانی پھر گیا تھا اور سارا حسن رخصت ہو چکا تھا۔

اس کی شکل دیکھتے ہی نواب صاحب کا قہقہہ بلند ہوا۔ مصاحبین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ پوری مجلس طنز و استہزا کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ دبے دبے، دھیمے دھیمے لہجوں اور آوازوں میں لوگ کہہ رہے تھے۔ "چڑیل بہت سر چڑھ گئی تھی۔ لے اب مزا چکھ۔"

ناظر کا غصے اور افسوس سے بہت بُرا حال تھا۔ اس سے شازی کی بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسی عالم میں جب اس نے یہ دیکھا کہ شازی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو رواں ہو چکے ہیں اور وہ رخساروں سے پھسلتے ہوئے ٹھوڑی کی راہ سے لباس پر ٹپک رہے ہیں تو اس کا دل بھر آیا اور اس سے یہ المناک منظر دیکھا نہ گیا۔

اسی عالم میں شازی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "قبلۂ بندگاں! لونڈی اپنے وطن کشمیر جانا چاہتی ہے اور رحمتِ عالی کی خواستگار ہے۔"

"نہیں!" نواب کا قہقہہ بلند ہوا۔ "ہم تمہیں اس حلیے میں سرِ دربار اور ہمیشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ واللہ کیا تفننِ طبع کا نسخہ ہاتھ آیا ہے، واللہ"

شازی کی نحیف سی آواز سنائی دی۔ "قبلۂ حاجتمنداں! لونڈی رحم کی طلب گار ہے۔"

یہ تماشا جاری ہی تھا کہ بختاور سنگھ پھر حاضر ہو گیا۔ جب اسے لوگوں سے یہ معلوم ہوا کہ شازی نواب کے جی سے اتر چکی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ خوشی میں پھولا نہ سمایا۔ اس نے سوچا۔ اپنا نصیبہ ان دنوں زوروں پہ ہے، نواب صاحب اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں کسی موقع پر شازی کو نواب سے مانگ لیا جائیگا۔ اس خیال میں ایسا نشہ تھا کہ اُس دن جب بختاور سنگھ دربار سے واپس ہوا تو وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور وہ پڑتا کہیں تھا۔

* * *

ناظر کی دربار جانے کی پھر ہمت نہ پڑی۔ لیکن بختاور سنگھ شازی کی امیدواری میں اور زیادہ مستعدی سے حاضری دینے لگا۔ اب تو یہ دستور ہو گیا تھا کہ شازی روزانہ ہی یورپین خواتین کے لباس میں نواب کے پاس موجود ہدفِ تضحیک بنی رہتی۔ اس نے جتنا عروج دیکھا تھا، اس سے کچھ زیادہ ہی زوال دیکھ رہی تھی۔ بختاور سنگھ موقع کی تلاش میں تھا اسے یقین تھا کہ یہ پکا ہوا پھل عنقریب اس کی جھولی میں گرنے والا ہے۔

ایک دن جب وہ دربار میں پہنچا تو نواب صاحب بہت خوش تھے بات بات پہ مذاق فرما رہے تھے۔ اس روز انہوں نے بھی انگریزی لباس پہن رکھا تھا۔ نواب صاحب کی یہ عادت تھی کہ جب وہ انگریزی لباس پہنتے تو انگریزی ٹوپی ہاتھ میں لیے رہتے اور مشغلے کے طور پر اسے انگلی پہ نچایا کرتے۔ اس روز بھی یہی شغل فرما رہے تھے۔ انگریز مصاحبین بھی موجود تھے۔ اچانک نواب صاحب کہیں جانے کے لئے اُٹھے۔ سارے مصاحبین بھی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انگریزی ٹوپی نواب کی انگلی پر حرکت میں تھی معلوم نہیں کس طرح اس میں سوراخ ہو گیا اور انگلی ٹوپی کے آر پار ہو گئی۔

نواب نے حیرت سے اسے دیکھا اور بے ساختہ بولے۔ "ایں یہ کیا؟"

بختاور سنگھ ادب سے آگے بڑھا اور حاضر جوابی کے نشے میں بول اُٹھا۔ "حضور! تاج میں سوراخ ہو گیا؟"

نواب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصے سے چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مصاحبین کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ بختاور سنگھ کی جان نکل گئی۔ لیکن تیر نکل چکا تھا۔ اس کی واپسی ناممکن تھی۔ نواب نے غصے میں پیر پٹکے اور چیخ کر کہا۔ "بدشگونی، بدفالی۔ ہمیں اس کی باتوں سے بغاوت کی بو محسوس ہوتی ہے؟" پھر جوشِ غضب میں تالی بجائی۔ کئی خدمتگار حاضر ہو گئے۔ نواب نے حکم دیا۔ "بختاور سنگھ کو گرفتار کر لو۔"

بختاور سنگھ گرفتار ہو گیا۔ آناً فاناً سارے اعزازات چھن گئے۔

نواب نے دوسرا حکم دیا۔ "اس کے طپنچے کو قابو میں کیا جائے اور ہمیں بتایا جائے کہ وہ بھرا ہوا ہے یا خالی ہے۔"

طپنچہ بھی چھین گیا اور بتایا گیا کہ طپنچہ بھرا ہوا ہے۔

نواب صاحب نے انگریز مصاحبین کو مخاطب کیا۔ "کیوں جی!

تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ بختاور سنگھ باغی ہو گیا تھا نا؟ اور اس کی بغاوت کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ اس نے پہلے تو ہمارے تاج میں سوراخ کیا اور اس نے سوراخ سے پہلے اپنے طپنچے کو بھی بھر رکھا تھا۔"

ایک انگریز مصاحب نے آہستہ سے عرض کیا۔ "پیرو مرشد! بختاور سنگھ کوتوال تھا اسے اپنے منصب کی بجا آوری کے دوران طپنچے کو بھرا ہوا ہی رکھنا چاہیے۔"

نواب نے اس دلیل کو رد کر دیا "تم انگریز ان ہندیوں کی فطرت کیا جانو! اور ہاں ہمیں یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارے انگلستان میں تمہارے بادشاہ کے روبرو ایسا جرم سرزد ہو تو اسے کیا سزا دی جاتی ہے؟"

انگریز مصاحب نے عرض کیا۔ "قبلۂ عالم! ہمارا بادشاہ پہلے جرم کی خوب اچھی طرح چھان بین کراتا ہے۔ اس کے بعد یا تو چھوڑ دیا جاتا ہے یا ثابت شدہ جرم کی نوعیت پر معمولی یا غیر معمولی سزا دی جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" نواب نے اطمینان کی سانس لی۔ "ہم بھی یہی کریں گے۔ رہا جرم کے ثابت ہونے کا سوال تو وہ تو ثابت ہی ہو چکا ہے۔ بختاور کی بدخواہیٔ سلطنت ثابت ہو چکی ہے اور دوسرا سنگین جرم یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا طپنچہ بھرا ہوا تھا۔ بس یہ دو باتیں جرم کے سنگین ہونے کی بخوبی دلالت کرتی ہیں۔" اور فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "بختاور سنگھ کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے، اس کی کل املاک اور جائیداد نیلام کرا کے اس کی رقم داخلِ خزانہ کی جائے اور بختاور سنگھ کو تا زیست بندی خانے میں ڈال دیا جائے۔"

یہ حکم، حکمِ نادری تھا۔ دو آدمی انتہائی ذلّت اور بیدردی سے اسے کھینچتے ہوئے دربار کے باہر لے گئے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ فیصلے کے تمام حصّوں پر نہایت مستعدی سے عمل کیا گیا۔ اور بختاور سنگھ کی املاک اور جائیداد بحقِ سرکار نیلام کر کے رقم داخلِ خزانہ کر دی گئی۔

* * *

اس واقعے کو کئی سال گزر گئے۔ نواب نصیر الدین حیدر رحلت فرما گئے۔ ان کی جگہ نواب محمد علی شاہ نے اودھ کا تاج و تخت سنبھالا تخت نشین ہونے کی خوشی میں بہت سے قیدی رہا ہوتے۔ انہی میں بختاور سنگھ بھی تھا۔ وہ بالکل بوڑھا ہو چکا تھا صحت تباہ ہو چکی تھی بینائی بھی جواب دے چکی تھی کسی مسافر کی طرح جب وہ لکھنؤ کی کھلی فضاؤں میں سانس لینے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائے بیوی بچے نواب مرحوم کے عتاب سے بچنے کے لئے انگریزی علاقے کانپور میں چلے گئے تھے۔ اس کا اپنا لکھنؤ اب ایک اجنبی شہر تھا۔ سڑکیں مانوس سی ضرور لگتی تھیں۔ لیکن ان میں بیگانگی کا عنصر بھی محسوس ہوتا تھا ذہن پر زور دیا کہ کہاں جایا جائے، یہاں تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اسی غور و فکر میں اسے ناظر یاد آ گیا۔ وہ بدنصیب شاعر اور اس کا رقیب، جس کی کئی بے عزتیاں نواب کے دربار میں ہو چکی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ناظر کی طرف چل دیا۔

مغرب کا وقت تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جب وہ ناظر کے گھر پر پہنچا اور اس نے مرتعش ہاتھوں سے دروازے پر دستک دی تو کچھ دیر بعد اندر سے ایک ملازم نمودار ہوا۔ اس نے پوچھا "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

بختاور سنگھ نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ "میں ناظر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

بختاور سنگھ کو بڑا دکھ پہنچا۔ "یہ آدمی لکھنؤ کے کوتوال بختاور سنگھ کو نہیں جانتا۔" لیکن اس نے سوچا۔ اس کی بھی کیا خطا، اب یہاں اسے کوئی بھی نہیں پہچانتا۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "ہمیں بختاور سنگھ کہتے ہیں۔"

"بختاور سنگھ!" ملازم کو کوئی بات کھٹکی۔ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"یہ کیسا سوال کرتے ہو بھائی!" بختاور کا دل بھر آیا۔ "اب تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں سے آیا ہوں۔ میرے بھائی! تم اسی لکھنؤ کے رہنے والے ہو یا کہیں مضافات سے آئے ہو؟"

ملازم نے جواب دیا۔ "میں اسی لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہوں۔"

بختاور سنگھ کو یک گونہ خوشی سی ہوئی، بولا۔ "تب پھر تم ہمیں بآسانی پہچان لوگے۔ آج سے آٹھ سال پہلے تمہارے لکھنؤ میں کوتوال کون ہوا کرتا تھا، جانتے ہو؟"

ملازم نے اپنے حافظے پر زور دیا اور پھر فوراً ہی باہر آ گیا۔ "دیہ آپ ہیں کوتوال صاحب!" اس نے نہایت عقیدت و احترام

سے بختاور کو سلام کیا۔

بختاور نے افسردگی سے جواب دیا۔ "ہاں یہ میں ہوں ہیر بھائی نواب محمد علی شاہ نے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں جن قیدیوں کو رہا فرمایا ہے، انہی میں میں بھی ہوں۔" پھر دریافت کیا۔ "اپنے ناظر میاں تو خیریت سے ہیں؟"

ملازم بختاور کو باغیچے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اس کے در کی طرف لے کر چلا اور کہنے لگا۔ "ان کا حال کیا پوچھتے ہیں کوتوال صاحب! ان کا عجیب حال ہے۔ ہم انہیں لاکھ لاکھ یہ یقین دلاتے ہیں کہ شازی یا تو اپنے وطن کشمیر واپس چلی گئی یا مزید دولت کمانے کی ہوس میں کسی دوسرے دربار کا رخ کر گئی ہے۔ لیکن ان کا تو جیسے ذہنی توازن ہی بگڑ گیا ہے کھاتے پیتے ہیں لیکن بات چیت کم کرتے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے بھی نہیں، شازی کا کبھی نام بھی نہیں لیتے۔ لیکن جہاں شام ہوتی ہے، یہ باغیچے میں بچھی ہوئی میز پر ساز اور ریاض رکھ کے بیٹھ جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں باغیچے کے در پر لگ جاتی ہیں، جیسے شازی بس آنے ہی والی ہو۔ اس انتظار میں جب نصف رات گزر جاتی ہے تو اٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں۔"

جب ملازم بختاور سنگھ کو لیکر ناظر کے سامنے پہنچا تو وہ اپنے پرانے رقیب کو پہچان نہ سکا۔

ناظر نے جھرجھری لی۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں بختاور سنگھ کو دیکھا اور کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہ گیا۔ ناظر کی صحت بھی تباہ ہو چکی تھی آنکھیں ویران اور ایسی خشک تھیں جیسے اب ان میں کچھ بھی نہ رہ گیا ہو۔

اچانک ناظر اٹھا اور بے ساختہ بختاور سنگھ سے لپٹ گیا، "کوتوال صاحب!"

بختاور کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں ناظر کی پشت تھپتھپاتا ہوا بولا۔ "ناظر، میرے بھائی! صبر کرو، صبر! دیکھو تو میں تم سے زیادہ دکھی ہوں۔"

ناظر نے کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن جب بختاور سنگھ کے سینے کے کپڑے کے اس پار جسم نے کچھ نمی محسوس کی تو اسے اندازہ ہوا کہ آج ان ویران آنکھوں سے، جو بظاہر خشک اور صحرا کی مانند تھیں ایک چشمہ بہہ نکلا ہے اور اس کی سوت سینے پر عین اس کے دل پہ پھوٹ نکلی ہے، جس میں ساری کدورتیں، جملہ آلائشیں اور تمام باہمی تکدرات خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں۔

اس کہانی کے تاریخی پس منظر کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔

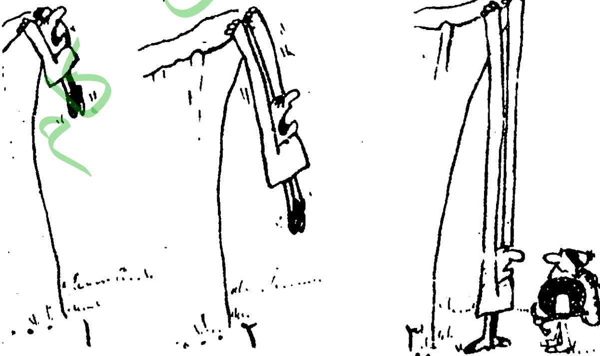
گزشتہ لکھنؤ (مولانا عبدالحلیم شررؔ)

آخری تاجدار اودھ اور انکی معزولی کے اسباب (محمد تقی احمد ایم اے)

شباب لکھنؤ (دی لائف آف این ایسٹرن کنگ) ترجمہ: محمد احمد علی، بی اے،

کمپنی کی حکومت (از باری)

کارل مارکس اور ہندوستان (کارل مارکس) ترجمہ ساحر لدھیانوی



وفادار

وسیلہ خاتون

جو اعلیٰ درجے کی کہانیاں پڑھنے کا فن جانتے ہیں ان کیلئے ایک کہانی!

ہنری دی پیرس میں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر دن سرکاری ملازمت اور مختلف علاقوں اور ملکوں کے سفر میں گزارے۔ اس طرح انھیں دنیا کی بہت سی تہذیبوں کے مشاہدے کا موقع مل گیا۔ بعد کو وہ فرانس کی اسمبلی میں سنیٹر منتخب کر لئے گئے ــــ انھوں نے بہت خوبصورت اور دل پر اثر کرنیوالی شاہکار کہانیاں لکھی ہیں۔ انکے ایک ناول "کارروائی" نے تو غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ انکی کہانیوں میں زندگی کے حقائق، اقدار اور فرد کی ناقابلِ فہم نفسی کیفیتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی محنت اور توجہ سے کہانیاں لکھتے تھے اور فن برائے فن کے قائل تھے۔ "وفادار" ان کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ (مدیر)

فیلکون چھوٹے قد، صحت مند اور توانا جسم، سیاہ بال، ستواں ناک، پتلے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں اور گندمی رنگت کا آدمی تھا۔ وہ اپنے بہترین نشانے کی وجہ سے دُور دُور تک مشہور تھا۔ ایک مرتبہ فیلکون نے اپنی نشانے بازی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ اسّی قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے ایک کاغذ کے پیچھے رکھی ہوئی موم بتی اپنے پہلے نشانے میں بجھا دی۔ موم بتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور پھر اندھیرا ہو جانے پر اس نے چار گولیاں اور چلائیں اور یہ چاروں گولیاں کاغذ کے پار ہو گئیں۔ جی ہاں یہ چاروں گولیاں اندھیرے میں صرف اندازے سے چلائی گئی تھیں۔ ایک بہترین نشانے باز کے علاوہ فیلکون جہاں ایک بے حد مخلص دوست تھا وہیں وہ ایک خطرناک دشمن بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر اگر لوگ اس کی دوستی سے محروم رہتے تھے تو ان کی یہ کوشش بھی رہتی تھی کہ اس کی دشمنی سے محفوظ رہیں۔

فیلکون فرانس کے ایک قصبے کورسیکا کے باہر رہتا تھا۔ فرانس میں یہ علاقہ بہترین چراگاہ کی حیثیت سے بہت مشہور تھا۔ اس کے مکان سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک بے حد گھنا جنگل واقع تھا۔ اس جنگل کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر آپ نے کسی کو قتل کر دیا ہے تو اس جنگل میں جا کر چھپ جائیں۔ آپ کے پاس صرف بندوق اور کارتوس ہونا چاہئیں۔ آپ پوری زندگی وہاں بڑے آرام سے گزار سکتے ہیں۔ رہ گیا کھانے پینے کی چیزوں کا مسئلہ تو یہ آپ کو چرواہوں سے ملتی رہیں گی اور ان حالات میں لوگ ایسا کرتے بھی تھے۔

فیلکون کی زندگی اطمینان سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی پچاس سے زائد بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اس کے پاس بہت سی بھیڑیں تھیں جنہیں اس کے ملازم چرواہے دن بھر پہاڑوں میں چراتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی ان کی کارکردگی دیکھنے چلا جاتا تھا۔ اچھی



خاصی آمدنی تھی۔ وہ اپنی تین لڑکیوں کی شادیاں کرچکا تھا اور سب سے چھوٹی اولاد ایک لڑکا تھا جس کا نام اس نے فورچوناٹو رکھا تھا۔ اس لڑکے کی عمر دس سال تھی لیکن وہ بے حد ذہین اور ہونہار بچہ تھا۔

ایک روز موسمِ بہار کی صبح فیلکون اپنی بیوی کے ہمراہ پہاڑوں میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی چراگاہوں میں اپنے چرواہوں کی کارکردگی دیکھنے چلا گیا۔ اس کے لڑکے نے ساتھ چلنے کی ضد کی جسے اس نے دو وجوہ سے رَد کردیا۔ ایک تو یہ کہ جن چراگاہوں میں وہ جارہا تھا وہ کافی دُور تھیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ گھر پر کسی نہ کسی فرد کی موجودگی ضروری تھی۔ کیونکہ ان کا گھر قصبے سے باہر تھا اور ان کے ہاں کوئی گھریلو ملازم بھی نہ تھا۔

فیلکون اور اس کی بیوی کے چلے جانے کے کئی گھنٹے بعد جب فورچوناٹو کمرے میں لیٹا صاف اور روشن آسمان پر نظریں گاڑے آنے والے اتوار کے خیالوں میں گم تھا۔ اس روز قصبے میں اسے اپنے چچا کے گھر دعوت میں جانا تھا کہ اچانک وہ گولیوں کی آوازیں سُن کر چونک گیا۔ یہ آوازیں گھنے جنگل کی طرف سے آرہی تھیں۔ وہ بستر پر سے اُٹھ گیا اور کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ وقفے وقفے سے گولیاں چل رہی تھیں اور ہر مرتبہ ان کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی جس نے سر پہ ایک بڑا سا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور وہ اپنی بندوق کے سہارے بڑی مشکل سے گھسٹ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس شخص کے کولہے میں گولی لگی تھی۔

یہ شخص ایک خطرناک مجرم تھا جو رات کے اندھیرے میں جنگل سے نکل کر قصبے میں کارتوس لینے گیا تھا کہ حکومت کے ایک فوجی دستے سے آمنا سامنا ہوگیا۔ جو اس علاقے میں خاص طور پر متعین تھا۔ ایک زبردست مقابلے اور گولیوں کے تبادلے کے بعد وہ ان کے نرغے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ رات بھر وہ پہاڑیوں میں چھپ کر اپنی جان بچاتا رہا اور فوجی اس کے پیچھے لگے رہے۔ جب وہ جنگل کے قریب پہنچا تو اچانک ہی اس کے ایک کولہے میں گولی لگ گئی جس کی وجہ سے اس نے گھنے اور دشوار جنگل میں داخل ہونے کا ارادہ ملتوی کردیا اور اس سمت مڑ گیا جہاں فیلکون کا مکان تھا۔

فورچوناٹو نے مکان سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔

"تم فیلکون کے لڑکے ہو؟" زخمی مجرم نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"میرا نام گیانٹو ہے۔ میرے پیچھے فوجی کتّے لگے ہوئے ہیں۔ مجھے فوراً کہیں چھپا دو کیونکہ میں بھاگ نہیں سکتا۔ میرے گولی لگ گئی ہے۔" زخمی مجرم نے کہا۔

"میں تمہیں چھپا تو دوں لیکن میرے والد کیا کہیں گے؟ ان کی اجازت کے بغیر میں کس طرح تمہیں چھپا سکتا ہوں؟"

"تمہارے پاپا، تمہیں اس کام پر شاباشی دیں گے بیٹے۔" زخمی مجرم نے کراہتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" فورچوناٹو نے اعتراض کیا۔

"جلدی کرو مجھے کہیں چھپا دو۔ وہ لوگ آنے ہی والے ہیں۔"

"تمہیں میرے پاپا کا انتظار کرنا ہوگا۔ ان کی اجازت کے بغیر میں یہ نہیں کرسکتا۔"

"میں انتظار نہیں کرسکتا کیونکہ وہ لوگ پانچ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے، جلدی کرو ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔"

"تمہاری بندوق کی طرح تمہارے کارتوسوں کی پیٹی بھی خالی ہے۔" فورچوناٹو نے سرد مہری سے کہا۔

"میں تمہیں اپنے خنجر سے ماردوں گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن کیا تم اس حالت میں مجھ سے زیادہ تیز دوڑ سکتے ہو۔؟" فورچوناٹو نے کہا اور اُچھل کر اس کی زد سے پیچھے ہٹ گیا۔

"تم فیلکون کی اولاد نہیں ہوسکتے ورنہ کبھی اس طرح مجھے اپنے گھر کے احاطے میں ان فوجی کتّوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑتے۔"

اس جملے کا بچّے پر گہرا اثر ہوا۔ وہ زخمی مجرم کے قریب گیا۔

"اگر میں تمہیں چھپا دوں تو تم مجھے کیا دوگے؟" اس نے پوچھا

اس خطرناک مجرم نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ فرانک کا سکّہ نکالا جو یقیناً اس نے کارتوس خریدنے کے لیے بچا رکھا تھا بچّے نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چاندی کا وہ سکّہ لے لیا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں، اِدھر آؤ۔"

فورچوناٹو نے مکان کے قریب پڑے ہوئے گھاس کے ایک

بہت بڑے ڈھیر میں جلدی سے ایک بڑا سوراخ بنایا اور زخمی مجرم کو اس کے اندر گھس جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے جلدی سے دوبارہ گھاس کا وہ ڈھیر پہلے کی طرح درست کر دیا۔ اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد اس نے جلدی سے اپنی بلی کو اس کے چار بچوں سمیت گھاس کے اس ڈھیر پر بٹھا دیا۔ بلی اپنے بچوں سمیت وہاں اطمینان سے بیٹھ گئی۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے کسی نے گھاس کے اس ڈھیر کو چھوا بھی تھا۔ پھر اس کی نظر خون کے ان قطروں پر پڑی جو زخمی مجرم کی ٹانگ سے بہہ کر زمین پر گر کر جم گئے تھے۔ بچے نے بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے دُور تک ان قطروں کو پاؤں سے مٹی ڈال کر چھپا دیا اور پھر اطمینان سے اپنے گھر کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اسے چھ باوردی فوجی نظر آئے جو اس کی جانب خون کے قطروں کے نشانات دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ اس مختصر سے فوجی دستے کی کمان گمبا کر رہا تھا۔ یہ گمبا فورجونا ٹو کے باپ سے دور کا رشتہ رکھتا تھا اور کافی عرصے سے اس علاقے میں متعین تھا اور اس نے کئی خطرناک مجرم پکڑے تھے، اس لیے مجرموں کی دُنیا میں وہ کافی مشہور تھا۔ اور غیر قانونی کارروائیوں میں مصروف لوگ اس کے نام سے خوف کھاتے تھے۔ گمبا نے فورجونا ٹو کو دیکھ کر دُور ہی سے اپنی ٹوپی اُتار کر اسے سلام کیا جس کا جواب بچے نے بڑی سعادت مندی سے ہاتھ ہلا کر دیا۔

گمبا نے پوچھا۔ "پیارے بھتیجے کیا تم نے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے کسی آدمی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"اوہ کاش میں بھی اتنا لمبا ہوتا جتنے تم ہو۔" بچے نے سادگی سے اس کے سوال کا جواب نظر انداز کر دیا۔

"خدا نے چاہا تو تم بھی بہت جلد اتنے لمبے ہو جاؤ گے لیکن کیا تم نے ادھر سے کسی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟"

"کیا میں نے ادھر سے کسی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟" بچے نے سادگی سے سوال دُہرایا۔

"ہاں۔ ایک ایسا آدمی جس نے بہت بڑا ہیٹ پہن رکھا ہے جو زخمی بھی ہے اور اس کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا کوٹ ہے۔"

"ایک ایسا آدمی جس نے بہت بڑا ہیٹ پہن رکھا ہے جو زخمی ہے اور جس کے کوٹ کا رنگ گہرا نیلا ہے۔" بچے نے اس کے سوال کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے اس کا سوال پھر دُہرایا۔

"میرے سوال کا جواب دو، سوال کو دہراؤ مت۔" گمبا نے چلّا کر کہا۔

"آج صبح یہاں پیرو آیا تھا جو پاپا کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ میں نے ــــ"

"شیطان! تم اپنی حرکت سے باز آ جاؤ اور مجھے جلدی سے بتا دو کہ کیا تم نے گیانٹو کو یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی راستے پر آیا ہے۔"

"یہ کون کہہ سکتا ہے؟"

"میں کہہ سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اسے ضرور دیکھا ہو گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے اسے گھر میں پناہ بھی دی ہو۔ اس کی ایک ٹانگ زخمی ہے۔ وہ ایک ٹانگ سے جنگل میں نہیں جا سکتا۔ اس کے علاوہ خون کے نشانات یہاں آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ "آؤ دوستو ہمیں اپنے مجرم کو اس گھر میں خود ہی تلاش کرنا چاہیے۔"

"اور پاپا کیا کہیں گے؟" فورجونا ٹو نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ ان کی غیر حاضری میں تم نے مکان کی تلاشی لی تھی۔"

"بدمعاش بچے! اپنی زبان سنبھال۔ دو تھپڑوں میں دماغ دُرست کر دوں گا۔"

"میرے پاپا کا نام فیلکون ہے۔" بچے نے بدستور گھورتے ہوئے کہا۔

"بند کر یہ بکواس۔ تم جانتے ہو کہ میں تمہیں جیل میں سڑوا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں مارتے مارتے تمہاری کھال بھی ادھیڑ سکتا ہوں۔ تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ تم نے گیانٹو کو کہاں چھپایا ہے۔"

"میرے باپ کا نام فیلکون ہے گمبا!" بچے نے بے خوفی سے پھر اپنی پہلی بات دہرائی۔ اس پر ایک فوجی نے آگے بڑھ کر گمبا سے کہا۔ "بچے سے بحث کرنا فضول ہے ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے۔"

گمبا خاموش ہو گیا اور دو باوردی فوجی مکان کے اندر گھس گئے جو صرف ایک چوکور کمرے پر مشتمل تھا۔ اس دوران فورجونا ٹو اپنی بلی کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا جو گھاس کے ڈھیر پر اپنے

بچّوں کے ساتھ اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں فوجیوں کی بیوقوفی پر لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

ایک فوجی گھاس کے ڈھیر کی طرف آیا اور جب اس نے گھاس پر بیٹھی ہوئی بلّی اور اس کے بچّوں کو دیکھا تو اس نے بے دلی سے گھاس کے ڈھیر میں اپنی بندوق کی نال ماری اور کندھے اُچکا کر پیچھے ہٹ گیا گھاس کے ڈھیر میں کوئی جنبش ہوئی اور نہ ہی بچّے کے پُرسکون چہرے سے جذبات کی کوئی ہلچل محسوس ہوئی۔

اپنی تلاش سے ناکام ہو کر گمبا اور اس کے پانچ ساتھی پھر یکجا ہو گئے اور وہ مایوسی سے اس راستے کو دیکھنے لگے جس سے وہ یہاں تک آئے تھے۔ گمبا کو معلوم تھا کہ فیلکون کے لڑکے کو ڈرانا اور دھمکانا فضول ہے۔ اس لیے اس نے آخری حربے کے طور پر لالچ اور خوشامد کو آزمانے کی ٹھانی۔

"میرے پیارے بھتیجے!" گمبا نے کہا "میں چاہوں تو تمہیں جیل میں بند کر سکتا ہوں لیکن میں فیلکون کو کسی پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن جب فیلکون واپس آئے گا اور میں اسے پورا واقعہ بتاؤں گا تو وہ تم سے ناراض ہو جائے گا۔"

"تم ایسا کرو گے؟"

"ہاں میں ضرور ایسا کروں گا اور وہ جھوٹ بولنے پر ہنٹر سے تمہاری کھال کھینچ دے گا۔"

"نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے۔" فورچوناٹو نے کہا لیکن اب اس کی آواز سے خوف نمایاں تھا۔

"تم دیکھنا ایسا ہی ہوگا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اچھے بچّے ہو۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا جو جانتے ہو سچ سچ بتا دو۔ سچ بولنے پر میں تمہیں ایک خوبصورت تحفہ بھی دوں گا۔ دیکھو" گمبا نے جیب سے ایک چاندی کی چھوٹی سی جیبی گھڑی نکال کر اسے دکھائی۔ اس خوبصورت گھڑی کو دیکھ کر فورچوناٹو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بھتیجے یہ خوبصورت گھڑی گلے میں ڈال کر جب تم باہر نکلو گے تو لوگ چلتے چلتے رُک جایا کریں گے اور تم سے وقت پوچھا کریں گے جب وہ تم سے وقت پوچھیں گے تو تم کہنا کہ لو خود ہی دیکھ لو میری گھڑی میں"

"جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو میرے چچا مجھے گھڑی دلا دیں گے"

بچّے نے پُرشوق نظروں سے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے لیکن یہ تو دیکھو کہ تمہارے چچا کا لڑکا جو تم سے بھی چھوٹا ہے اس کے پاس ابھی سے ایک گھڑی موجود ہے اور تم جو اس سے بڑے ہو مگر تمہارے پاس ایک بھی گھڑی نہیں۔"

بچّے نے ایک گہرا سانس لیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تمہیں یہ گھڑی پسند آ گئی ہے اور تم بشوق یہ گھڑی لینا پسند کرو گے۔ اتنی خوبصورت گھڑی تو تمہارے چچا کے لڑکے کے پاس بھی نہیں ہے۔ کیوں؟"

بچّے نے کن انکھیوں سے گھڑی دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ وہ خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے گھڑی کو دیکھا اور ایک گہرا سانس لیا۔

"تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟" بچّے نے پوچھا۔

گمبا نے گھڑی بچّے کی طرف بڑھا دی۔ "خدا کی قسم میں تم سے مذاق نہیں کر رہا، تم مجھ سے فوراً یہ گھڑی لے لو اور مجھے صرف یہ بتا دو کہ گیانٹو کہاں ہے۔"

بچّے نے گمبا کی آنکھوں میں دیکھا جیسے وہ اس کی باتوں کی سچّائی کا یقین کرنا چاہتا ہو۔

"میں ان لوگوں کے سامنے قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے یہ بتا دیا کہ گیانٹو کہاں ہے تو میں تمہیں یہ گھڑی دے دوں گا۔" اس کے بعد قسم کھاتا ہوا بولا۔ "اگر میں ایسا نہ کروں تو مجھ پر خدا کا قہر نازل ہو۔"

گمبا نے بچّے کی آنکھوں میں شبہات پڑھتے ہوئے زوردار لہجے میں کہا اور گھڑی کو چاندی کی زنجیر سے پکڑ کر بچّے کے بالکل قریب کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی پیشانی چھونے لگی۔ بچّے کا چہرہ زرد پڑ گیا اسے گمبا کی قسم پر یقین آ گیا تھا اور اب اس کے مختلف جذبات کے درمیان زبردست کشمکش شروع ہو گئی تھی اس ذہنی کشمکش کو بھانپ کر گمبا نے چاندی کی چمکتی ہوئی گھڑی کو نیچے کر کے بچّے کی آنکھوں کے سامنے کئی مرتبہ نچایا۔ آخر کار بچّے کا سیدھا ہاتھ اٹھا اور اس کی انگلیوں نے گھڑی کو چھو کر دیکھا۔ گمبا نے گھڑی کی زنجیر تھامے رکھی۔ چمکدار خوبصورت گھڑی بچّے کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ ترغیب کی قوت بچّے کی قوت برداشت سے کہیں زیادہ تھی۔ آخر کار بچّے کا دوسرا ہاتھ اٹھا

اور اس نے ہاتھ کاندھے کے اوپر اٹھا کر انگوٹھے سے گھاس کے ڈھیر
کی جانب اشارہ کیا۔ گمبا فوراً ہی اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ اس نے
فوراً ہی گھڑی کی چین کو چھوڑ دیا اور وہ خوبصورت گھڑی بچے کے ہاتھ
میں آ گئی۔ وہ لپک کر گھاس کے ڈھیر کی طرف بڑھا اور اس سے دس
فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پانچ ساتھیوں نے فوراً ہی اس
ڈھیر کے اِرد گرد اپنی پوزیشن سنبھال لی۔

ایک دم گھاس کے ڈھیر میں جنبش ہوئی اور ڈھیر میں سے ایک
غصّے میں تمتمایا ہوا چہرہ باہر نکلا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے
تھے۔ اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی
زخمی ٹانگ اکڑ چکی تھی اس لیے وہ فوراً گر گیا۔ گمبا نے آگے بڑھ کر فوراً
ہی اسے سنبھال لیا۔ خطرناک زخمی قیدی کو فوراً ہی دو فوجیوں نے اپنی
گرفت میں جکڑ لیا۔

زخمی قیدی نے جب بچے کو اپنی جانب آتا ہوا دیکھا تو اس
نے شدید غصّے اور نفرت سے اسے دیکھ کر ایک غلیظ گالی دی۔

بچّے نے زخمی مجرم کا دیا ہوا پانچ فرانک کا سکّہ اس کی جانب
اُچھال دیا جس کا وہ اپنے خیال میں اب مستحق نہیں رہا تھا لیکن مجرم
نے اس کی اِس حرکت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور پھر گمبا سے بڑے پُر
سکون انداز میں کہا۔

”میں چلنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے تمہیں مجھے شہر تک
اپنے کندھے پر لے جانا ہوگا۔“

”خوب ابھی کچھ دیر پہلے تو تم ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے پھر
رہے تھے۔“ گمبا نے دانت پیستے ہوئے کہا ”خیر تم ذرا سا تو۔ تمہیں پکڑ کر
مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں تمہیں خود اپنے کندھے پر ڈال کر لے جاؤں
گا۔ کرسپولی کے فارم پر ہمیں ایک گھوڑا مل جائے گا۔“

”یہ بہت اچھا ہے۔“ زخمی مجرم نے کہا ”گھوڑے کی پیٹھ پر کچھ نرم
گھاس ڈال لینا تاکہ مجھے تکلیف نہ ہو۔“

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ فیلکون اپنی بیوی کے ساتھ واپس
آ گیا۔ جیسے ہی اس کی نظر اپنے مکان کے احاطے میں کھڑے ہوئے باوردی
فوجیوں پر پڑی، وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے
اپنی بیوی کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ فوجیوں کو دیکھ کر اسے سب سے پہلا
خیال یہ آیا کہ وہ فوجی اسے گرفتار کرنے اس کے گھر آئے ہیں۔ لیکن کیوں؟
اس نے کوئی غیر قانونی حرکت تو نہیں کی تھی۔ پھر کیا بات ہے؟

فیلکون نے کاندھے پر لٹکی ہوئی بندوق اُتار کر اپنی بیوی کو دیدی
اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو نشانہ لینے کی پوزیشن میں پکڑ لیا۔
اس کی بیوی نے جلدی سے کارتوسوں کا ڈبا کھولا اور دوسری بندوق
میں کارتوس ڈالنے لگی۔ اب وہ دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے
ایک اچھی بیوی کا یہ فرض ہوتا ہے وہ مقابلے کے دوران اپنے شوہر
کے پہلو میں فالتو بندوق بھر کر کھڑی رہے اور جب اس کا شوہر دشمنوں
سے لڑ رہا ہو تو وہ اسے کارتوس ڈال ڈال کر بندوقیں بدل بدل کر دیتی
رہے۔

گمبا کی چھٹی حِس ایک دم جاگ گئی اور جب اس نے چونک کر
اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کی نظر فیلکون پر پڑی جو بڑے محتاط انداز میں اپنی
بیوی کو اپنی آڑ میں لیے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر
گمبا پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے جو خطرناک مجرم اس نے ابھی
پکڑا ہے وہ فیلکون کا دوست یا رشتے دار ہو۔ اس صورت میں اگر فیلکون
نے مجرم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔ خاص طور پر
اس صورت میں کہ اس کے پاس دو بھری ہوئی بندوقیں ہیں اور اس کی
مدد کے لیے اس کی بیوی اس کے ساتھ ہے۔ اس نے فوراً ہی صورتِ حال
سنبھالنے کے لیے قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی بندوق اپنے ساتھی
کو پکڑائی اور اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتا ہوا فیلکون کی طرف بڑھا۔

”ہیلو فیلکون۔ کیسے ہو میرے دوست۔ یہ میں ہوں تمہارا بھائی گمبا“
گمبا نے چلّا کر کہا۔

فیلکون نے اطمینان کا سانس لے کر بندوق کا دستہ زمین پر ٹکا
دیا اور وہیں کھڑے ہو کر گمبا کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ گمبا نے
قریب آ کر فیلکون سے گرمجوشی سے معانقہ کیا اور اسے خطرناک مجرم کو پکڑنے
کی خبر سنائی۔ پکڑے جانے والے مجرم کا نام سُن کر فیلکون کی بیوی نے چلّا
کر کہا۔

”بہت اچھا ہوا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے ہماری ایک بکری
چُرائی تھی۔“

یہ سُن کر گمبا نے پہلی مرتبہ اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

"وہ غریب بہت بھوکا تھا" فیلکون نے کہا۔

"وہ بڑا جہنمی ہے" گیمانے کہا "اس نے میرے ایک فوجی کو مار دیا اور ایک کے ہاتھ کی ہڈی توڑ دی۔ قسمت والا تھا جو ہمارے ہاتھ سے بچ نکلا۔ ساری رات اس نے ہمیں پریشان کیا اور اب گولی لگنے کے بعد وہ تمہارے گھر میں اس ہوشیاری سے چھپ گیا کہ شیطان بھی اسے نہ ڈھونڈ سکتا تھا۔ اگر فورچوناٹو نے ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہم اسے کبھی بھی نہ پکڑ سکتے۔"

"فورچوناٹو!" فیلکون کی بیوی نے چلا کر کہا۔

"فورچوناٹو؟" فیلکون نے دہرایا۔

"ہاں گیانیٹو تمہارے گھر کے باہر گھاس کے ڈھیر کے اندر چھپ گیا تھا۔ فورچوناٹو نے مجھے اس کے چھپنے کی جگہ بتائی۔ میں اپنی رپورٹ میں فورچوناٹو اور تمہارے نام کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔"

"نحوست!" فیلکون نے زیر لب کہا۔

فیلکون اس کی بیوی اور گمبا اسی طرح باتیں کرتے ہوئے مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ جہاں دو فوجیوں نے گیانیٹو کو اپنی گرفت میں بے بس کر رکھا تھا۔ زخمی مجرم فیلکون کو اپنی طرف متوجہ پا کر ایک عجیب انداز میں مسکرایا اور پھر اس نے سر گھما کر مکان کی دہلیز کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھوک دیا۔

"غدار کا گھر" زخمی مجرم نے بڑی نفرت سے کہا اور پھر فیلکون کی آنکھوں میں دیکھا۔

صرف وہی شخص فیلکون کو غدار کہہ سکتا تھا جو اپنی زندگی سے تنگ آیا ہوا ہو اور فیلکون کے ہاتھوں یقینی موت چاہتا ہو۔

فیلکون کھڑا رہ گیا۔ اس کا جسم بالکل ساکت تھا اس نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر اس طرح پھیرا جیسے اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا ہو۔

اس اثنا میں فورچوناٹو جو گھر کے اندر چلا گیا تھا اپنے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا پیالہ لے کر باہر نکلا اور وہ پیالہ اس نے زخمی مجرم کی طرف بڑھایا۔

"دفع ہو جاؤ" زخمی مجرم نے چیخ کر کہا اور پھر اس نے ایک فوجی کی طرف مڑ کر کہا "دوست! مجھے پینے کے لیے کچھ دو بڑی پیاس لگی ہے۔"

فوجی نے اپنے گلے میں لٹکی ہوئی پانی کی ایک چھوٹی سی بوتل زخمی مجرم کے منہ سے لگا دی جسے اس نے چند لمحوں میں خالی کر دیا۔ پھر اس نے گمبا سے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو گمبا۔ میں تیار ہوں چلتے کیوں نہیں؟"

گمبا نے چلتے وقت فیلکون کو رخصتی سلام کیا جس کا فیلکون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مختصر سا فوجی دستہ اپنے قیدی کو لیے مکان کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ ان کا رخ قصبے کی جانب تھا۔

مکان کے احاطے میں پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ فورچوناٹو اپنے باپ اور ماں کے سامنے خاموش کھڑا بے چینی سے دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ فیلکون بندوق کی نال کا سہارا لیے خاموشی سے اپنے لڑکے پر نظریں جمائے ساکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے غصے کی شدت سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ فوجیوں کے جانے کے دس منٹ بعد فیلکون نے پہلی مرتبہ اپنے لب کھولے۔

"تمہارا آغاز تو بہت اچھا ہے" فیلکون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی بیوی جو پچیس سال سے اس کی رفیق تھی اس لہجے پر کانپ گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"پاپا" بچے نے زور سے کہا۔ اس کی آنکھوں سے ایک دم آنسو پھوٹ نکلے اور وہ اس طرح آگے بڑھا جیسے وہ اپنے باپ کے قدموں میں گر جانا چاہتا ہو۔

"دور رہو مجھ سے" فیلکون نے چلا کر کہا۔

بچے کے قدم رک گئے اور وہ اپنے باپ سے چند فٹ کے فاصلے پر سسکیاں لے کر رونے لگا۔

فورچوناٹو کی ماں کی نظر اس کی جیب پر پڑی جس میں سے گھڑی کی چین باہر لٹک رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر فورچوناٹو کی جیب سے گھڑی باہر نکال لی۔

"یہ گھڑی کس نے دی ہے تمہیں؟" ماں نے اپنے بچے سے سخت لہجے میں پوچھا۔

"گمبا نے" بچے نے سسکیوں کے درمیان جواب دیا۔

فیلکون نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی اپنی بیوی کے ہاتھ سے لے لی اور پوری قوت سے مکان کی دہلیز پر دے ماری۔ گھڑی لاتعداد ٹکڑوں میں چکنا چور ہو گئی۔

"گیوسیپا!" فیلکون نے اپنی بیوی سے کہا "کیا یہ میری اولاد ہے؟"

فیلکون کی بیوی ایک دم بپھر گئی۔ غصے سے اس کے رخسار تمتمانے

لگے۔

"تم کیا کہہ رہے ہو فیلکون؟ تمہیں معلوم نہیں تم کس سے بات کر رہے ہو؟"

"وہ بہت خوب لیکن یہ بچّہ اپنی نسل کا پہلا غدّار ہے۔"

باپ کو اپنی جانب بدستور گھورتے ہوئے دیکھ کر بچّے کی سسکیوں کی آواز پہلے سے بلند ہو گئی۔ آخر کار فیلکون نے اپنی بندوق کا دستہ زمین پر مارا اور بندوق کاندھے پر لٹکا کر فورچوناٹو کو اپنے پیچھے آنے کا حکم دے کر وہ اپنے مکان کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ اس کا رُخ گھنے جنگل کی طرف تھا۔

بچّے کی ماں جو چند لمحے پہلے بپھری ہوئی شیرنی نظر آ رہی تھی کانپتی ہوئی اپنے شوہر کے پیچھے دوڑی اور اس کی آستین پکڑ لی۔

"وہ تمہارا بچّہ ہے!" اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں پوشیدہ خیالات پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے لہرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چھوڑ دو مجھے" فیلکون نے پُرسکون لہجے میں کہا "میں اس کا باپ ہوں۔"

ماں نے اپنے بچّے کو سینے سے چمٹا کر خوب زور سے بھینچ کر اسے پیار کیا اور اپنے آنسوؤں کو چھپاتی ہوئی وہ بھاری بھاری قدموں سے مکان میں داخل ہو کر مقدّس مریم کے مجسمے کے سامنے دوزانو ہو کر اپنا بھیگا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر دعا مانگنے لگی۔

مکان سے دو سو قدم دور جا کر فیلکون نے اپنی بندوق کو کاندھے پر سے اُتار کر اس کے دستے کو زمین پر مارا۔ پھر اس نے بچّے سے جو اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ بلند آواز سے کہا۔

"فورچوناٹو۔ اس چٹان کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

بچّے نے بڑی تابعداری سے حکم کی تعمیل کی اور ریت میں اُبھری ہوئی چھوٹی سی چٹان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"زمین پر گھٹنے ٹیک دو۔" فیلکون نے زور سے کہا۔

بچّے نے حکم کی تعمیل کی۔

"دعا مانگو۔"

"پاپا۔ پاپا۔" بچّے نے گڑگڑا کر کہا "مجھے مت مارو۔ مجھے مت مارو۔"

"دعا مانگو فورچوناٹو" باپ نے چلّا کر کہا۔

بچّے نے لرزتے ہوئے ہاتھوں اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے سے دعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ سسکیوں کے درمیان ہر دعا کے خاتمے پر باپ زور سے آمین کہتا رہا۔ بچّہ ایک طویل دعا مانگ کر خاموش ہو گیا۔

"تم نے دعائیں مانگ لیں؟"

"اوہ پاپا پاپا" بچّے نے آنسو بھری آنکھوں سے باپ کو دیکھا "پاپا مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ پر رحم کیجئے پاپا۔ میں پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا پاپا۔ میں انکل کے قدموں میں گر کر گیانٹو کا جرم معاف کرا لوں گا پاپا۔ گمپا گیانٹو کو چھوڑ دے گا پاپا۔ مجھ پر رحم کیجئے۔ مجھ پر رحم کیجئے پاپا۔ مجھ پر" بچّہ گڑگڑا کر اپنے باپ سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ فیلکون نے آنکھیں بند کر کے بندوق کی نال کا رُخ اپنے بچّے کی طرف کر دیا۔

"خدا تمہیں معاف کرے میرے بچّے" فیلکون نے کہا اور آنکھیں کھول کر ایک نظر اپنے بچّے کو دیکھا۔ بندوق کی نال کا رُخ بچّے کے سینے پر ٹھیک دل کی جانب ہو گیا۔ فیلکون کا جسم ایک دم اکڑ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بچّے نے آخری کوشش کرتے ہوئے اُچھل کر اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور اپنے باپ کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔ بندوق کی نال سے ایک شعلہ سا لپکا اور فورچوناٹو مردہ ہو کر ریت پر گر گیا۔

فیلکون اپنے بچّے کی لاش پر نظر ڈالے بغیر گھر کی طرف مڑ گیا۔ بندوق چلنے کی آواز سُن کر بچّے کی ماں بے تحاشا دوڑتی ہوئی گھر سے نکلی اور پھر اس نے فیلکون کو تنہا سر جھکائے تھکے تھکے قدموں سے آہستہ آہستہ گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اس نے دوڑ کر فیلکون کے دونوں کاندھے پکڑ لیے اور اسے پوری قوت سے جھنجھوڑ کر پوچھا "کیا کیا تم نے فیلکون؟"

"انصاف" فیلکون نے سر اٹھا کر مدھم لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بڑی خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ پھر اس نے اپنا منہ اپنی بیوی کے سینے میں چھپا لیا۔ اس کا جسم ہچکیوں کی شدّت سے خزاں رسیدہ پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔

گیوسیپا کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چھاتیوں میں منہ چھپائے ہوئے پچاس سالہ مرد ایک ننھا کمزور سا بے سہارا بچّہ ہو۔ ☆


شام کے اندر
مسعود مفتی کی کہانی!

ٹرین ایک بھاری گھسیٹ سے رُک گئی۔

اسلم نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور ہینڈ بیگ ہاتھ میں لے کر اُترنے لگا۔ نیلے کپڑوں والے ایک آدمی نے لپک کر فرشی سلام کیا۔ اُترنے میں اسٹیشن ماسٹر کا پاؤں ذرا لڑکھڑایا تو وہ فوراً دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

"بسم اللہ۔ یا اللہ فضل۔" پھر اس نے جھپٹ کر اسلم کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور پاس کھڑا خوشامد سے مسکرانے لگا۔

دوسری طرف سے عملے کے لوگ آ رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ، کچھ مسکراتے ہوئے۔

"آیئے جی آیئے" وہ ہاتھ پھیلاتے دو قدم ان کی طرف بڑھا اور پھر واپس اسلم کی طرف بھاگا۔

"یہ ہیں حضور شاہ جی۔ ہمارے ٹکٹ بابو۔ اللہ خوش رکھے بڑے نیک آدمی ہیں۔"

اسلم نے ہاتھ ملایا۔

"اور یہ ہے جی بشیر اسنگل مین اور پھاٹک مین۔ ایسے سیدھا ہو کے چل رے بشیرے سنتے صاحب سے مل رہا ہے اور چلا بھی نہیں جاتا۔"

اسلم نے حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"اور حضور یہ باقی سب بھی آپ کی رعیت ہیں۔ یہ پانی بھرنے والا۔ یہ جھنڈی والا۔ یہ بھنگی۔ یہ میٹ۔"

"اور تم کون ہو؟" اسلم پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں جوناب کا خادم کانٹے والا ہوں۔ اللہ دتا نام ہے گاڑیاں نسنٹ بھی کرتا ہوں۔ اس اسٹیشن پر سب سے پرانا آدمی ہوں جوناب پندرہ برس ہوگئے ہیں یہاں مجھے۔ جو صاحب بھی آتے ہیں ان کا تابعدار ہوں۔ ایسے دیکھتے کیا کھڑے ہو۔" اس نے اسلم کی رعیت کو ڈانٹا "نکالو اندر سے سامان۔"

اور وہ سب چونک سے اندر کو بھاگے۔

اسلم اس کی چرب زبانی پر حیران ہوتا دفتر کی طرف چلا۔ وہ یہاں بطور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تبدیل ہو کر آیا تھا۔ جب اس نے جگہ کا جائزہ لیا تو کافی مایوس ہوا۔ چھوٹا سا اسٹیشن معمولی سا پلیٹ فارم اس پر دو کمرے ایک اسٹیشن ماسٹر کا اور دوسرا ٹکٹ بابو کا۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں سوئچ بورڈ اور تار کا سامان بھی تھا اور بابو کے کمرے میں ٹکٹوں کی شیلف کے علاوہ متفرق رجسٹر بھی رکھے تھے پلیٹ فارم ویٹنگ روم وغیرہ کی سجاوٹ سے پاک تھا اور اس کی بجائے پیپل کا ایک بڑا درخت تھا جس کے نیچے پرندوں کی بیٹ بھرے ہوئے چند بنچ رکھے تھے ساتھ پانی کا نل تھا جس کے پاس ہی کھمبے کے اوپر شیشے کے چوکور ڈبے میں ٹوٹی ہوئی چمنی والا لیمپ تھا۔ اس کے اوپر ایک تیر لگا تھا جس پر قبلہ لکھا تھا۔ سارے اسٹیشن کی یہی کل کائنات تھی گاڑی کے گزرنے کی ایک لائن پلیٹ فارم کے ساتھ تھی اور دوسری ویسے ہی ساتھ بچھائی تھی جو گاڑیوں کے کراس کے وقت استعمال ہوتی تھی یا شنٹنگ کے کام آتی تھی۔

اسلم تھوڑی دیر دفتر میں بیٹھا جائزہ لیتا رہا۔ کام کچھ زیادہ نہ تھا سارے دن میں دو گاڑیاں آتی تھیں، ایک شام اور ایک صبح۔ شام والی گاڑی کے ساتھ دوسری گاڑی کا کراس بھی ہوتا تھا۔ دونوں گاڑیاں مخلوط تھیں، یعنی بنیادی طور پر تو مال گاڑیاں تھیں مگر ان کے ساتھ چار پانچ ڈبے مسافروں کے بھی لگ جاتے تھے اسٹیشن چھوٹا سا تھا۔ قریب منڈی بھی کوئی نہ تھی اس لیے وہاں سے زیادہ سامان لادا نہیں جاتا تھا خیال یہی تھا کہ صبح اور شام کے کام کے علاوہ باقی دن فارغ گزرے گا۔

اتنے میں اللہ دتا اندر آ گیا۔ بڑی پلیٹ میں کچھ مالٹے اور سنگترے لا کر بڑی خاطر سے اس نے اسلم کے سامنے رکھے اور خود پاس کھڑا ہو کر مکھیاں اڑانے لگا۔

"ارے اللہ دتا یہ کیوں لے آئے ہو؟"

"جوناب تھوڑی دیر تک تو ہمارے مہمان ہیں اس کے بعد آپ افسر اور ہم ماتحت، آپ ہماری کوئی چیز کھائیں گے تو ہم بھی دنیا میں سر اٹھا کر چل سکیں گے۔"

اسلم مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور سنگترا اٹھا کر کھانے لگا اس نے پہلی دفعہ غور سے اللہ دتا کو دیکھا۔ وہ ڈھیلے جسم کا ٹھنگنا سا آدمی تھا۔ عمر کوئی چالیس سال۔ سر کے بال کافی گھنے، چھوٹا سا ماتھا جس کے نیچے قدرے دھنسی ہوئی سپید چمکدار آنکھیں۔ چوڑے ہونٹوں پر خوشامدانہ مسکراہٹ بڑی تیزی سے نمودار ہوجاتی اور پھر غائب ہوجاتی۔ کندھوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی گردن اور نیچے چوڑا سا جسم۔ اسلم سنگترے کھا رہا تھا اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر حالات بتا رہا تھا کہ یہاں فلاں سال میں فلاں اسٹیشن ماسٹر تھا۔ اس کے بعد فلاں آیا کس کے وقت گاڑی کا حادثہ ہوا کس زمانے میں ریلوے وزیر کا دورہ ادھر سے ہوا وغیرہ۔

اسلم کھا چکا تو اللہ دتا کہنے لگا "حضور ذرا کوٹھڑی بھی ملاحظہ کرلیں۔"

کوٹھی کے لفظ پر اسلم مسکرایا مگر اٹھ کر اس کے ہمراہ کوارٹر دیکھنے چلا گیا۔

وہ دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلی جگہ اس کے پاس بہتر کوارٹر تھا۔ مگر اتنے چھوٹے اسٹیشن پر یہ بھی کیا سکتا ہے۔" اس نے سوچا اور نظر دوڑانے لگا۔ دو کمرے سامنے چھوٹا سا برآمدہ۔ تنگ سا آنگن جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ سارے مکان پر انجن کے دھوئیں کا گہرا رنگ تھا۔ اسلم کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا اور دوسری طرف ایک بند کھڑکی تھی۔

"اچھا تو یہ باہر کھلتی ہے" اور وہ کھولنے لگا۔

"نہیں جوناب" اللہ دتا بولا۔ "یہ باہر نہیں کھلتی، ساتھ میرا کوارٹر ہے یہ اسی میں کھلتی ہے اس کی چٹخنی بھی اُدھر ہی ہے اس طرف سے نہیں کھل سکتی میں ہمیشہ سے صاحبوں کے ساتھ رہا ہوں تاکہ ہر طرح سے خدمت کر سکوں"

اسلم متعجب ہوا کہ کانٹے والے اور اسٹیشن ماسٹر کے مکان کو ملایا کیوں گیا ہے اور وہ بھی ایسے کہ کھڑکی کانٹے والے کے مکان میں سے کھل جاتی ہے۔

"جوناب! کوئی پندرہ سال پہلے حاجی علی احمد صاحب اسٹیشن ماسٹر آئے تھے۔ ان کی عیالداری بہت تھی اس لیے میں اپنا کوارٹر چھوڑ کر شہر چلا گیا تھا اور انہوں نے بیچ میں کھڑکی بنوائی تھی۔"

اسلم کے دل میں پہلے خیال آیا تھا کہ اس کو مینخ لگا کر بند کر دے مگر اب اس نے سوچا کہ یہ اچھی تجویز ہے۔ جب وہ بیوی بچوں کو لے آئے گا تو ممکن ہے اسے بھی ساتھ والے کوارٹر کی ضرورت پڑے۔ اسلم کچھ دیر کوارٹر دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیوں بے اللہ دتا! یہاں کوئی قلی وغیرہ کھانا بنانا بھی جانتا ہے؟"

"نہیں حضور ایسا تو کوئی آدمی نہیں، مگر اللہ نے چاہا تو کوئی تکلیف نہ ہو گی میری بیوی دونوں ٹیم آکر کھانا بنا دیا کرے گی۔ آپ کی خدمت بھی کرے گی۔ اور بیگم صاحبہ کی بھی، ہم تو پرانے خدمت گار ہیں حضور"

وہ تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر اللہ دتا نے لپا جھپ بستر لگا دیا اور خود چلا گیا۔ اسلم کچھ دیر بیٹھا رہا۔ گھر کی فضا غیر مانوس تھی خالی خالی کمروں میں سامان کے بنڈل بے ترتیبی سے پڑے تھے جیسے گھر نہ ہو کوئی مسافر خانہ ہو۔ وہ سگرٹ جلا کر چت لیٹا ہوا کبھی چھت کی کڑیوں پر جالے یا گانٹھ کے نشان دیکھنے لگتا اور کبھی ٹیوالی کر اکھڑے ہوئے پلستر پر نظریں گاڑے بیوی بچوں کے متعلق سوچنے لگتا۔

شام کو اسلم شہر کی سیر کے لیے نکلا عام رواج کے برعکس یہاں کا ریلوے اسٹیشن بالکل گاؤں کا حصہ تھا اور اسٹیشن ماسٹر اور عملے کے کوارٹروں کے ساتھ ہی گاؤں کی گلیاں آملتی تھیں، وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں مڑتا گیا زیادہ تر کچے مکانات تھے جن میں سے کسی کی ایک آدھ پکی دیوار بھی تھی کچی گلیاں ان کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی آزادمش نالیاں جن کی چوڑائی حیرت انگیز طور پر گھٹتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ کہیں متروکہ جائداد کا کارہ ملبہ، کہیں دیواروں پر اُپلے چپکے ہوئے، کہیں کوڑے کا ڈھیر یا پانی کا جوہڑ اور اس کے گرد ننگ دھڑنگ بچے کھیلتے ہوئے، کسی چھوٹی سی کوٹھڑی میں مونگ پھلی اور مرمنی کی دکان جس کی اہمیت ساتھ لٹکے ہوئے بیٹر بکس سے بڑھ گئی تھی۔ ایک گلی سے نکلا تو آگے بازار تھا جس میں پندرہ بیس دکانیں تھیں، نیلی کیتلیوں اور میلی پیالیوں والی چائے کی دکان، بزنے کھلی اور رمال چنے کی دکان، سبزی کی دکان جہاں پکوڑے بھی بنتے تھے، لوہار کی دکان، موچی کی دکان، حکیم صاحب کی دکان جہاں کاپیاں، پنسلیں اور جنتری بھی ملتی تھی، ٹاٹ کے پردے کے نیچے ایک حجام بھی تھا اور اسی طرح کی چند اور دکانیں۔

اسٹیشن ماسٹر نیلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مزے سے چل رہا تھا کہ پھل کی ایک کافی بڑی دکان نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ حیران ہوا کہ اتنے چھوٹے بازار میں پھل کی اتنی بڑی دکان کیسے آگئی ایک دم پھل والا ہڑبڑا کر اُٹھا۔

"سلام جوناب!"

اسلم بڑا حیران ہوا۔ "ابے تو! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"حضور یہ بھی پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے تنخواہ کی آمدنی سے تو گزارا نہیں چلتا۔ ساتھ یہاں کام بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"اور اسٹیشن کی ڈیوٹی کا کیا کرتا ہے؟"

"جی ہے حضور میری شوکت مالکی کے ساتھ، جب میں نہیں ہوتا وہ بیٹھتا ہے ——— دونوں جوناب کے نوکر ہیں۔ مالکوں کی مہربانی سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

"ہوں!" اسلم نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

"حضور دکان پر آتے ہیں۔ کچھ پھل تو چکھتے جائیں۔"

پھل کھانے کے بجائے اسلم دتو کی آنکھوں میں لہراتی ہوئی چمک دیکھنے لگا

"نہیں میاں! مجھے نماز کو دیر ہو رہی ہے۔" کہتا ہوا اسٹیشن ماسٹر آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن صبح کی گاڑی چلوا کر اسلم فارغ ہوا تو ملاقاتی آنے شروع ہو گئے۔ چھوٹے شہر میں سرکاری ملازم کی کافی عزت ہوتی ہے کچھ غرض مند اور کچھ علاقے میں اونچی ناک رکھنے والے لوگ ضرور ان سے راہ و رسم رکھتے ہیں۔ اسلم بھی اس رواج کو جانتا تھا اس لئے جو بھی آیا اس سے خندہ پیشانی سے ملتا رہا۔ دو نمبردار ملنے آئے ملک چوہدری اور ہر قسم کے لوگ باری باری آئے اسکول ماسٹر، سرپنچ اور امام مسجد ملنے آئے، یونین کونسل کے ممبر بھی دو چار آدمیوں کی جلو میں آئے، خاندانی حکیم صاحب بھی چھڑی سمیت آئے جب بھی کوئی ملاقاتی آتا۔ دتو پہلے اطلاع دینے آتا اور دو چار جملوں میں اس کا تعارف کرا دیتا۔ پھر اسلم ان سے ملتا۔ پچھلی ملازمت کا ذکر ہوتا۔ آئندہ قیام کے لئے اچھی امیدوں کا اظہار کیا جاتا اور پھر "ہر خدمت" کا وعدہ کر کے لوگ چل دیتے۔

سب سے آخر میں دتو ایک چٹ لایا جس پر لکھا تھا ملک رحمت علی زمیندار۔

"کون ہے یہ؟" اسلم نے پوچھا تو دتو تعریفی انداز میں بولا۔

"یہاں کا مشہور کاروباری ہے جناب اور افسروں کا بڑا خدمتگار ہے، سارے اسٹیشن ماسٹر اس پر بڑی مہربانی کرتے رہے ہیں، یہ بھی ان کی تابعداری کرتا ہے بہت اچھا آدمی ہے جناب۔"

"بلا لاؤ۔"

چالیس پچاس برس کا بھاری بھرکم آدمی اندر داخل ہوا۔ دو فٹ کا طرہ، سیر بھر کی مونچھیں، صاف ستھری اچکن، لٹھے کی سفید دھلی ہوئی دھوتی۔ نیچے سے زری والی جوتی کی پیچدار نوکیں جھانکتی ہوئیں اور ہاتھ میں ٹوپے والی چاندی کی چھڑی، وہ اسلم سے بڑے آداب سے ملا۔ باتیں شروع ہوئیں تو اسلم کو معلوم ہوا کہ وہ علاقے کا زمیندار ہے سوڈا کمپنی کا ایجنٹ بھی ہے شہر کی سگرٹ اور کھاد کی ایجنسی بھی اسی کے پاس ہے، ڈپو بھی اسی کا ہے اور چند ایک چھوٹے موٹے کاروبار اور بھی کرتا ہے۔

"آپ نئی جگہ آئے ہیں بچوں کے آنے پر ایک بھینس بھجوا دوں، جب خشک ہو جائے گی دوسری بھجوا دوں گا۔"

مگر اسلم نے انکار کر دیا۔

وہ جانے لگا تو دتو نے بڑے ادب سے اس کی لاٹھی اٹھا کر اسے دی۔ پھر دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا ساتھ ہی باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسلم نے ویسے ہی دروازے میں سے جھانکا تو ملک صاحب اور دتو بڑے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

دو تین روز بعد شام کی گاڑی ذرا لیٹ تھی۔ کراس والی گاڑی کھڑی رہی اور اسلم مصروف رہا اس لئے تمام کو بہت دیر سے فارغ ہونے کے بعد گھر لوٹا۔ باورچی خانے میں دتو کی بیوی اللہ وسائی کھانا پکا کر گھر جا چکی تھی۔ وہ روزانہ آکر کھانا بناتی تھی۔ دتو کے ساتھ مل کر کھلاتی تھی اور پھر باورچی خانے کا کچھ کام کرنے کے بعد چلی جاتی تھی۔ اسلم کا خیال تھا کہ مہینہ پورا ہونے پر اسے کچھ تنخواہ دے دے گا۔ اللہ وسائی تیس بتیس سال کی بھرپور عورت تھی جو صورت سے زیادہ اپنے جسم سے دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ شکل بھی بری نہ تھی، رنگ کیسا بھی کیوں نہ ہو گول چہرے کو کون کافر برا کہہ سکتا ہے۔ اسلم نے اسے دو چار مرتبہ ایک آدھ نظر دیکھا اور بس، اس سے زیادہ کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

آج دیر ہونے کی وجہ سے وہ جا چکی تھی اور دتو کھانا کھلانے لگا۔

اتنے میں اللہ وسائی نے بچہ بھیج کر دتو کو اپنے کوارٹر میں بلایا وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک بڑا خوان تھا جو اس نے اسلم کے سامنے رکھ دیا

"یہ کیا لے آئے دتو؟"

"جناب! آج ملک رحمت علی یہ چھوڑ گیا تھا۔"

"کیوں لیا تھا مجھ سے پوچھے بغیر؟" اسلم غصے میں بولا۔

"حضور مجھے تو پتا نہیں اللہ وسائی گھر پر تھی اسی کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اکثر لاتا رہتا ہے حضور۔ افسروں کا تابعدار ہے۔"

"کیوں لاتا رہتا ہے؟"

"آخر حضور افسر بھی تو مہربانی کرتے ہیں اس کا منوں سامان جاتا ہے کئی دفعہ اوپر تلے ہو جاتا ہے تو ہم نے کبھی پوچھا بھی نہیں، اب تھوڑی تابعداری بھی نہ کرے تو کیا بات ہوئی بھلا۔"

اسلم اب ساری بات سمجھ چکا تھا۔

"کان کھول کر سن لو دتو۔ میں رشوت کھانا حرام سمجھتا ہوں اور ملک رحمت علی سے صاف کہہ دو کہ مجھ سے کسی مہربانی کی توقع نہ رکھے نہ ہی مجھے اس کی خدمت کی ضرورت ہے۔"

دتو ایک دم حیران سا ہو کر اسلم کو دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی بہت

بابر کی جنگی تقریر

۱۵۲۷ء میں مشہور راجپوت سردار رانا سانگا اور ظہیرالدین بابر کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ کے موقع پر ہندوؤں کی بہت بڑی قوت مجتمع ہوگئی تھی۔ مسلمان سخت سراسیمہ تھے۔ ایسے نازک وقت میں بابر کی مختصر، لیکن پُر جوش تقریر نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور مسلمان کامیاب ہوئے۔ تقریر کا اقتباس درج ذیل ہے :۔

"اے امیرو اور فوجی سردارو! جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے۔ ایک دن فرد قبر کا پیٹ بھرے گا جو دُنیا میں آیا ضرور دُنیا سے جائے گا۔ بدنام ہو کر جینے سے نیک نام ہو کر مرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ سعادت عطا فرمائی اور بڑی نعمت بخشی کہ اس جنگ میں جو مرا وہ شہید ہوا اور جس نے مارا وہ غازی کہلائے گا۔ سب حلف اُٹھاؤ کہ کوئی موت سے نہیں بھاگے گا اور جب تک زندہ ہے لڑائی سے مُنہ نہیں پھیرے گا۔"

بابر کی تقریر اس قدر پُرجوش اور ولولہ انگیز تھی کہ سب مجاہدین نے قرآن ہاتھ میں لے کر حلف اُٹھایا کہ جب تک زندہ ہیں لڑائی سے مُنہ نہیں پھیریں گے چنانچہ مسلمانوں کو [illegible] فتح [illegible] نصیب ہوئی ۔

ہی عجیب چیز ہے۔

"حضور یہ کون سی رشوت ہے۔ سبھی اسٹیشن ماسٹر یہ کرتے آئے ہیں۔ بڑے بڑے داڑھیوں والے بھی جو پنج وقتی نمازی تھے۔"

"چلو بک بک کرو میرے داڑھی نہیں ہے اور میں رشوت بھی نہیں لیتا۔ یہ مٹھائی اٹھا کر لے جاؤ اور لے واپس کردو۔"

وہ غصے سے مڑکر اندر چلا گیا۔ اللہ دتا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑگئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھال اُٹھا کر گھر کو چل دیا۔

چند روز تک اسلم کام کا جائزہ لیتا رہا تو اسے معلوم ہوا کہ چھوٹی موٹی بے قاعدگیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مٹی کے تیل، فینائل، کوئلے وغیرہ کی کا غذوں میں بہت کھپت تھی۔ گو اصل استعمال بہت کم نظر آتا تھا۔ اس نے وقتاً فوقتاً پڑتال شروع کردی اور ملازموں کو ٹوکنے لگا۔ اللہ دتا اب کچھ دب سا گیا تھا۔ اس کی چرب زبانی بھی نسبتہً کم تھی۔ دوسرے قلیوں اور ملازموں پر بھی رعب قدرے کم ڈالتا تھا۔ اس کی شخصیت میں جو انگارے سے دہکتے تھے ان پر ہلکی سی راکھ کی تہہ چڑھ گئی تھی۔

ایک دن اسلم اچھے موڈ میں تھا اتنے میں کہیں سے اللہ دتا نمودار ہوگیا

"ابے دتو پانی تو پلا بھاگ کے۔"

دتو جھٹ سے گلاس لے کر بھاگا لیکن تھوڑی دیر بعد ناکام واپس لوٹا۔ مٹکے سب خالی تھے اور پانی کا نل خراب تھا۔ اس کی مرمت ہو رہی تھی۔

"ابے ستیاناسی! مجھے تو بڑی پیاس لگی ہے۔ اچھا! جا بھاگ کر انجن والے سے پانی لے آ۔ گاڑی بھی قسمت سے کھڑی ہے۔"

دتو حیران رہ گیا۔ "جناب وہ تو گرم ہوگا۔"

"تو کیا ہوا ابھی رکھ دیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"لیکن جناب اگر اجازت ہو تو پھلوں کے کسی ٹوکرے میں سے سنگترے نکال لوں گاڑی جو کھڑی ہے۔"

"ایں ؟" اسلم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "حرامزادے! مجھے چوری کا مال کھلاتا ہے۔ خبردار جو ایسی بات پھر کی۔ بھاگ یہاں سے اور جا کر انجن سے پانی لا۔"

دتو ایک دم غائب ہوگیا۔

چند دن گزر گئے۔ اسلم نئی جگہ جم چکا تھا۔ مقامی لوگوں سے کچھ راہ و رسم ہوگئی تھی۔ اپنے ملازموں کے کام کا بھی اندازہ ہو چلا تھا۔ نئی جگہ کی اجنبیت بھی ختم ہوگئی تھی اور اب وہ بیوی بچوں کے بغیر کچھ اداسی محسوس کرتا تھا۔ دفتر میں فارغ بیٹھے ہوئے یا رات کو اندھیرے کمرے میں چت لیٹے ہوئے وہ اکثر حساب لگاتا رہتا کہ اس کی لڑکی کے امتحان میں ابھی کتنے دن باقی ہیں وہ ختم ہو تو فوراً بیوی کو گھر لے آئے تاکہ گھر میں رونق ہو اور اللہ وسائی کی تنخواہ کا بوجھ بھی ہلکا ہو۔

ایک شام پہلی گاڑی آچکی تھی لیکن کراس کرنے والی کچھ لیٹ ہوگئی تھی۔ ڈرائیور اور گارڈ سے وہ کاغذات لے چکا تھا اور دونوں سے باہر کی خبروں پر تبصرہ کرکے اب قریباً سب موضوع ختم کر چکا تھا۔ گاڑی کے آنے کے بعد کی ابتدائی گہما گہمی ختم ہو چکی تھی اور اب بیشتر لوگ یا تو کسی جگہ بیٹھے

تھے یا کھڑکیوں کے قریب ٹہل رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ سفر کرنے والے زنانہ ڈبوں کی کھڑکیوں سے لگے گاڑی چلنے کی دعا کر رہے تھے۔ اکا دکا فقیر اِدھر اُدھر گھوم کر ایک ایک مسافر سے کئی کئی بار ناگواری کا انکار سن چکے تھے۔ کئی کئی پھیرے لگانے کے بعد خوانچے والوں کی پھرتی مدھم پڑ گئی تھی اور قلی اپنے پیسے گننے میں مصروف تھے۔ اسلم نے ٹیلیفون پر جا کر پچھلے اسٹیشن سے بات کی تو پتا چلا کہ ابھی گاڑی کے آنے میں کافی دیر ہے اور وہ پلیٹ فارم پر گھومتا ہوا گاڑی کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ وہاں اسے شک سا ہوا کہ لائن کا کانٹا ٹھیک نہیں بدلا گیا لیکن آگے جا کر دیکھا تو وہ ٹھیک تھا اور وہ واپس مڑا۔

پلیٹ فارم سے ملحق لائن پر گاڑی کھڑی تھی۔ کراس کرنے والی گاڑی دوسری لائن پر آنے والی تھی۔ وہ دوسری گاڑی دیکھنے کے لئے اس پٹڑی پر ہو لیا اور لکڑی کے سلیپروں پر اُچک اُچک کر چلتا ہوا افق میں دھواں ڈھونڈنے لگا۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ واپس آ رہا تھا۔

ایک دم اسلم ٹھٹکا۔ گاڑی کے دوسری طرف ایک ڈبے کے پاس پہیوں کے پیچھے سے دلّو پھل کا ایک ٹوکرا شوکت ماشکی کو دے رہا تھا۔ شوکا اسے پکڑ کر تیزی سے شہر کی طرف بھاگا۔ اسلم نے آواز دی مگر اسی وقت انجن بھاپ چھوڑنے لگا اور اس کی آواز شور میں دب گئی۔ پورا سراغ لگانے کے لئے اسلم فاصلے سے کر شوکے ماشکی کے پیچھے چلنے لگا۔ تھوڑا تعاقب کرنے پر اس کے خدشات درست نکلے۔ شوکا ماشکی بازار میں دلّو کی دکان پر پھل لے گیا تھا۔ اتنے میں گاڑی کی وِسل سنائی دی اور اسلم واپس بھاگا۔

اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی رک چکی تھی۔ اس نے بھاگم بھاگ کارروائی پوری کی۔ دونوں گاڑیوں کو چلوایا۔ اگلے اسٹیشنوں پر روانگی کی اطلاع دی اور پھر اطمینان سے دلّو کی تلاش کی مگر وہ اور شوکت ماشکی دونوں غائب تھے۔ شام کے کھانے پر اسلم دلّو پر برس پڑا۔ "الّو کے پٹھے! بدمعاش! حرامی! گاڑی میں سے پھل چراتے شرم نہیں آتی۔ حرکتیں تم کرتے ہو اور نام میرا بدنام ہو گا۔"

مگر دلّو صاف مکر گیا۔ "کیسا پھل حضور؟ کون سی گاڑی؟"

"شوکا سور کدھر ہے؟" اسلم دہاڑا۔

"وہ تو جناب ماتم ہو گیا ہے اُدھر گیا ہے۔" دلّو سکون سے بولا

"کہاں ماتم ہوا ہے؟ بلاؤ اسے۔"

"وہ تو صاحب ڈھوک پر گیا ہے، یہاں سے چار کوس دور۔"

اسلم نے طیش میں آ کر برتن پھینک دیئے۔ دلّو کو اپنی زبان میں ہر گالی دے ڈالی اور صبح سویرے پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ سنا کر اسے باہر نکال دیا۔ پولیس کا نام سن کر دلّو تو گھبرایا۔ کان لپیٹ کر چل دیا۔

رات اسلم چارپائی پر بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ دلّو کے خلاف کیا کارروائی کرے کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی نصیحت ہو۔ وہ آج تک جہاں بھی رہا تھا اس نے حسنِ کارکردگی اور دیانتداری میں بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن اگر اب اس کا ماتحت عملہ آزادی سے من مانی کرتا رہا تو خواہ مخواہ وہ بدنام ہو جائے گا۔ اس نے سوچا کہ کل سے اللہ وسائی اور دلّو کا داخلہ گھر میں بند کر دے اور اپنی بیوی کو تار دے کر بلا لے۔ لڑکی اتنے دن اپنے ماموں کے ہاں رہ سکتی ہے اس قسم کے پروگرام بناتا وہ سو گیا۔

دھرتی کے گہرے سینے میں سے کوئی مدھم سی گونج اُبھری۔ جو آہستہ آہستہ قریب آتی گئی۔ اسلم بیدار ہوا تو وہ دروازے کا کھٹکا تھا۔ نیند سے لدی ہوئی آنکھوں میں چھوٹی سی درز ہوئی تو روشنی کی کرنیں گھومتے ہوئے دماغ سے جا ٹکرائیں اور اسلم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں لیمپ کی روشنی تھی۔

اس نے سر اٹھایا تو لیمپ کے پاس اللہ وسائی کا چہرہ نظر آیا.....

دونوں کوارٹروں کی درمیانی کھڑکی کھلی تھی۔ اس میں اللہ وسائی لیمپ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ اسلم کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اُلٹے ہاتھ سے کھڑکی بھیڑ کر آہستہ آہستہ اسلم کی طرف بڑھنے لگی۔

اس کا دوپٹہ غائب تھا۔ گریبان کے بٹن کھلے تھے لیمپ کی روشنی میں جسم کے اُبھار بھرپور تھے، سر کے بال ڈھیلے ڈھالے تھے چمکتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے اللہ وسائی؟" اسلم ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ آگے آئی آہستگی سے میز پر لیمپ رکھا اور سڈول بازو سینے پر رکھ کر مسکرانے لگی۔

مرد کسی ایسے وقوعے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہو اور اسے اچانک سپردگی میں ڈوبی ہوئی عورت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو یہ اس کی زندگی کا ایسا لمحہ ہوتا ہے جس میں اس کی خالص شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے اس کا ردعمل ہر بناوٹ اور پالیسی سے خالی ہوتا ہے اور اس کے سارے ماضی کا نچوڑ اس ایک لمحے میں ٹپک پڑتا ہے۔ ان معاملات میں ناتجربہ کار سیدھا

ایک ظالم حاکم نے کسی موقعے پر ایک مفلوک الحال کو ایک پتھر کھینچ مارا۔ اس غریب میں چونکہ بدلہ لینے کی طاقت نہ تھی اس لیے چپ رہا لیکن وہ پتھر اٹھا کر احتیاط سے گھر لے گیا اور الماری میں محفوظ کر دیا۔

کچھ عرصے بعد اتفاق کی بات کہ حاکم پر حکومت کا عتاب نازل ہوا اور کسی جرم میں گرفتار کر کے اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ یہ خبر اس غریب کے کانوں تک بھی پہنچ گئی جو کبھی اس کے پتھر سے زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے الماری سے وہ پتھر نکالا اور اسے لے کر قید خانے پہنچ گیا۔ قید خانے میں داخل ہوا اور اس امیر سے ملاقات کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غریب نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ جیب سے پتھر نکالا اور پوری قوت سے حاکم کو کھینچ مارا۔ پتھر کی چوٹ سے اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے چیخ کر دریافت کیا: "او بدبخت ظالم! تو نے مجھ بے گناہ کو کیوں زخمی کر دیا؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"

غریب شخص نے جواب دیا: "کیا مجھے اور اپنے اس پتھر کو تو اتنی جلدی بھول گیا۔ تو نے جس طرح اس پتھر کی امانت کو میرے پاس رکھوایا تھا، میں اسے اسی انداز میں تجھے واپس کر رہا ہوں اس میں رونے دھونے یا شکوے شکایت کی کیا بات ہے؟"

سادہ مرد کسی سحر زدہ کی طرح بھاگ نکلتا ہے مگر اس میدان کا شاطر مزے سے ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ اسلم بھی اللہ وسائی کا مطلب سمجھ گیا اور اس کی شخصیت کے سارے اجزا غیر شعوری طور پر اس صورتحال سے نکلنے کے لئے کلبلانے لگے۔

"اس وقت کیوں آئی ہو؟" اسلم نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"میں نے کہا" وہ ہنسی "آپ تھک گئے ہوں گے، ذرا پاؤں دبا آؤں"

اور وہ پائنتی کی طرف بڑھی۔

"نہیں نہیں" اسلم چھلانگ لگا کر چارپائی سے کود اٹھا "مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی تھکاوٹ نہیں۔ تم جاؤ"

وہ کونے میں جا کھڑا ہوا اور ہاتھ سے جانے کا اشارہ کرنے لگا۔

اللہ وسائی نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے، جیسے تپلا بادل رینگتا رینگتا چاند کو ڈھانپ لے — مسکراہٹ غائب ہوئی۔ آنکھیں بجھ سی گئیں۔ جسم ڈھیلا پڑا۔ اور چہرے پر شکست اور مایوسی چھا گئی۔

"بابو جی۔ آپ۔ دتو کو پولیس کے حوالے نہ کریں۔ ہمارا تو کاروبار ہی گاڑی سے چلتا ہے۔ آپ.... رات کو جب چاہیں.... کھڑکی پر تھاپ دیدیں۔ میں آجاؤں گی.... پہلے بھی کئی افسروں کی اسی طرح سیوا کرتی رہی ہوں....."

مرد کا لمحہ گزر چکا تھا اور اب اسلم میں افسر بیدار ہو گیا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ دفع ہو جا۔ فاحشہ کٹنی۔ خبردار جو اب اس گھر میں قدم رکھا۔ کل صبح میں دیکھتا ہوں تم اس کوارٹر میں کیسے رہتے ہو کمینے ذلیل...." اور وہ گالیاں دیتا رہا۔ اللہ وسائی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے، اور وہ ایک دم لیمپ اٹھا کر چلی گئی۔ کھڑکی دھم سے بند ہو گئی۔

گھپ اندھیرے میں اسلم گم سا ہو گیا۔ مٹھائی کے ٹکڑے پر جس طرح چیونٹیاں چہار طرف رینگتی ہیں، اسی طرح اس کے ذہن پر احساسات کے تانے بانے ایک دوسرے کو روندتے ہوئے رینگ رہے تھے۔ تھوڑی پشیمانی کافی حیرت اور خود سے چھپا ہوا اس کے لاشعور میں گڈمڈ تھے مگر بظاہر وہ سخت غصے میں تھا اور اس کی اخلاقی حسیات بری طرح مجروح تھیں کہ اللہ وسائی نے اسے اس قماش کا آدمی کیوں سمجھا۔ ایک دم وہ طیش کھا کر اٹھا اور کھڑکی پر گھونسا مار کر چلایا۔

"سور کے بچے دتو! کل دس بجے تک کوارٹر خالی کر دو ورنہ پولیس کے حوالے کر دوں گا اور نوکری سے نکلوا دوں گا"

اسے یقین تھا کہ دتو وہاں موجود ہے۔

اسلم واپس آ کر چارپائی پر لیٹا مگر اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس کی شریفانہ زندگی اور نیک نامی کی شہرت بار بار آ کر جھنجھوڑتی اس قسم کی کسی حرکت کی وجہ سے بدنامی کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھتا۔ اسلم متوسط طبقے کی مضبوط اخلاقی تنظیم کا پروردہ تھا جس کی زندگی میں شادی سے پہلے جنس کی تسکین کے مواقع اول تو آتے ہی نہیں اور اگر چند ایک امکان کی حد میں آئے بھی تو وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا اس لیے اس کی اخلاقی یکسانیت میں اس تلاطم سے صدمہ پہنچنا قدرتی تھا۔ وہ دیر تک بستر میں پہلو بدلتا رہا

پھر اُٹھ کر ایک گلاس پانی پیا جس سے اعصاب کو کچھ تقویت ہوئی اور وہ پھر آکر لیٹ گیا۔

صبح اسلم ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ باورچی خانے سے برتن کھڑکنے کی مخصوص آواز نہیں آ رہی تھی اور گھر میں خاموشی تھی۔ اسے بستر پر لیٹے لیٹے پتا چل گیا کہ آج اللہ وسائی کام پر نہیں آئی۔ گاڑی کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا اور وہ آرام سے تیار ہونے لگا۔

"پروا نہیں۔" وہ شیو کا برش داڑھی پر زور سے رگڑتے ہوئے بڑبڑایا۔ "چند دن اسٹیشن کی دکانوں سے کام چل جائے گا اور پھر گھر کے سب لوگ آجائیں گے۔"

نہانے کے بعد جسم پر تولیہ رگڑتے ہوئے اس نے سوچا کہ بیوی کو خط لکھ کر جلد از جلد آنے کی تاکید کرے تاکہ یہ سب جھمیلے ختم ہوں۔ کپڑے پہن کر وہ گھر سے ذرا جلدی نکلنے لگا کہ اسٹیشن پر ناشتہ کرے گا مگر دروازے پر ہی ملک رحمت علی مل گیا۔ اپنی چمکیلی چھڑی اُٹھا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے ادب سے سلام کیا۔

"آئیے ملک صاحب" اسلم نے خوش خلقی سے کہا۔ "آپ آج سویرے سویرے کدھر گھوم رہے ہیں؟"

"بس جی۔ ویسے ذرا اسلام کو حاضر ہو گیا تھا۔" ملک رحمت علی نے قدرے محتاط سا جواب دیا۔ دونوں طرف سے مزاج پرسی ہوئی اور اسلم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "میں ذرا اسٹیشن پر جا رہا تھا۔ کوئی کام تو نہیں کیا؟"

"نہیں جناب! کام تو نہیں۔ آپ کا بھی وقت قیمتی ہے لیکن اگر چند لمحے رک جائیں تو جلدی جلدی ایک چھوٹی سی عرض کر لوں۔"

"جی فرمائیے۔"

ملک رحمت علی نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور بات کرتے کرتے جھجک گیا۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟" اسلم اس کی جھجک دیکھ کر بولا۔

"جی نہیں..... خاص تو نہیں..... لیکن ذرا..... اندر چلے چلیں تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

اسلم ناگواری سے اسے اندر لے آیا۔

"جی..... وہ....." اس نے گلا صاف کیا۔ "میں حاضر ہوا تھا کہ دلو کو معافی دے دیں۔ نادان ہے، بے وقوف ہے نوکروں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں، مالک کا تو کام ہی معافی دینا ہے۔"

اسلم نے تیز آنکھوں سے ملک رحمت علی کو گھورا۔ "تو آپ کے پاس گیا تھا؟"

"جی وہ تو سویرے سے میرے گھر بیٹھا رو رہا ہے، مجھے جگایا بھی اسی نے ہے۔ دراصل غریب آدمی ہے۔ عرصے سے پھل کا کاروبار اسی طرح کرتا ہے، اس کو دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے اور گاؤں والوں کو آسانی سے اچھا پھل مل جاتا ہے۔ دونوں کا بھلا ہے۔ یہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ میں نے ہی اسے یہاں نوکر کرایا تھا۔ پندرہ برس سے اسی اسٹیشن پر کام کر رہا ہے کبھی کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی۔ دنیا کے کاروبار تو اسی طرح چلتے ہیں۔"

اسلم نظر جما کر ملک رحمت علی کی بات سنتا رہا جو چھڑی سے فرش کریدتا ہوا ایسے دھیمے دھیمے بات کر رہا تھا جیسے گاڑی سے پھل چرا کر بیچنا کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں۔

"مگر ملک صاحب! میں یہاں کا انچارج ہوں اور جانتے بوجھتے ہوئے پھل چرانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں؟"

"ہا ہا ہا۔" ملک رحمت علی خوشامد سے ہنسا اور لٹو کی طرح چھڑی گھمانے لگا۔ "آپ بہت سادے اور شریف آدمی ہیں مگر....." اسلم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ تھوڑا آگے جھکا۔ "..... آپ جاننے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں؟ اگر وہ اپنا ضمیر گندہ کرتا ہے۔ آپ کی بلا سے۔ آپ کیوں اس کیچڑ میں آتے ہیں۔ آپ نے کون سا ساری عمر یہاں بیٹھے رہنا ہے چھ مہینے سال کی بات ہے۔ پھر کوئی دوسرا افسر آجائے گا۔ آپ یہ چیزیں روک بھی دیں گے تو پھر دوبارہ شروع ہو جائیں گی۔ میں دلو کو سمجھاؤں گا کہ جب تک آپ یہاں ہیں، وہ ذرا احتیاط سے کام لے اور ہاتھ روک کر رکھے۔"

اب اسلم سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ "دیکھیے ملک صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے محکمانہ انتظام میں دخل نہ دیں۔ میں دلو کو کہہ چکا ہوں کہ میں اس کے خلاف افسرانِ بالا کو رپورٹ کروں گا اور اگر ضرورت پڑی تو شاید پولیس کو بھی کیس دینا پڑے۔ ابھی اسٹیشن پر جا کر ذرا انکوائری کر لوں تو کچھ فیصلہ کروں گا۔ بہرحال یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اسے کوارٹر آج ہی خالی کرنا پڑے گا۔ اس معاملے میں میں کسی کی بات نہیں مان سکتا۔"



ملک رحمت علی بڑی توجہ سے اسلم کی بات سنتا رہا مگر اس کی آنکھوں میں ایک تمسخر چھپا ہوا تھا جو مونچھوں کی ہلکی سی حرکت سے بھی عیاں ہوتا ہے۔ اس نے اسلم کے غصے کو اور بڑھا دیا اور وہ باہر کی طرف چلنے لگا مگر ملک رحمت علی اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور اسلم کو رکنا پڑا۔

"جناب مجھے غلط سمجھے" ملک رحمت علی آہستگی سے بولا "میرا مقصد ہرگز آپ کے کام میں دخل دینا نہ تھا۔ میں تو ہمیشہ سے افسروں کا تابعدار اور خدمت گزار رہا ہوں، آپ آیندہ بھی مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ پائیں گے اور ..."

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا... "میں نہیں چاہتا تھا کہ دتّو لوگوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتا رہے ......"

"مجھے کوئی پروا نہیں کہ وہ کیا بکتا ہے" اسلم نے جلدی سے بات کاٹی۔

ملک رحمت علی کی آنکھوں میں تمسخر کا ننھا سا شرارہ کانپا "ابھی تو بات میرے اور اس کے درمیان ہے اور میں نے اسے سختی سے منع کیا ہے کہ کسی سے ذکر نہ کرے لیکن ..... اگر حالات نہ سدھر سکے .... تو ظاہر ہے میں اس کو روک نہیں سکوں گا۔"

"مگر ملک صاحب میں نے آپ سے کب کہا کہ آپ اسے روکیں۔ اسے بکنے دیں جو وہ کہتا ہے" اسلم نے ایک دفعہ پھر اٹھنے کی ہلکی سی کوشش کی۔

"جی نہیں آپ نے تو نہیں کہا مگر ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے ناکہ آپ کی عزت کا خیال رکھیں، میں سچ کہتا ہوں کہ آپ اسے معاف کر دیں تو بات بالکل باہر نہ نکلے گی" اس نے معنی خیز نظروں سے اسلم کو دیکھا۔

"بات کون سی چھپی ہے؟" اسلم بولا "میں ابھی جاکر کھلی انکوائری کروں گا اور سب کو پتا چل جائے گا کہ وہ چور ہے"

"جی نہیں ....." اس نے پھر گلا صاف کیا "میرا مطلب دوسری بات سے ہے، وہ ابھی تک میرے سینے میں ہے اور انشاءاللہ راز رہے گی۔ دتّو کا منہ میں خود بند کر لوں گا۔ میرا کہنا وہ ٹال نہیں سکتا"

اسلم نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تو وہ آنکھیں نیچی کر کے بولا "دتّو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ...... دیکھئے میں تو یقین نہیں کرتا مگر اس کا کہنا ہے ... کہ ... کل سہ پہر کو اس کی بیوی جب باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی ..... تو .... آپ نے ..." (اس نے گلا صاف کیا) یعنی .... کچھ زبردستی کی کوشش کی"

اسلم ایک دم سرخ ہو گیا۔

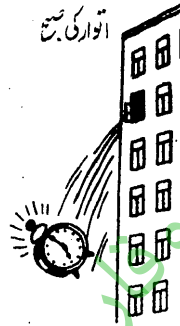
"یہ کیا بکواس ہے ملک صاحب؟"

"جی اب مجھے تو علم نہیں" ملک رحمت علی مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔ "یہ دتّو ہی کہتا تھا"

"مگر یہ بکواس ہے ..... بہتان ہے ..... اس کی بیوی فاحشہ ہے بدمعاش ہے وہ تو ..... وہ تو رات کو خود میرے کمرے میں چلی آئی تھی اور میں نے اسے دفع کیا تھا" اسلم بے چارگی سے چلّایا۔

"ہا ہا ہا" ملک رحمت علی زور سے طنزیہ ہنسا "آج کل تو یوسف







زلیخا کے قصے نہیں ہوتے نا بادشاہ ہوتے"

"مگر آپ نے کیسے یقین کر لیا اس کی بات پر؟" اسلم جز بز ہو کر بولا۔

"وہ جھوٹا ہے۔ کمینہ ہے۔ بدکردار ہے۔" اور وہ غصے میں اٹھ کر کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

ملک رحمت علی آنکھوں میں دھیمی دھیمی مسکراہٹ لئے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چھڑی سنبھالی اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف چلا۔ نکلتے نکلتے تھوڑا سا رکا۔ گردن موڑی اور معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں آپ کا خیر خواہ ہوں جناب۔ میری بات مان لیں۔ آپ یہاں نئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ اس لئے دتو جو کہے گا وہ مانی جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو بات رازر رہ سکتی ہے ——— ورنہ ———"۔

اور وہ باہر نکل گیا۔

اسلم کا خون اس دھمکی پر کھولنے لگا۔ "تم سب ذلیل اور کمینے ہو۔ میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔" ہوا میں دروازے کی طرف گھونسے ہلاتا ہوا وہ پکارا اور میز سے فونٹین پین اٹھا کر جیب میں گھسیڑتا ہوا نکل گیا۔

ابھی اسٹیشن سے کچھ دور ہی تھا کہ گھنٹی بجنے لگی۔ گاڑی کا وقت بالکل قریب تھا۔ دیہاتی لوگ اپنی گٹھریاں سنبھالے پلیٹ فارم کے کنارے کے قریب کھسک آئے تھے۔ دو چار قلی ادھر ادھر بے کار سے گھوم رہے تھے۔ عورتیں صندوقوں پر بیٹھی بچوں کو اپنے پاس روک رہی تھیں۔ ایک دو خوانچے والے ترازو کے پلڑوں میں سودا جمائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دو تین بچے نل سے منہ لگا کر پانی پینے کی کوشش کر رہے تھے جوان کے گریبانوں سے بہتا ہوا پیٹ پر گرتا تر کر رہا تھا۔

اسلم تیزی سے کمرے کی طرف گیا۔ ٹیلیفون پچھلے اسٹیشن سے ملایا تو گاڑی چل چکی تھی۔ اپنی میز سے اٹھ کر اس نے ٹکٹ بابو کے رجسٹر پر سرسری سی نظر ڈالی۔ ٹکٹ بابو ایک دیہاتی کو یقین دلا رہا تھا کہ کرایہ ایک روپے پندرہ آنے ہی ہے مگر دیہاتی کو اصرار تھا کہ وہ ہمیشہ ایک روپیہ بارہ آنے ہی دیتا ہے۔

"او ئے بابا۔" اسلم دہاڑا۔ "ٹکٹ لینا ہے تو لے ورنہ چل ہٹ یہاں سے۔"

بوڑھے دیہاتی نے تین آنے رکھ دیئے جو اس نے پہلے ہی مٹھی میں رکھ چھوڑے تھے اور بڑبڑایا۔ "توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔"

"چل بھاگ۔" اسلم بولا۔ "کھڑکی سے پرے ہٹ کر زمانہ دیکھ۔"

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اور اسلم ادھر متوجہ ہو گیا۔

گاڑی آ گئی اور اسلم اس کے ہنگامے میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کراس والی دوسری گاڑی بھی پہنچ گئی۔ ٹیلیفون آیا تھا کہ اس کا ایک ڈبا اتار کر پہلی گاڑی سے لگانا ہے۔ کچھ وقت اس میں لگ گیا۔ دونوں گاڑیاں چلی گئیں تو ایک بڑے انجنیئر ٹھیلے پر وہاں پہنچ گئے اور اسلم ایک دو گھنٹے ان کے پاس رہا۔ دوپہر کے قریب وہ فارغ ہوا تو سوچنے لگا کہ دتو کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بکنگ کلرک کو بلایا اور ——— اس سے پوچھا کہ آیا اس نے دتو کو کل پھل چراتے دیکھا ہے۔ کلرک نے نفی میں سر ہلایا۔

"کبھی پہلے دیکھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

——— "کبھی اس قسم کی شکایت سنی ہے؟"

کلرک خاموش رہا۔ اسلم نے دو چار سوال اس سے کیے اور اسٹیشن کے باقی عملے سے بھی پوچھا مگر سب کا رویہ اس قسم کا تھا کہ اس موضوع پر بات کرنے سے بچنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسلم کو اندازہ ہو گیا کہ دتو کے خلاف کھل کر بات کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے زیادہ وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک رپورٹ لکھی کہ اللہ دتا کانٹے والا شہر میں پھلوں کی دکان کرتا ہے اور کل میں نے اسے گاڑی میں سے پھل چراتے ہوئے دیکھا ہے اسے فوراً یہاں سے تبدیل کیا جائے کیونکہ اس کاروبار میں یہاں کے بااثر لوگ بھی شامل ہیں۔ رپورٹ لکھ کر اس نے ہیڈ کوارٹر بھجوا دی۔

پھر اس نے دتو کو بلوایا کہ اس سے پوچھے کہ کوارٹر خالی ہوا یا نہیں،

مگر وہ غائب تھا۔ اسلم نے سوچا کہ اب یہ تبدیل تو ہو ہی جائیگا۔ اس لئے بار بار کیا منہ لگانا دو ایک روز پڑا رہنے دو اسی جگہ اسے پھر خود ہی چلا جائیگا دو تین روز گزر گئے۔ دتو صرف ڈیوٹی پر آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔

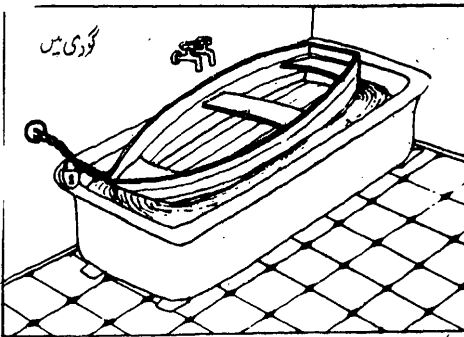
اسلم قریب قریب سارا دن اسٹیشن پر گزارتا تاکہ دتو یا اللہ وسائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان دنوں میں اس نے لوگوں کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ گاڑی کے وقت سے کچھ پہلے اور کچھ بعد میں اس کے پاس آکر بیٹھنے والے درباری قسم کے لوگ غائب ہو گئے تھے بازار میں کوشش سے سلام کرنے والے راہ گیر اب ہاتھ اٹھانے کے بجائے اسے چھبتی ہوئی ٹکٹکی سے دیکھتے عورتیں اسے سڑک پر آتا دیکھتیں تو کسی گلی میں مڑ جاتیں یا سڑک کے دوسرے کنارے ہو جاتیں جن لوگوں سے اس کا سرکاری طور پر واسطہ پڑتا تھا وہ کچھ عجیب سے محتاط نظر آتے۔

اسلم جانتا تھا اس کا سبب کیا ہے؟ دتو ضرور لوگوں میں کوئی افواہ پھیلا رہا ہے مگر وہ کیا ہے اس کا اسے علم نہ تھا۔ نہ معلوم وہی بات تھی جو ملک رحمت علی نے اسے کہی تھی یا کوئی اور؟ بہرحال وہ پوچھنا نہ چاہتا تھا کیونکہ اس طرح بات پھیلنے کا زیادہ احتمال تھا۔ تین دن وہ اسی الجھن میں پڑا رہا اور ادھیڑ بن کی وجہ سے فیصلہ نہ کر سکا کہ دتو کو کوارٹر سے باہر نکالے یا نہیں۔

چوتھے روز جب گاڑی آکر رکی تو اس میں سے عثمان اترا اسے ریلوے بورڈ نے انکوائری کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے پاس اسلم کی بھیجی ہوئی رپورٹ بھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے کتنی لوگوں کے دستخطوں سے ایک لمبی عرضی تھی جس میں اسلم کے خلاف شکایت تھی کہ اس نے زبردستی اللہ وسائی کو ناجائز تعلقات پر مجبور کیا اور دتو کو اس سلسلے میں تنگ کرنے کے لئے کوارٹر خالی کرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ عرضی پر ملک رحمت علی کے دستخط تھے مگر اس کے مختار خاص، منشی اور ملازموں کے تھے۔ ساتھ ہی دتو، شوکا مانگی اور شہر کے چند اور لوگوں کے بھی دستخط تھے جنہوں نے اسلامی اخلاق کے نام پر حکومت سے نیک افسر بھرتی کرنے کی استدعا کی تھی۔

دوسرے دن انکوائری شروع ہوئی۔ عثمان نے دتو کے بیان لئے۔ اللہ وسائی کے بیان لئے۔ عرضی پر جن لوگوں کے دستخط تھے ان کو بھی بلا کر پوچھا ملک رحمت علی سے بھی طویل بات چیت کی اور بعد ازاں سارا معاملہ اسلم کے ساتھ بھی زیر بحث آیا۔ یہ سارا سلسلہ تین دن چلتا رہا۔

اس اثنا میں یہ بات شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ دتو، شوکا اور



ملک رحمت علی ہر جگہ لوگوں کو اپنی کہانی سناتے جو انہوں نے عرضی میں لکھی تھی اور بڑے فخر سے کہتے کہ انکوائری انہوں نے کرائی ہے اور اب چند دن بعد اسٹیشن ماسٹر تبدیل ہو جائے گا۔ چھوٹے سے قصبے میں اتنی بڑی بات پر خاموشی کیسے رہتی۔ لوگوں کے فقرے کندھے اچک اچک کر ایک سے دوسرے تک گئے اور عورتوں کی بظاہر معصوم کھسر پھسر کے ذریعے سات نہ خانوں میں چھپی ہوئی کنواریوں تک کو اصل قصے سے بہت زیادہ باتیں معلوم ہو گئیں۔ اللہ وسائی شہر میں نکلتی تو مرد اسے نفرت سے دیکھتے۔ جوان لڑکوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور عورتیں "دفع۔ دفان" کرنے کے باوجود آنکھوں کے کونوں اور پلو کی آڑ سے اسے دور تک دیکھتی رہتیں۔

اسٹیشن ماسٹر اتنے دن باہر نہ نکلا۔ وہ زیادہ تر اپنے کوارٹر میں رہتا، جہاں عثمان اس کے پاس ٹھہرا تھا اور اس بات پر خوش تھا کہ اس کی رپورٹ پر دتو کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ اب دتو کو کوارٹر سے نکالنا بے کار تھا کیونکہ انکوائری میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور پھر دتو خود ہی تبدیل ہو کر چلا جائے گا۔ گو ملک رحمت علی شہر میں ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ وہ دتو کے ساتھ ہے اور کوئی مائی کا لال اسے تبدیل نہیں کر سکے گا۔ وہ شہر کے لوگوں سے بھی بار بار کہتا کہ "سرکاری نوکر باہر کے لوگ ہوتے ہیں آج یہاں کل وہاں مگر ہم سب کو تو یہاں رہنا ہے اس لئے سب دتو کی حمایت کریں خواہ مخواہ کیوں باہر والوں کی وجہ سے آپس میں نا چاقی ہو۔"

انکوائری ختم ہو گئی۔ عثمان چلا گیا۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں مدھم پڑنے لگیں۔ ایک ہفتے بعد اوپر سے آرڈر آ گیا۔ انکوائری میں اسلم بے قصور ثابت ہوا تھا اور دتو کو فہمائش کی گئی تھی کہ اگر اب اس کے خلاف پھل چرانے کی شکایت آئی تو اسے برطرف کر دیا جائے گا۔ اسلم کو تھوڑا ملال ضرور ہوا کہ دتو کا تبادلہ کیوں

نہیں ہوا پھر بھی وہ خوش تھا کہ وہ بے قصور ثابت ہو گیا ہے۔ کرسی کی پشت پر پھیلتے ہوئے اس نے زوردار انگڑائی لی اور بڑبڑایا۔ "بالآخر حق کی فتح ہوتی ہے۔" اس نے آرڈر کی کئی ایک نقول کرا کے سٹاف کو بانٹ دیں۔ اسٹیشن پر مختلف جگہوں پر چسپاں کر دیں اور شہر کے معتبر لوگوں کو بھجوا دیں، ایک نقل بذریعہ ڈاک ملک حشمت علی کو بھجوا دی اور بڑے سکون سے گھر واپس گیا۔

اب اسلم شہر میں نکلتا تو خواہ مخواہ لوگوں سے بات کرنے ٹھہر جاتا اور بات کو ہیر پھیر کر انکوائری کی طرف لاتا، پھر بتاتا کہ وہ خود بے قصور ثابت ہو گیا ہے اور یہ سب ڈی ٹی او اور ملک حشمت علی کی شرارت تھی۔ وہ یہ سب کچھ بڑے فخر سے بتایا کرتا، کیونکہ پچھلے کئی سال سے پھل کی چوری ہوتی تھی اور دوسرے قواعد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی اور یہ سب اس نے آ کر روک دیا تھا۔ مگر لوگوں کے ردعمل سے اسے صحیح اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ اسے بے قصور سمجھتے ہیں یا ابھی تک اللہ دسائی کا عاشق خیال کرتے ہیں، کچھ دن بعد اسے عجیب سی بے چینی ہونے لگی کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ لوگوں کے سلاموں میں اب اس کے لئے وہ احترام نہیں تھا اور ملنے والوں کی بے تکلفی میں بھی ایک پردہ سا تھا۔

چند روز بعد اسلم ڈیوٹی پر تھا۔ صبح کی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی کہ اسے گارڈ کے ڈبے میں رشید نظر آیا۔ یہ اس کا اسکول کا درست تھا اور اب ریلوے میں کام کرتا تھا۔ گاڑی رکتے ہی اسلم دوڑ گیا اور جا کر رشید کے گلے لگ گیا۔

"ارے ظالم! بڑے دن بعد نظر آئے۔ کہاں گم رہتے ہو۔" اسلم نے اسے تھپکی دی۔

"میاں تمہاری شہرت کے غبار تلے چھپا بیٹھا تھا۔ ہم غریبوں کو کون جانتا ہے۔"

"کیسی شہرت؟" اسلم نے پوچھا۔

"اچھا اتنے بڑے معرکے بھی مارتے ہو اور ہم سے بھی پوچھتے ہو؟"

"چلو بکواس نہ کرو اور آ کر چائے پیو۔"

"چائے پینے کون آیا ہے؟ ہم تو تمہارا حرم دیکھنے آئے ہیں۔"

دونوں ہنسنے لگے، اسلم بھی مذاق کا جواب مذاق سے دیتے ہوئے بولا۔ "تم جیسے نامحرم ہمارے حرم میں نہیں آ سکتے۔"

"ارے واہ!" رشید اس کی پیٹھ پر دھپ مار کر بولا۔ "انکوائری افسر تو نامحرم نہیں ہیں اور ہم نامحرم ہیں؟ ؟ ۔ ایں؟ ؟ ؟"

اسلم جھینپ گیا اور رشید قہقہہ مارنے لگا۔ وہ کمرے کے پاس پہنچ چکے تھے اور اندر جا کر چائے پینے لگے۔

رشید نے چائے کی لمبی چسکی لی، اسٹول گھسیٹ کر ٹانگیں اس پر رکھیں کرسی کی ٹیک پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور گھونٹ نگل کر بولا۔ "بڑی عمدہ چائے ہے یار۔ سچ بتانا اس نے بنا کر بھیجی ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اسلم نے مصنوعی غصے سے کہا۔ "اس نے کس نے؟"

"اللہ قسم عثمان بڑی تعریف کر رہا تھا اس کی۔ کہتا تھا کیا ہاتھ مارا ہے ظالم نے۔ سچ مانو وہ تو ابھی تک نشے میں ہے۔"

اسلم "فضول بات" کہہ کر چائے پینے لگا۔

"ایک بات بتاؤ اسلم۔" رشید پیالی رکھ کر بولا۔ "اسکول کے زمانے میں تو تم بڑے صوفی، مولوی، پرہیزگار، عبادت گزار اور نہ معلوم کیا کیا تھے مگر بھئی اب کے تو تم نے کمال کر دیا۔"

"میں تو اب بھی صوفی ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور ہو مگر ۔۔۔" رشید انگلی سے میز بجاتا ہوا گانے لگا ع

"مجھ سے پہلی سی عبادت مرے اللہ نہ مانگ"

اسلم بھی ہنسنے لگا۔ رشید کافی دیر تک اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسلم پہلے تو اسے خالص مذاق سمجھتا رہا مگر بعد میں رشید نے اسے سنجیدگی سے بتایا کہ ہیڈ کوارٹر پر عام لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ عثمان خود بھی ان معاملوں میں تیز ہے اس لیے اسلم نے عثمان کو بھی اللہ دسائی سے سنفید کرا دیا ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنی رپورٹ میں اسلم کو بے قصور بتا دیا ہے۔

اسلم کے تن سے ایک دم جان سی نکل گئی۔ اس کی آنکھیں پیالی میں گڑی رہیں، رنگ سرخ ہو گیا اور دماغ میں بلبلے اٹھنے لگے۔ اس نے ایک دم چائے کا بڑا سا گھونٹ نگلا۔ گرم سا گولا دیواروں کو دھکیلتا ہوا نیچے کو سرک گیا اور وہ آنکھیں جھپک کر رشید کی غلط فہمی دور کرنے لگا۔ دونوں کافی دیر تک سنجیدگی سے بات کرتے رہے۔ رشید تو قائل ہو گیا مگر اس کا خیال تھا کہ محکمے کے عام لوگوں کے دل سے یہ خیال نکالنا قریباً قریباً ناممکن تھا کیونکہ ساری انکوائری کے باوجود ابھی تک اللہ دتا وہیں تھا۔

"وہ تو ملک حشمت علی کے رسوخ کی وجہ سے ہے۔" اسلم بولا۔

"اب کسی کو کیا معلوم کہ وہ تمہارا رسوخ ہے یا ملک حشمت علی کا۔"

اسلم نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔

"یار تم نرے بودے ہو۔" رشید بولا۔ "کیوں خواہ مخواہ فکر کرتے ہو؟ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ اگر بالفرض تم نے کچھ کیا بھی ہے تو کیا برا کیا ہے؟ سبھی یہ کچھ کرتے ہیں۔ جو پکڑے گئے وہ مجرم ٹھہرے۔ جو چھپے رہے وہ نیک رہے۔ تم کیوں پروا کرتے ہو۔ بس یہ ہے کہ آئندہ محتاط رہو۔"

اسلم سارا دن رشید سے بات چیت کرتا تھا مگر اس کا دماغ ماؤف سا تھا۔ جیسے وہ صرف اوپر کی سطح سے سوچ رہا تھا اور نیچے سب کچھ سن ہے۔

شام کی گاڑی سے رشید چلا گیا۔ اسلم نے بڑی بے دلی سے کاغذات مکمل کیے۔ ضابطے کی باقی چیزوں سے فراغت حاصل کی اور پھر من من بھر کے قدم گھسیٹتا اپنے پلیٹ فارم کے آخری سرے پر تھا تو بکنگ کلرک نے پیچھے سے آواز دی۔ اسلم نے مڑ کر دیکھا تو وہ ایک خط دکھا رہا تھا۔

"یہیں دے دو۔" اسلم نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور ڈھیلا سا کھڑا ہو گیا۔ کلرک خط لایا۔ اسلم نے دیکھے بغیر لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ اس کا دل کسی کام پر آمادہ نہ تھا۔

کمرے میں جا کر اس نے لیمپ روشن کیا اور کپڑے تبدیل کیے بغیر دھم سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر وہ سوچنے لگا۔ رشید کے مذاق محکمے کے لوگوں کے اندازے شہر کے لوگوں میں احترام کی کمی دتّو کا پھل چرانا، اللہ دوسائی کا آدھی رات کو کمرے میں آنا یہ سب خیالات اس کے ذہن میں یوں باری باری سر اٹھا رہے تھے جیسے تیز بارش میں پکے فرش پر بلبلے اِدھر اُدھر سے نمودار ہوتے ہیں تھوڑا تیرتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا سوسائٹی کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ کردار کیا ہے؟ یہ میرا طرزِ عمل ہے یا میرے متعلق لوگوں کا تاثر ہے؟ میں بدی خود کرتا ہوں یا سوسائٹی مجھ سے کراتی ہے؟ نہ معلوم کتنے ہی سوال آندھی کے بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں آئے اور ان کو دوسرے بگولے دھکیل کر لے گئے۔ کہیں اللہ دوسائی کے جسم کے ابھار چپکے سے سر اٹھاتے اور ایک ہلکا سا پچھتاوا اس کے دماغ کی دیواروں پر لرزنے لگتا کہ جب لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں تو اس نے خود یہ موقع کیوں گنوایا؟ اور اگر وہ دنیا کی نظروں میں بدکردار ہے تو اس کی اپنی نیکی کس کام کی؟

کافی دیر تک وہ ایسے ہی بیٹھا رہا۔ لیمپ کی روشنی میں اس کے چہرے پر جا بجا تاریکی کے گڑھے پڑے تھے اور وہ بُت کے مانند بے جان بیٹھا تھا۔ معاً اسے خط کا خیال آیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا نکال کر لفافہ چاک کیا۔ کڑکڑاتا ہوا کاغذ کھولا تو اس کی بیوی کی تحریر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی:۔

میرے سرتاج سلامت رہو!

کل میں عثمان کی بیوی سکینہ سے ملی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ عثمان صاحب کسی انکوائری کے سلسلے میں تمہارے پاس آئے تھے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا کہ تمہارے خلاف بھی ایسے الزام ہو سکتے ہیں۔ اور پھر سچ بھی ہو سکتے ہیں۔ سکینہ کہہ رہی تھی کہ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ تمہارے کانٹے والے کی بیوی سے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ انکوائری میں ثابت ہو گیا تھا۔ مگر عثمان نے صرف تمہیں بچانے کی خاطر یہ رپورٹ دی کہ الزام غلط ہے حالانکہ اسے انکوائری میں یقین ہو گیا تھا کہ تمہارے اس عورت ...."

"عورت" کا لفظ پھولنے لگا۔ سطریں ہولے سے تیرنے لگیں۔ الفاظ ایک جھٹکے سے درہم برہم ہو گئے۔ اور آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

خط میز پر رکھا تھا۔ سامنے لیمپ تھا۔ خط کے دونوں طرف اسلم کی کہنیاں ٹکی تھیں۔ ہاتھوں میں سر تھما ہوا تھا اور شیشے کے سے شفاف قطرے لیمپ کی روشنی میں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی طرح چمکتے ہوئے ٹپ ٹپ خط پر گر رہے تھے۔

نہ معلوم اسلم کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ لیمپ کے شعلے نے دو تین بے چین سی انگڑائیاں لیں۔ ایک دو جھٹکے لیے اور تڑپ کر بجھ گیا۔

کمرے کی تاریکی میں ٹپ ٹپ کی آواز ٹھہر ٹھہر کر ابھرتی۔ پھر وقفہ زیادہ ہوتا گیا۔ اور پھر یہ آواز بند ہو گئی۔ کافی دیر گزر گئی.... ....اندھیرے میں کچھ سرسراہٹ ہوئی۔ چارپائی چرچرائی جیسے کوئی اٹھا ہے۔ پاؤں کی گھسٹتی ہوئی چاپ کھسکی — دیوار ٹٹولنے کی آہٹ ہوئی۔ ایک ہاتھ کھڑکی سے ٹکرایا۔ دو تین لمحے خاموشی رہی۔ اور پھر کھڑکی پر تھاپ کی آواز تاریکی میں گونجنے لگی ☆

سب رنگ ڈائجسٹ کا ایک نیا اور پراسرار سلسلہ

شاہد علی کا ایک چھوٹا سا خاندان تھا، ماں باپ اور ایک معصوم بہن، مکان ان کا اپنا تھا۔ وہ بڑی عسرت مگر عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہد علی نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے دو ایک ٹیوشنیں کر رکھی تھیں۔ وہ خود ایف اے کے دوسرے سال میں پڑھتا تھا خوش قسمتی سے اُسے ایک مالدار بیرسٹر راشد حسین نے دو سو روپے ماہوار پر اپنی نوجوان لڑکی کو پڑھانے کے لیے ملازم رکھ لیا۔ رشیدہ بڑی آزاد خیال اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پڑھا پڑھایا تو خاک نہیں البتہ شاہد علی سے اظہارِ الفت شروع کر دیا، اس نے شاہد علی سے بہت آگے کی باتیں کیں اور شادی کے لیے اصرار کیا۔ اصل میں وہ اپنا ایک سنگین اور حیا سوز جرم شاہد علی سے شادی کر کے چھپانا چاہتی تھی۔ مگر شاہد علی نے اسے سختی سے مسترد کر دیا اور نتیجتاً اس کی ملازمت جاتی رہی۔ رشیدہ نے اپنی اس توہین کا بڑا ہولناک انتقام لیا۔ اس نے اپنے زیورات شاہد علی کے گھر رکھوا کر اسے سات سال کی قید کرا دی۔ شاہد علی اور اس کے غریب والدین کی ایک نہ سنی گئی۔ اس کی ماں اس صدمہ جاں کاہ کی تاب نہ لا سکی، مر گئی۔ اس کی نوجوان بہن پر مجرمانہ حملے کیے گئے اور اس نے خودکشی کر لی، باپ بھی چل بسا۔ سات سال بعد جب وہ رہا ہوا

شاہد علی درانی

اکبر حسین آبدی





تو اس کے دوست اکبر کے سوا کوئی اسے خوش آمدید کہنے والا نہ تھا۔ کوئی گھر نہ تھا، وہ اکبر کے ہاں رہا اور اب اسے کہیں ملازمت نہ مل سکی، یہ دُنیا اس کے لئے تنگ ہو گئی رشیدہ اس عرصے میں شادی کر کے لندن چلی گئی تھی۔ اور رشیدہ کے باپ کے تموّل اور تکبّر میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاہد علی کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی مگر وہ ایک بے بس انسان تھا۔ پھر اس کے دوست اکبر حسین نے اسے مشورہ دیا کہ وہ میاں صاحب کے پاس جائے۔ سنا ہے جن کے پاس روحیں آتی ہیں ان کی دعا میں بڑی تاثیر ہے۔ اکبر حسین نے میاں صاحب کا تذکرہ کچھ اس عقیدت سے کیا کہ شاہد رات کو اسے اطلاع دیئے بغیر اس پہاڑی کی جانب چل پڑا جہاں میاں صاحب مقیم تھے۔ حالانکہ اکبر نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ چراغ جلنے کے بعد پہاڑی کا رُخ نہ کرنا۔

شاھد علی کسی نہ کسی طرح رات گئے پہاڑی پر پہنچ گیا جہاں ایک سفید ریش بزرگ نے اچانک نمودار ہو کر اسے حیرت زدہ کر دیا۔ بزرگ نے اسے واپس جانے کی ہدایت کی مگر شاہد علی نہ مانا، آخر اسے میاں صاحب کا دیدار کرنے کی اجازت اس شرط پر مل گئی کہ وہ میاں صاحب کے حجرے میں جو کچھ دیکھے گا اس کا تذکرہ کسی اور سے نہ کرے۔ شاہد علی نے وعدہ کیا اور بزرگ سفید دھوئیں میں تحلیل ہو کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ حجرے کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے کی جھری سے آنکھیں لگا دیں اور اندر جو کچھ دیکھا وہ اس کے اَوسان خطا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اندر دو چراغ جل رہے تھے، میاں صاحب مراقبے میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے دری پر ایک حسین و جمیل لڑکی باندیوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ ایک طرف ایک پنجرہ لٹک رہا تھا، جس میں ایک طوطا مردانہ آواز میں عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔ سارا ماحول اَسرار سے پُر تھا۔ اس نے دیکھا کہ میاں صاحب نے لڑکی سے کچھ سوالات کئے جس کے جوابات اس نے اس طرح دیئے جیسے اسے ہر بات کا علم ہو۔ جب سوال و جواب کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو وہ لڑکی دھوئیں میں تحلیل ہو کر آناً فاناً وہاں سے غائب ہو گئی۔ وہ ایک رُوح تھی جسے میاں صاحب نے طلب کیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے میاں صاحب کا یہ کرشمہ دیکھ کر شاہد علی پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ وہاں سے گرتا پڑتا بھاگا اور بے ہوش ہو گیا۔ صبح جب وہ اُٹھا تو اکبر کے گھر میں تھا۔ اسے تیز بخار آ گیا اور اس کے لئے اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جب اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو اس نے اپنے دوست اکبر سے اصرار کیا کہ وہ اسے میاں صاحب کے پاس لے چلے۔" اکبر اسے پہاڑی پر اپنی گود میں اٹھا کر لے گیا۔ جہاں شاہد علی نے میاں صاحب سے اس رات کی نادانی کی معافی مانگی، میاں صاحب نے اُسے تنبیہہ کی اور دعائیں دیں۔ شاہد علی کی طبیعت ٹھیک ہوتی چلی گئی اور اسے ایک چھوٹی سی ملازمت بھی مل گئی۔ مگر جب اُسے یہ علم ہوا کہ وہ سزا یافتہ ہے اور اس نے راشد حسین کے ہاں چوری کی تھی تو اُسے فوراً نکال دیا گیا۔ شاہد علی اس بات سے بہت دل برداشتہ ہوا۔ اس کا دل اس دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ اسے خود سے اور سارے انسانوں سے نفرت ہو گئی۔ اسکے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اس کا بس چلتا تو خون کی ندیاں بہا دیتا۔ آخر زندگی سے بیزار ہو کر وہ میاں صاحب کے ہاں آ گیا اور ان سے التجا کی کہ وہ اُسے اپنے قدموں میں رہنے کی اجازت دیں۔ میاں صاحب اس دل شکستہ اور منتشر مزاج نوجوان کی درخواست پر شش و پنج میں پڑ گئے اور پھر انھوں نے اجازت دے دی اور یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ شاہد علی کا اس سعادت پر خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔

پھر وہ میاں صاحب کے ساتھ رہنے لگا۔ اب اس پہاڑی پر ایک اور انسان کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مغرب کے بعد یہاں جنوں کا قبضہ ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ شاہد علی کی تمام جنوں سے دوستی ہو گئی۔ ابوالحسن بھی ایک جن تھے، ان کی ایک لڑکی دُرشہوار تھی جو شاہد علی کا خاص خیال رکھتی تھی۔ یہ سارا ماحول پُراَسرار تھا۔ یہاں شاہد علی کو عجیب و غریب، محیّرالعقول تجربے ہوتے۔ میاں صاحب کو اس نے بہت بڑا بزرگ پایا۔ وہ یقیناً روشن ضمیر بزرگ تھے۔ ہر ماہ کی آخری بدھ کو میاں صاحب کے ہاں عالم و فاضل لوگوں کی ایک نشست ہوا کرتی جس میں ایک پنڈت اذعانا تھ بھی شریک ہوتا تھا۔ وہ بڑا کینہ پرور شخص تھا۔ مگر نہ جانے میاں صاحب نے کیوں اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ وہ گستاخی کرتا تھا مگر میاں صاحب اُسے معاف کر دیتے تھے۔ شاہد علی کو سات سال اس پہاڑی پر علومِ روحانی کے حصول میں لگ گئے۔ اس عرصے میں میاں صاحب نے اسے سب کچھ سکھا دیا مگر روحوں کو طلب کرنے کا علم نہیں سکھایا۔ آخر ایک دن انھوں نے شاہد علی کو پند و نصائح کے بعد وہ آخری وظیفہ بھی بتا دیا جس سے رُوحیں طلب کی جاتی ہیں۔ شاہد علی نے اپنا وظیفہ مکمل کیا۔ اس عمل کے فوراً بعد اسے اپنے دوست اکبر کی بہن کی شادی کے سلسلے میں شہر جانا پڑا۔ وہ سات سال بعد پہاڑی سے نیچے اترا۔ شہر میں اس کا بے پناہ استقبال ہوا۔ ہجوم عقیدت سے اس کے تانگے کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس نے بازار سے گزرتے ہوئے بیرسٹر راشد حسین کی کوٹھی دیکھی جہاں اس کی نوجوان لڑکی ثمینہ اس کے جلوس کو دیکھ رہی تھی۔ راشد حسین کا خیال آتے ہی شاہد علی مشتعل ہو گیا اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ جب دوپہر کو وہ واپس پہاڑی پر پہنچا تو میاں صاحب نے ہجوم کے سامنے شاہد علی کو اپنا جانشین مقرر کیا اس کے بعد وہ نڈھال ہو کر گر پڑے۔ شاہد علی نے انھیں اندر حجرے میں چارپائی پر ڈال دیا اور خود باہر لوگوں کو صبر کی تلقین کرنے آ گیا۔ جب وہ واپس اندر گیا تو چارپائی خالی پڑی تھی اور میاں صاحب غائب ہو گئے تھے۔

میاں صاحب کہاں چلے گئے یہ وہ نہ جان سکا۔ ان کے دو سال کے بعد اس نے میاں صاحب کے رُشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب وہ ایک باوقار اور صاحبِ کرامت بزرگ تھا۔ اس کی زبان میں تاثیر تھی۔ وہ ایک بے نیاز فرد تھا، اس نے خود کو عبادت و ریاضت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ دنیا سے اسے کوئی رغبت نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ چلے جاتے تو وہ ابوالحسن جن اور اس کی لڑکی دُرشہوار کے پاس چلا جاتا، وہ دونوں اسے اپنے خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ شاہد علی نے بیرسٹر راشد علی کو بھی بھلا دیا تھا۔ البتہ اس کے پاس آتا رہتا اسکی دعاؤں سے وہ بہت آسودہ حال ہو گیا تھا۔ مہینے کے آخری بدھ کو حسبِ معمول نشست جمتی تھی جس میں اذعانا تھ بھی آتا تھا۔ اس کا انداز [illegible] اور گستاخی کا تھا۔ ایک دن اس نے [illegible] کچھ شاہد علی کا امتحان لینے کیلئے بھیجا شاہد علی اسے فوراً پہچان گیا۔ اُس نے اُسے مفلوج کر کے پہاڑی کے نیچے پھنکوا دیا تاکہ اذعانا تھ کو عبرت ہو جائے مگر اذعانا تھ نہیں مانا۔ وہ جب بدھ کو نشست میں آیا تو اس نے اشتعال انگیز گفتگو کی اور شاہد علی کو خوفزدہ کرنے کیلئے اپنے بیروں کا وحشیانہ اور خوفناک رقص دکھایا۔ شاہد علی اس کی ماورائی قوت کے اس مظاہرے کو مسکرا کر دیکھتا رہا۔ اس نے تحمل کا ثبوت دیا لیکن وہ بے چین رہا۔ رات کو اس نے پہلی بار روحوں کی طلبی کا وظیفہ شروع کیا۔ بہت مشکل مرحلوں کے بعد دوشیزہ الماس کی روح اس کے سامنے آئی۔ اس نے عالمِ ارواح کے متعلق بڑی دلچسپ باتیں کیں شاہد علی نے بعد کو اپنے والدین اور بہن کی ارواح سے ملاقات کی انھیں دیکھ کر اس کے پرانے زخم تازہ ہو گئے سب نے اسے سمجھایا مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے الماس کی رُوح کو طلب کر کے راشد حسین کے خاندان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ ثمینہ پاگل ہو گئی اور اس نے شارعِ عام پر اپنی دیوانگی کا شرمناک مظاہرہ کیا۔ شاہد علی خوش تھا کہ راشد حسین رُسوا ہو رہا ہے، لیکن اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اسے معلوم ہوا کہ اذعانا تھ نے ثمینہ کو ٹھیک کر لیا ہے۔ اس پر بھی غیظ و غضب کا شدید دورہ پڑا۔ اس نے ایک جلالی وظیفہ پڑھ کر ثمینہ کو پھر اسی عذاب سے دوچار کر دیا اسے یقین تھا کہ شام تک یا کل صبح تک ناکام ہونے کی صورت میں اذعانا تھ نہ دوڑا آئے گا۔

اوبنکار ناتھ نہیں آیا، شام تک شاہد علی نے اُس کا انتظار کیا۔ رات کو وہ حسبِ معمول اپنے رفیق اجنہ کی لبتی میں گیا۔ دُرِشہوار نے اس کی حالتِ اضطراب کو محسوس کر کے بڑی قربت کا اظہار کیا۔ اور اس نے دُرِشہوار سے پہلی بار جذباتی گفتگو کی کہ وہ فضیلتوں کے اس مقام پر پہنچنے کے بعد بھی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ رات کو جب وہ اداس اداس اپنے حجرے میں واپس آیا تو اس نے الماس کی روح کو پھر طلب کیا اور اس نے بتایا کہ ثمینہ کی ذہنی حالت ابتر ہو چکی ہے لیکن اوبنکار ناتھ اسے ہوش میں لانے کے لئے اپنے جنتر منتر آزما رہا ہے۔ الماس کے جانے کے بعد شاہد علی بہت مشتعل تھا۔ اس وقت پنجرے میں بند ایک طوطے نے کشف کشف کی رٹ لگانا شروع کر دی۔ طوطے نے اسے کشف کا ایک عمل یاد دلایا تھا جس کے ذریعے اس کی بصارت دیوار و در کی قید سے آزاد ہو جاتی، یہی ہوا۔ اسکی آنکھیں راشد کے گھر پہنچ گئیں۔ اور اس نے دیکھا کہ اوبنکار ناتھ غصے کے عالم میں ثمینہ پر اپنے علم کی آزمائش کر رہا ہے اور پسپائی پر چراغ پا ہو رہا ہے، وہ اپنی آنکھیں واپس لے آیا۔ دوسرے دن صبح دُرِشہوار نے اسے آکر بتایا کہ ثمینہ کی حالت ٹھیک ہو چکی ہے۔ اس خبر سے شاہد علی کی وحشت میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس نے عقیدت مندوں سے معذرت چاہی اور حجرے میں آکر سجدے میں گر پڑا۔ جب وہ اُٹھا تو دُرِشہوار اس کے سرھانے بیٹھی تھی اور ابوالحسن (جن) اسے راشد حسین کی کوٹھی جل کر خاکستر ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔ اس واقعے سے شاہد علی کو کسی قدر سکون نصیب ہوا مگر یہ کیفیت عارضی تھی۔ دو روز کے بعد جب وہ اپنے عقیدت مندوں میں گھرا ہوا تھا ایک انسپکٹر پہاڑی پر آیا۔ شاہد علی کے رفیقِ خاص شمشیر علی نے اس کی آمد کا سبب پوچھا تو اس نے گستاخی کی۔ آناً فاناً مجمع اس کی بدکلامی پر مشتعل ہو گیا دیکھتے دیکھتے گولی چل گئی۔ شمشیر علی قتل ہو چکا تھا۔ انسپکٹر ہجوم کے ڈر سے وہاں سے بھاگ نکلا۔ راشد حسین کی کوٹھی جل جانے کے واقعے کی بڑی شہرت ہوئی، اس پر شمشیر علی کا قتل۔ چنانچہ پہاڑی پر پولیس کا دباؤ بڑھ گیا۔ ڈی ایس پی ظفر دوسرے دن تفتیش کے لئے پہاڑی پر آیا۔ اس کا لہجہ انکسار کا تھا۔ اس نے بتایا کہ راشد حسین نے شاہد علی کے خلاف شرمناک رپٹ لکھوائی ہے۔ اس کا ماضی طشت از بام کیا گیا ہے۔ راشد علی اور ثمینہ کو اوبنکار ناتھ نے آگ سے بچا لیا تھا اور اب وہ دونوں اس کی پناہ میں ہیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی ظفر علی سے شاہد علی نے لاپرواہی سے گفتگو کی، لیکن اس کے جانے کے بعد وہ سوچتا رہا کہ یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہو گا؟ اس نے بہت سوچا اور مآل کار دُرِشہوار اور ابوالحسن کے اصرار پیہم کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ اس کا منصب نہیں ہے۔ اسے درگزر کرنا چاہیئے۔ مگر دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد اس کا دوست اکبر گھبرایا ہوا آیا اور اس نے شاہد علی کو اپنے برباد ہونے کی داستانِ الم سنائی۔ رات کو اسکا مکان اس کے خاندان سمیت جلا دیا گیا تھا۔ شاہد علی کو اب اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اُس نے عہد کیا کہ وہ اب پہاڑی سے نیچے اتر کر اوبنکار ناتھ سے نمٹے گا۔

جب وہ اس تاریک رات میں ایک عرصے بعد نیچے اترا اور اکبر کے مکان کے پاس پہنچا تو اکبر اپنے مکان کی راکھ کے پاس بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ شاہد علی نے اُسے تسلی دی۔ وہ دونوں اکبر کے دفتر میں مقیم ہو گئے۔ رات انھوں نے وہیں گزار دی۔ دوسری صبح جب اٹھے تو دفتر کے باہر عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ شاہد علی نے باہر آکر انھیں پرسکون رہنے کی تلقین کی مگر اس عرصے میں کچھ ہندو شر پسندوں نے چھیڑ خانی شروع کر دی اور وہیں ایک فساد برپا ہو گیا۔ پولیس نے موقع پر پہنچ کر شاہد علی کو گھیر لیا اور اس سے گستاخانہ طور پر اس فساد کے متعلق سوالات کئے۔ ایس پی ماتھر نے اسے حکم دیا کہ وہ اس عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ اکبر نے اسے تحمل اور ضبط سے رہنے کا مشورہ دیا۔ مگر حالات کی اس قدر سنگینی کے باوجود شاہد علی نے رات کو ایک وظیفہ پڑھا اور پھر اس نے درمیانی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کشف کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اُسے معلوم ہوا کہ اوبنکار ناتھ کی حویلی جل گئی ہے اور وہ غیظ و غضب کی حالت میں شعلوں سے بچتا باہر بھاگ رہا ہے۔ اس واقعے سے حالات اور سنگین ہو گئے۔ دوسرے دن ایس پی ماتھر قہر و غضب کے عالم میں وہاں آیا اور اس نے شاہد علی سے بڑا توہین آمیز برتاؤ کیا۔ شاہد علی سے یہ برداشت نہ ہوا اور اس نے نہ ایک طور پر ماتھر کی قوت گویائی چھین لی۔ ماتھر کا رویہ ایک دم بدل گیا اور اس نے فوراً شاہد علی سے اپنی گستاخی کی معذرت چاہی۔ اکبر نے اس کے بعد بھی اسکو سمجھایا۔ ابوالحسن بھی آئے اور انھوں نے اس سے واپس پہاڑی پر چلنے کو کہا اور اصرار کیا۔ شہر کی بڑھتی ہوئی کشیدگی دور کرنے کے لئے ڈی۔ ایس پی ظفر بھی وہاں آئے لیکن شاہد علی نے ہر دو کی درخواست ٹھکرا دی اور اوبنکار ناتھ کو سبق سکھانے کے عہد کی تجدید کی۔ اسی دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اکبر غائب تھا۔ شاہد علی نے مشتعل ہو کر الماس کو طلب کیا۔ الماس نے اسے بتایا کہ اکبر کو اوبنکار ناتھ کے کالے علم کے بیر دیوتے اغوا کر لیا ہے۔ شاہد علی نے اسے حکم دیا کہ وہ اکبر کو رہا کرائے مگر الماس نے معذوری ظاہر کی اس کی رُوح کا گزران ناپاک علاقوں میں ناممکن ہے جہاں اکبر قید ہے۔ اضطراب کی کیفیت میں شاہد علی نے پھر ایک وظیفہ پڑھا اور اس مندر کو نذر آتش کر دیا جہاں اوبنکار ناتھ راشد حسین اور ثمینہ کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ اوبنکار ناتھ وہاں سے بچ کر نکل گیا اور مندر کی آتش زدگی نے ایک بڑے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ خود شاہد علی اس سنگینی پر مضطرب ہو گیا۔ اس کشمکش و پیچ کی کیفیت میں دُرِشہوار اسکے پاس آئی اُس نے شاہد کو اس اشتعال سے باز رکھنے کی کوشش کی اسے بہت سمجھایا۔ شاہد علی پر دیوانگی کا عالم طاری تھا، دُرِشہوار کی قربت بھی اس کا غصہ سرد نہ کر سکی۔ مگر دُرِشہوار نے اسے قابو میں کر لیا وہ اسے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر کے تھانے میں لے گئی جہاں اوبنکار ناتھ پولیس کی نگرانی میں بیٹھا تھا اور شاہد علی کے متعلق بہت نفرت انگیز باتیں کر رہا تھا۔ اسی لمحے دُرِشہوار نے شاہد علی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ سب کی نظروں کے سامنے آ گیا۔ اُسے اس طرح یہاں کھڑا دیکھ کر پولیس والے دنگ رہ گئے۔ اوبنکار ناتھ اور شاہد علی میں اس وقت بڑی اہم گفتگو ہوئی۔ شاہد علی نے اسے دھمکی دی کہ وہ اکبر کو اس کے حوالے کر دے۔ اوبنکار ناتھ نے تھانے میں اس کی موجودگی کو غنیمت سمجھا اور ایک عمل کے ذریعے شاہد علی پر وار کیا جس کا شاہد علی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب وہ اوبنکار ناتھ کو سزا دینا چاہتا تھا۔ بات بہت بڑھ جاتی اسلئے دُرِشہوار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک لمحے میں وہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دُرِشہوار اُسے سمجھا بجھا کر شہر سے دور ویرانے میں واقع ایک اُجاڑ مسجد میں لے آئی۔ اس نے شاہد علی کو صبر و ضبط کی بہت تلقین کی مگر رات ہی کو شاہد نے اس مسجد میں ایک جلالی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ دُرِشہوار نے اسے بتایا تھا کہ اکبر بھوٹان کی پہاڑی کے کسی قید خانے میں بند ہے۔

تین دن شب و روز اس وظیفے میں انہماک کے بعد کہیں اُسے بھوٹان کی پہاڑیوں میں اکبر کی شبیہ نظر آئی، پھر اس نے خود کو وہاں پایا۔ شاہد علی نے اپنے دوست کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر آگے بڑھنا چاہا لیکن عین اسی وقت ایک سفید پوش بزرگ نے نمودار ہو کر اسے روک لیا۔ اُنھوں نے شاہد علی کو کسی اشتعال انگیز اقدام سے باز رکھا اور دوا ان کی اعانت سے اکبر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کام حیرت انگیز طور پر لمحوں میں ہو گیا۔ دوسرے دن اس نے الماس کی رُوح کو طلب کر کے اکبر کے اغوا کا اس طرح انتقام لیا کہ راشد حسین کی نوجوان لڑکی ثمینہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ جب ثمینہ اس کے سامنے آئی تو اسے خود پر قابو نہ رہا وہ مشتعل ہو گیا اور قبل اس کے کہ وہ ثمینہ کے ساتھ کوئی شرمناک حرکت کرتا دُرِشہوار نے مخل ہو کر اسے اس کے علم و فضل، مرتبے اور منصب کا واسطہ دیا۔ دُرِشہوار کی بروقت مداخلت نے اسے ایک گناہِ عظیم سے بچا لیا۔ ثمینہ بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس نے جب تمام واقعات سنے تو شاہد علی سے اپنے باپ کے ظلم کی معافی چاہی ادھر دُرِشہوار نے شاہد علی کو متنبہ کیا کہ وہ فوراً اس علاقے کو چھوڑ دے اس نے بتایا کہ اوبنکار ناتھ کسی پنڈت کے بتائے ہوئے خطرناک عمل کو شروع کر چکا ہے۔ چنانچہ اس کی ضد اور اصرار پر دو دن کی مسافت پر واقع

ایک شکستہ قلعہ میں پناہ لی جہاں اجنہ کا ایک قبیلہ آباد تھا اور مشہور تھا کہ وہ قلعہ روحوں کا مسکن ہے۔ قلعے کے اجنہ شاہد علی کے دوست ہوگئے اور انھوں نے اس کی میزبانی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک رات وہ قلعے کے اس گوشے میں گیا جہاں اجنہ کے بیان کے مطابق آوارہ روحوں کا قیام تھا۔ اس نے وہاں ایک عجیب و غریب دنیا دیکھی۔ باندیاں اور کنیزیں، دربان۔ وہ تو کسی ریاست کا نقشہ پیش کرتی تھیں جب وہ آگے بڑھتا گیا تو ایک جگہ کنیزوں نے اسے روک لیا اور اسے ایک دلچسپ بات بتائی کہ وہ آگے نہ جائے، آگے راجکماری کا قیام ہے جو صدیوں سے اپنے راج کمار کا انتظار کر رہی ہے وہ ایک تجسس لئے وہاں سے واپس آگیا۔ دوسرے دن اکبر کی خواہش پر ثمینہ کی اس سے شادی کر دی گئی۔ اسی رات کا ذکر ہے کہ اکبر نے ایک ہیبت ناک خواب دیکھا کہ وہ ایک ویران صحرا میں تنہا پڑا ہے ایک گدھ اس کے جسم کے گرد منڈلاتا ہے۔ اسی عرصے میں میاں صاحب نمودار ہوتے ہیں۔ اور وہ شاہد علی کی طرف سے منہ پھیر کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس خواب سے شاہد علی بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس دن رات کو الماس کو طلب کر کے رشیدہ کے بارے میں پوچھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ رشیدہ کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ اپنے دونوں بچوں سمیت واپس آرہی ہے تو شاہد علی نے الماس کو حکم دیا کہ وہ رشیدہ کے دونوں بچوں کو ہلاک کر دے لیکن الماس نے تعمیل سے انکار کر دیا اور غائب ہوگئی اس نے الماس کو دوبارہ طلب کرنے کیلئے کئی بار وظیفہ پڑھا اور ہر بار اُسے ناکامی ہوئی اور وہ پریشانی غصے اور جھنجلاہٹ میں دریا کے کنارے چلا گیا۔ پہلی بار اس پر مایوسی کا غلبہ ہوا۔



دریا کے کنارے مجھے پہلی بار سردی محسوس ہوئی، میرے قدم بوجھل ہوگئے۔ میں نے قلعے کی طرف دیکھا۔ وہاں ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میرا ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ کیا سب کچھ زائل ہوگیا۔ ہاں سب کچھ زائل ہوگیا۔ نہیں نہیں۔ یہ سب میرا گمان تھا۔ اُف اس وقت میرے ذہن کا عالم میری وحشت، میں دریا کے کنارے دور تک نکل گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا قلعہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ تین بار عمل دہرانے کے باوجود الماس کی روح میرے پاس حاضر نہیں ہوئی۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ الماس میری طلبی پر فوراً حاضر ہو جایا کرتی تھی۔ پھر آج یہ عجیب واقعہ کیوں رونما ہوا۔ الماس کی روح کو یہ جرأت آخر کیسے ہوگئی؟

ان اُلجھنوں میں مجھے پتا ہی نہ چلا کہ میں کتنی دور نکل آیا ہوں اکبر کا خواب۔ الماس کا نہ آنا، وہ اشارہ جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میاں صاحب مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔ دریا کے کنارے میں دیر تک ٹہلتا رہا۔ پھر اچانک پلٹ کر قلعے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ اس وقت مجھے بڑی شدید تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں اپنے پریشان خیالات کے غبار کے لئے دُرِ شہوار ہی اُبھری۔ دُرِ شہوار۔ میرے محسن ابوالحسن جن کی نوجوان بیٹی۔ جو اپنے شفیق باپ کو چھوڑ کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ وہ سرتاپا حُسن و جمال کا شاہکار تھی وہ نہ ہوتی تو حالات نہ جانے کیا رُخ اختیار کر لیتے۔ وہ میرا سہارا تھی۔ وہ میری لاٹھی تھی۔ میں نے اس وقت اپنے دل میں اس کے لئے بے پناہ محبت محسوس کی۔

قلعے میں پہنچ کر میں نے دُرِ شہوار کو تلاش کیا مگر وہ وہاں موجود نہ تھی۔ چنانچہ میں اپنے بستر پر دراز ہو کر دُرِ شہوار کا انتظار کرنے لگا۔ عموماً وہ کچھ دیر کے لئے چلی جاتی تھی۔ اکبر اور ثمینہ دوسرے حصے میں تھے، میرا دل چاہا کہ ایک بار پھر روح الماس کو طلب کرنے کا عمل پڑھوں، ہوسکتا ہے کہ میں نے عمل پڑھنے میں کوئی غلطی کر دی ہو۔ میں اس خیال سے اٹھا اور دوبارہ جائے نماز پر بیٹھ کر وہی عمل پڑھنے لگا۔ لیکن چوتھی بار بھی مجھے مایوسی ہوئی۔ جب کوئی صورت نہ بنی تو میں خود کو بہلانے کی خاطر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ لاتعداد وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا؟ ایسی مایوسی مجھے پہلے تو کبھی نہ ہوئی تھی۔

میں اپنے خیال میں محو تھا کہ قدموں کی آہٹ سُن کر میرا شیرازۂ خیال منتشر ہوگیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ اکبر میری سمت آ رہا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں اکبر کو اپنی پریشانیوں میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس غریب نے میری خاطر پہلے ہی بہت دُکھ جھیلے تھے۔ اکبر میرے قریب آکر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر بولا۔

"شاہد میاں۔ میں اس وقت تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ تمہیں ناگوار نہ ہو۔"

"کہو اکبر۔ یہ اجنبیت کی کیسی باتیں کر رہے ہو مجھے تمہاری کسی بات سے تکلیف بھی ہوسکتی ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے شاہد علی کہ میں اور ثمینہ اس وقت مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔" اکبر نے مدھم لہجے میں

کہنا شروع کیا۔ "ہم سوچ رہے تھے کہ اس طرح آخر کب تک ہم یہاں رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ کسی دوسرے شہر جاکر کوئی کاروبار کروں اور ایک نئے گھر کو نئے سرے سے بناؤں۔ ثمینہ کی درخواست ہے کہ تم بھی ہمارے ہمراہ چلو۔"

"اکبر اگر تم نے اپنے نئے گھر کو بنانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ خدا تمہیں تمہارے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے لیکن میں ابھی تم لوگوں کے ہمراہ نہ جاسکوں گا۔ میں نے جس مقصد کی خاطر میاں صاحب والی پہاڑی کو خیرباد کہا تھا اس کی تکمیل ابھی باقی ہے۔"

"وہ ثمینہ اس بات پر رضامند نہ ہوگی۔" اکبر نے کہا "تم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے وہ بہت متاثر ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہمیشہ تمہاری خدمت کرتی رہے۔ ایک بہن کی طرح، تمہاری بہن کی طرح۔"

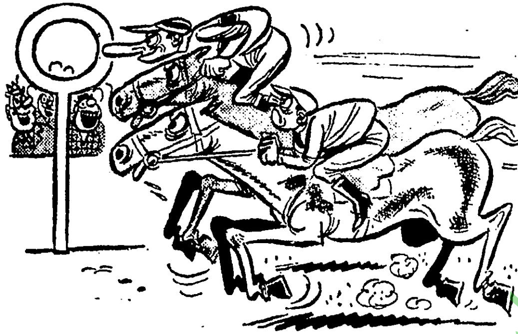
"ثمینہ کی فکر نہ کرو میرے دوست۔ میں اسے سمجھا دوں گا" میں نے اداسی سے جواب دیا۔

ہرچند کہ اکبر اور ثمینہ کو جدا کرنے کو جی نہ چاہتا تھا لیکن میں اکبر کی خوشیوں کی راہ میں حائل بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میری دلی آرزو بھی یہی تھی کہ اکبر اور ثمینہ اپنا گھر بنائیں خوش و خرم رہیں۔ اس لئے میں نے اسی وقت ثمینہ کو بلا کر سمجھایا کہ وہ مجھے ساتھ لے جانے پر اصرار نہ کرے۔ ثمینہ تھوڑی دیر تک تو اسی بات پر بضد رہی کہ میں بھی اس کے ہمراہ چلوں لیکن جب میں نے اسے حالات کی اونچ نیچ سمجھائی تو وہ خاموش ہوگئی۔

دوسرے دن اکبر ثمینہ کو لے کر رخصت ہوگیا۔ ثمینہ حقیقتاً کسی بہن کی طرح مجھ سے لپٹ کر روئی تھی۔ میں نے اسے اور اکبر کو خاص طور پر ہدایت کی کہ وہ ثمینہ کا بطور خاص خیال رکھے۔ روانگی کے وقت ثمینہ اور اکبر نے درِ شہوار کے بارے میں دریافت کیا۔ مجھے خود درِ شہوار کی کمی گزشتہ رات سے بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ بہرحال میں نے یہ کہہ کر دونوں کو مطمئن کردیا کہ درِ شہوار ایک ضروری کام سے گئی ہے اور رات تک لوٹے گی۔ اکبر مجھ سے بغلگیر ہو کر رونے لگا تو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا:۔

"اکبر تم تو وقتی طور پر مجھ سے رخصت ہو رہے ہو۔ لیکن میں بہت جلد تم سے ملوں گا۔ ویسے دور رہتے ہوئے بھی تم دونوں مجھ سے بہت قریب رہو گے۔ میرے لئے تم دونوں اور درِ شہوار کے سوا اور کون ہے۔"

اکبر اور ثمینہ کے جانے کے بعد میری طبیعت اداس ہوگئی میں نے قلعے میں مقیم اجنہ کے قبیلے کو ہدایت کی کہ وہ اکبر کو دور تک چھوڑ آئیں اور اسے کسی محفوظ شہر تک پہنچا دیں۔ قلعے کی ویرانی مجھے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ گزشتہ رات میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کی ہر بات دوبارہ مجھے بے چین کر رہی تھی۔ سارا دن میں نے بے چینی کی حالت میں گزارا۔ رات آئی تو میں نے ایک بار پھر روحِ الماس کو طلب کرنے کا عمل پڑھا مگر پھر مایوسی ہوئی ان پے در پے ناکامیوں نے مجھے نڈھال کر دیا۔ ادھر درِ شہوار کی غیر موجودگی اس عالم میں مجھے بے حد شاق گزر رہی تھی۔ مجھے اس سے بہت ساری باتیں معلوم کرنی تھیں۔ رشیدہ کے بارے میں بھی دریافت کرنا تھا۔ الماس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آج پہنچنے والی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ رشیدہ اپنے باپ تک پہنچنے سے پہلے ایک اور حادثے سے دوچار ہو۔ جتنے دن گزر رہے تھے میری نفرت راشد حسین اور رشیدہ سے اور شدید ہوتی جارہی تھی۔ میرا سینہ جل رہا تھا۔ میں رشیدہ کو کسی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہ تھا میں اسے اذیت ناک حالات اور حادثات سے دوچار کرکے اپنی بہن کی روح کو سکون پہنچانے کا خواہشمند تھا۔ معاً مجھے خیال ہوا کہ کیوں نہ میں موکل کو بلانے کا عمل پڑھوں اور موکلوں کے ذریعے رشیدہ کی سرکوبی کراؤں لیکن نہ جانے کیوں میں نے اس عمل سے گریز کیا۔ میں خائف تھا کہ کہیں اس عمل میں بھی مجھے ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ درِ شہوار سے مشورہ کرنے سے پہلے کوئی عمل مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ درِ شہوار کی واپسی میں اتنی دیر لگے گی تو میں ثمینہ اور اکبر کو ایک دن کے لئے اور روک لیتا۔ قلعے کے اجنہ بھی اکبر کو پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ گئے تھے، سارا قلعہ ویران تھا۔ وہاں صرف میں تھا۔



نصف رات تک میں انہی کیفیتوں سے دوچار رہا پھر جب ذہن معطل ہونے لگا اور پلکیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہونے لگیں تو میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔ اور اس وقت میں ہڑبڑا کر اُٹھا جب میں نے ایک آہٹ محسوس کی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ تو دیکھا کہ میرے قریب ایک عورت کھڑی ہے۔ میں اندھیرے کی وجہ سے یہی سمجھا کہ وُہ دُرِّشہوار ہے لیکن جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وُہ ایک اجنبی عورت ہے۔ ابھی میں اُسے شناخت ہی کر رہا تھا کہ وہ کون ہے اور اتنی رات گئے اس ویرانے میں کیسے آگئی ہے۔ عورت جو قدیم ہندو لباس میں تھی، اُس نے بڑی عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا پھر بڑی مترنم آواز میں مجھ سے بولی۔

"چلیے سرکار۔ وُہ آپ کو بلاتی ہیں۔ یہ باندی اسی لئے آئی ہے۔"

"مگر تم کون ہو؟ اور مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"سرکار" عورت ہاتھ جوڑ کر بولی "میں اُنہی باندیوں میں سے ایک ہوں جنہوں نے کل رات آپ کو مہاراجکماری تک جانے سے روکا تھا۔ ہمیں اس وقت آپ کے بارے میں نہیں معلوم تھا کہ آپ کون ہیں۔ ہم نے آپ کو نہیں پہچانا تھا میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتی ہوں سرکار۔"

میں عورت کا جواب سن کر سمجھ گیا کہ وُہ مجھے اسی راجکماری کے پاس لے جانے کی متمنی ہے جس کو دیکھنے کی تمنا کئی بار میرے دل نے کی تھی۔ میرا اشتیاق بڑھنے لگا۔ میں باندی کا پیغام پا کر اپنی پریشانیوں کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔ مجھے یہ سُن کر بھی تعجب ہوا کہ راجکماری کو میرا مرتبہ معلوم ہو چکا ہے۔ باندی نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اب اسے میرے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ وُہ مجھے پہچان گئی ہے میں نے یونہی اُسے کریدنے کی غرض سے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔

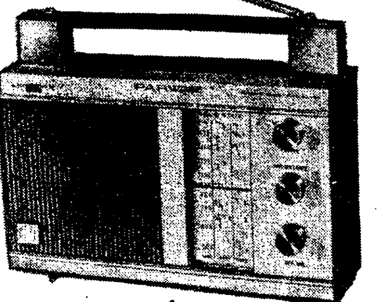
"میں تم سے ناراض نہیں لیکن تمہاری راجکماری کا بلاوا مجھے منظور نہیں۔ کل انہوں نے مجھے واپس کیوں کرا دیا تھا؟"

"مجھ پر رحم کیجئے سرکار" باندی آبدیدہ ہو کر بولی "اگر آپ نے میرے ساتھ جانے سے انکار کیا اور میں مایوس ہو کر راجکماری کے پاس گئی تو وُہ ہم سب باندیوں اور کنیزوں پر برہم ہوں گی۔ وُہ بہت اداس ہوں گی۔ انہیں آپ کے آنے کی اطلاع آپ کے جانے کے بعد ہوئی تھی۔"

"ٹھیک لیکن تمہاری راجکماری کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں۔" میں نے باندی کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہاں شتابدیوں (صدیوں) سے کوئی نہیں آتا۔ آپ ہی آئے تھے اور ہم نے آپ کا حلیہ راجکماری کو بتایا تھا۔ تب ہی سے وُہ آپ سے ملنے کی آرزومند ہیں اور انہوں نے مجھے بلانے کے لئے بھیجا ہے۔"

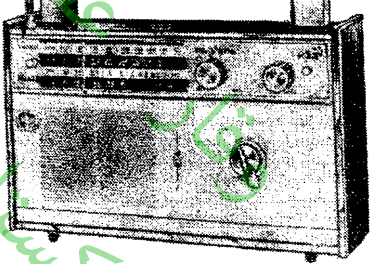
یہ عجیب دلچسپ بات تھی۔ یہ تو کوئی الف لیلوی داستان معلوم ہوتی تھی۔ میرا اشتیاق روحوں کے اسرار جاننے اور راجکماری کو دیکھنے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ میں باندی کے ہمراہ ہو لیا۔



پرواز ۳ بینڈ ڈیلکس ۲۹۳
۲۲۰ وولٹ اے سی یا بیٹری پر چلایئے



RGA
RADIO ◦ TELEVISION



نغمہ این۔پی ۱۲۴
۲ بینڈ ٹرانسسٹر ریڈیو

آج میں نے نہ تو لپنے اور پر حصار کیا نہ ہی رفع شر کا وظیفہ دم کیا۔ جب میں اس گوشے کی طرف گیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ پہلے جہاں ویرانی اور اُداسی تھی آج وہاں ہر سمت خوشیاں نظر آرہی تھیں۔ میں ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں طے کرتا ہوا آگے بڑھا تو وہاں کا سماں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ راہداری میں آج بھی دربان سپاہی، باندیاں اور کنیزوں کا اجتماع تھا لیکن آج نہ تو مجھے دیکھ کر ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات اُبھرے نہ وہ سراسیمگی کی کیفیتوں سے دوچار ہوئیں۔ اس کے برعکس وہ باوقار جتماع مجھے دیکھ کر بڑے ادب سے راہداری میں دو رویہ کھڑا نظر آیا۔ ایک طرف مرد تھے اور دوسری طرف کنیزیں اور باندیاں۔ اُن کے چہروں پر بے پناہ خوشیاں رقص کررہی تھیں۔ اُن کی نگاہوں میں میرے لئے عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے تھال اٹھا رکھے تھے، جب میں اُن کے درمیان سے گزرا تو دونوں طرف سے میرے اوپر پھولوں کی بارش شروع ہوگئی۔ مجھے یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ راجکماری کا کمرہ میرے سامنے تھا۔ میں تجسس، فخر اور تمکنت سے آگے قدم بڑھاتا رہا جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو ایک حسین کنیز نے آگے بڑھ کر پھولوں کا مہکتا ہوا ہار میرے گلے میں ڈالا اور مسکراتے ہوئے مگر ادب سے بولی۔

"اندر وہ ہیں، سرکار۔ وہ صدیوں سے آپ کی راہ تک رہی ہیں۔"

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ مسکراتی ہوئی پیچھے کی سمت بھاگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو راہداری سنسان پڑی تھی۔ غالباً وہاں اُن کی موجودگی اب ضروری نہ تھی۔ میں نے گھوم کر دروازے کو آہستہ سے اندر کی سمت دھکیلا اور اندر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں غلطی سے کسی کے حجلہ عروسی میں چلا گیا ہوں۔ پورا کمرہ سجا ہوا تھا۔ سامنے مسہری پر کوئی عورت عروسی لباس میں گھونگھٹ نکالے سمٹی سمٹائی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پورا ماحول بھینی بھینی مست کر دینے والی خوشبوؤں سے معطر ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ خواب کی باتیں لگ رہی تھیں۔ چند لمحے ، میں دروازے کے قریب کھڑا پھولوں کی سیج پر بیٹھی سُرخ گٹھڑی کو دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا مسہری کے قریب جا کر رُک گیا۔ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کرنے پر قادر نہیں۔ وہ عجیب کیف آگیں احساس تھا۔ وہ ایک طلسم تھا مگر بہت خوبصورت، سرخ لباس میں سمٹی ہوئی دلہن میرے قریب جاتے ہی کچھ اور سمٹ گئی۔ اس کا یہ انداز مجھے بہت دلکش لگا۔ اس کے لباس سے پھوٹتی ہوئی تیز خوشبو میرے دل و دماغ پر نشہ طاری کررہی تھی۔ اب میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے مضطرب تھا۔ میں نے کچھ توقف کے بعد اسے آہستہ سے مخاطب کیا۔

"میں آگیا ہوں راجکماری۔ تم نے مجھے بلایا تھا۔"

جواب میں راجکماری کا سر اور جھک گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ہمّت کرکے آگے بڑھا اور راجکماری کے سامنے مسہری پر آہستہ سے بیٹھ گیا اور اسے مخاطب کرکے بولا۔

"راجکماری میں آگیا ہوں۔ میں یہاں موجود ہوں تمہارے سامنے۔"

اس بار بھی راجکماری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے جواب نہ دینے پر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ راجکماری کے حسنِ جہاں سوز کو دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ میں نے دنیا میں لاکھوں حسین چہرے دیکھے لیکن جو حسن اور معصومیت راجکماری کے چہرے پر دیکھی۔ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کی مانگ میں بھری ہوئی افشاں اور چہرے پر پسینے کے جھلملاتے ہوئے قطروں نے مجھے گنگ سا کردیا، میں دیر تک اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور قادرِ مطلق کی صناعی کی داد دیتا رہا۔ وہ کوئی معمولی چہرہ نہیں تھا ایسا چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو کوئی حور تھی۔ میں اس کے بے مثال حسن میں کھو کر رہ گیا۔ میں بھول گیا کہ میں کون ہوں۔ مجھے بس یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے راجکماری میری دُلہن ہے۔ ماحول نے میرے دل و دماغ پر جادو کردیا تھا میں نے ہاتھ بڑھا کر راجکماری کی ٹھوڑی پکڑی اور اُس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

"آنکھیں کھولو۔ جب تم نے خود مجھے بلایا ہے تو پھر یہ شرم مانع کیوں ہے؟"

راجکماری کی گھنیری پلکوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ

چھوٹی موٹی کی طرح اپنے وجود میں سمٹ جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا اصرار شدید ہوا تو اس نے آنکھیں وا کر دیں۔ میرے خدا۔ وہ کس قدر حسین اور نشیلی آنکھیں تھیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ میں ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ نہ جانے کتنے حسین لمحات خاموشی سے گزر گئے۔ میں مبہوت سا راجکماری کو تکتا رہا۔ جیسے مجھ پر سکتہ ہو گیا تھا۔ پھر جب راجکماری کی مترنم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو ۔۔۔ اس طلسم رنگیں کا سحر ٹوٹا۔

"یوں حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"قدرت کی صنّاعی پر محوِ حیرت ہوں" میں نے دبی آواز میں جواب دیا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو۔ تم؟" راجکماری کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ وہ مجھے سوالیہ نگاہوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُسے میرے جواب سے دکھ پہنچا ہو۔ میں اس کی حیرت کا سبب نہ جان سکا۔ پہلو بدل کر بولا۔

"راجکماری۔ کیا میری بات سے تمہیں کوئی صدمہ پہنچا ہے؟"

"تم۔ تم کتنے بدل گئے ہو" راجکماری نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ وہ سوگوار لہجے میں بولی۔

"میں تو آج تک وہی ہوں۔ صدیاں بیت گئیں۔ دنیا بدل گئی، لیکن میں وہی ہوں۔ مگر تم۔"

راجکماری کی گھنیری پلکوں پر آنسو کے قطرے اُبھرے تو میں تڑپ اُٹھا۔ بے اختیار اس کے حنائی ہاتھوں کو عالمِ وارفتگی میں تھام کر میں نے کہا۔

"تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے راجکماری۔ آخر میرے کس اقدام نے تمہارے دل کو دکھ پہنچایا ہے، مجھے بتاؤ کہ میں کیسے بدل گیا ہوں۔ میں تو وہی ہوں، جو تھا اور جو ہوں۔"

"تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو" راجکماری ایک سرد آہ بھر کر بولی "بھگوان کی شاید یہی مرضی تھی۔ منش کا کیا دوش۔"

راجکماری اپنے ماضی میں تھی۔ ماضی جو بچھڑ گیا تھا۔ جو بچھڑ جاتا ہے۔ اس کا اشارہ کس طرف تھا؟ یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ البتہ میں اتنا ضرور سمجھ چکا تھا کہ راجکماری کسی غلط فہمی کا

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ

۱: جس آدمی نے اپنی قدر پہچانی وہ ضائع نہ ہوا۔

۲: بندے کو اپنے مالک کے سوا کسی سے امید نہ رکھنی چاہیئے۔ اور اپنے گناہوں کے سوا کسی سے نہ ڈرنا چاہیئے۔

شکار ہو رہی ہے۔ بہرحال اس موقع پر مجھے راجکماری کی دل شکنی منظور نہ تھی۔ اس کے سوگوار چہرے نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ میں نے ان لمحوں کو طول دینے کے لئے کہا۔

"راجکماری۔ کیا تم مجھے پہلے سے جانتی ہو؟"

جواب میں راجکماری نے مجھے غمناک نظروں سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ کچھ دیر تک وہ کسی مجسمے کی طرح خاموش مجھے اُداس نظروں سے دیکھتی رہی پھر یکلخت جیسے اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ گئی اور رُندھی ہوئی آواز میں بڑے کرب سے بولی۔

"پردیپ۔ کیا تم بھول گئے۔ کیا تم اپنی داسی کو بالکل ہی بھول گئے۔ کیا تم کو اپنی شیلا یاد نہ رہی۔ تم نے تو وچن دیا تھا پردیپ کہ ہم جنم جنم ساتھ رہیں گے۔ پھر تم میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کر رہے ہو۔"

میں اس کی باتوں سے سخت متعجب تھا۔ راجکماری شیلا مجھ سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھی۔ اس کے لمس نے مجھے کچھ نئے جذبوں سے روشناس کرایا۔ اس کا جسم سرد تھا۔ لیکن میں بہت منتشر ہو گیا تھا۔ بہت انتشار میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش یہ لمحے یونہی ساکت ہو جائیں اور میں تمام زندگی اسی طرح گزار دوں۔ راجکماری میرے پہلو میں بیٹھی رہے۔ مجھ پر نشہ طاری ہو گیا تھا۔ میں نے راجکماری کی باتوں کے جواب میں بے اختیار اُسے خود سے اور قریب کر لیا اور اُس کے شانوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میرے اس طرزِ عمل سے وہ اور مضطرب ہو گئی پھر اچانک مجھ سے جُدا ہو کر اس نے ڈبڈبائی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"پردیپ۔ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ میں نے تو تمہیں تلاش کرنے کے لئے آتما کا روپ دھار لیا۔"

"راجکماری" میں نے اُسے سمجھانا چاہا۔ "میرے سلسلے میں

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرے باپ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث جمع کی تھیں۔ ایک رات میں نے انہیں دیکھا کہ وہ بہت بے چین ہیں اور کروٹیں بدل رہے ہیں۔ میں بے چین ہوگئی اور دریافت کیا کہ "بابا جان! آپ کیوں بے چین ہیں؟ خیریت تو ہے؟"

حضرت صدیقؓ نے کوئی جواب نہ دیا اور پوری رات اسی اضطراب اور بے چینی میں گزار دی۔ صبح فرمایا۔ "عائشہؓ! احادیث کا وہ مجموعہ جو میں نے تیرے پاس رکھ چھوڑا ہے میرے پاس لے آ۔"

حضرت عائشہؓ نے یہ مجموعہ احادیث اپنے باپ کے حوالے کر دیا۔ حضرت صدیقؓ نے انہیں جلا دیا۔ جب حضرت عائشہؓ نے ان سے اس کے جلانے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ "عائشہؓ! ان میں وہ احادیث بھی شامل تھیں جنہیں میں نے دوسروں سے سن کر جمع کر لیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ان میں لاعلمی سے غیر معتبر احادیث بھی جمع ہوگئی ہیں تو ان کی وجہ سے قیامت کے دن خدا کے سامنے میری پکڑ ہوگی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔"

تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری صورت تمہارے پردیپ سے ملتی جلتی ہو لیکن میں وہ نہیں۔ میرا نام شاہد علی ہے۔"

"نہیں نہیں۔ نہیں۔" راجکماری میرا جواب سن کر دیوانگی کی حالت میں بولی۔ "تم پردیپ ہو۔ وہی پردیپ جس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنا کہا تھا۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے میری آتما نے تمہیں پہچانا ہے۔ تم وہی ہو۔ بالکل وہی۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجکماری کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ میں خاموش رہا تو راجکماری نے کہا۔

"بھگوان کے لئے پردیپ مجھے بتاؤ کہ تم اتنے دن کہاں رہے ہے۔ تم اتنے کٹھور کیسے ہوگئے ہو۔ پہلے تو تم ایسے نہ تھے، اپنی شیلا کے کارن تو تم نے ایکبار اپنے پتا (باپ) سے راج پاٹ تک چھوڑ دینے کو کہا تھا۔ پھر اب تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

راجکماری کی سسکیاں اور اس کی غزالی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو کے شبنمی قطرے مجھے روحانی کرب سے دوچار کر رہے تھے۔ میں کسی طرح بھی اس کے حسین قرب سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے لمس اور قرب نے مجھے نئی لذتوں سے دوچار کیا تھا ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ اس صحبت رنگیں کے لئے کیوں نہ میں پردیپ بن جاؤں۔ لیکن میں اس کے لئے خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ مجھے اپنی ہی یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ میرا ذہن عجیب الجھن میں گرفتار ہو کر رہ گیا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا راجکماری نے ایک جذباتی حرکت کی۔ مسہری سے نیچے اتر کر اس نے میرے پاؤں تھام لئے اور مجسم التجا بن گئی۔

"پردیپ تمہاری داسی تمہارے چرن چھو کر بنتی کرتی ہے اسے اپنے سے دور نہ کرو۔ نہیں تو میری آتما کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ میں ہمیشہ یونہی تڑپتی رہوں گی۔"

اتنی حسین لڑکی کو اپنے قدموں میں پڑا دیکھ کر میرا جسم کانپنے لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بانہوں میں تھاما اور اٹھا کر دوبارہ اپنے قریب مسہری پر بٹھا لیا۔ اس کی حسرت بھری خوبصورت آنکھیں ابھی تک میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ میرا جواب سننے کے لئے بے قرار نظر آتی تھی۔ میں نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"راجکماری میں تمہارے جذبات محسوس کر رہا ہوں مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔"

"پردیپ۔" راجکماری نے درد بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا اور بے ساختہ میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اس نے کہا۔

"تم نے اپنا حلیہ ضرور بدل لیا ہے۔ تم خود بھی بدل گئے ہو لیکن میں تمہیں ہر رنگ میں پہچان سکتی ہوں۔ پردیپ بھگوان کے لئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے یوں پریشان نہ کرو، اگر یہ مذاق ہے تو اس مذاق کو اب ختم کر دو۔ اگر تم بدل گئے ہو تو میں تمہارے لئے ہر روپ اختیار کر سکتی ہوں۔"

> ہم اس وقت جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی طرح بھی کامل نہیں کہی جاسکتی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے باوجود یہاں جنگل کا قانون جاری ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق طاقتور کمزوروں سے ناجائز فائدے اٹھانے سے باز نہیں رہتے۔ اپنی ترقی کو مقدم رکھنا، حرص اور طاقت حاصل کرنے کا خبط نہ صرف افراد بلکہ اقوام کا وتیرہ بن چکا ہے۔ اگر ہم ایک زیادہ محفوظ، پاکیزہ اور پُرمسرت دنیا پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اصلاح کا کام افراد سے شروع کرنا پڑے گا۔ اگر ہمارے نوجوان سب کو دوست بنانے، سب کی ہمہ وقت خدمت کرنے، ذاتی مفاد کو دوسروں کی بھلائی کے سامنے پس پشت ڈالنے اور خیال، الفاظ اور عمل میں تشدد سے بچنے کا سبق سیکھ لیں تو امید واثق ہے کہ عالمگیر اخوت ہمارے امکان اور دسترس میں ہوگی۔
>
> قائداعظم ـــ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۷ء

راجکماری جس وارفتگی کے عالم میں مجھ سے ہم آغوش ہوئی تھی اُس نے میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں میرا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ میں بہرحال ایک انسان تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے راجکماری کو خود سے علیحدہ کرنے کے بجائے اسے اپنے اور قریب کر لیا۔ اتنے قریب کہ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں آپس میں مدغم ہونے لگیں۔ راجکماری میرے اندر جذب ہونا چاہتی تھی میری باہوں کے حلقوں میں اُسے یقیناً سکون مل رہا ہوگا۔ میرے یہاں اب کوئی گریز نہ تھا۔ جذب ہی جذب تھا۔ میں عالمِ سرمستی میں خود کو فراموش کر چکا تھا لیکن پھر معاً مجھے احساس ہُوا کہ ایک حسین عورت کے قرب نے مجھے میرے مقام سے گرا دیا ہے میں ایک عظیم گناہ کا مرتکب ہو رہا ہُوں۔ میرے دل کے نہاں خانوں سے ایک گھُٹی گھُٹی مگر واضح آواز اُبھری۔

"سنبھلو شاہد علی۔ تمہارا یہ مقام نہیں۔ اگر تمہارے قدم ڈگمگا گئے تو تمہاری عمر بھر کی عبادت اور ریاضت برباد ہو جائے گی۔ تم تاریکی کے جزو بن جاؤ گے۔ تاریکیاں جو پہلے ہی تمہارے تعاقب میں رواں ہیں۔"

مجھے اچانک ہوش آگیا۔ میں نے راجکماری کو ایک جھٹکے سے علیحدہ کیا اور تیزی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مجھے شرمندگی کا احساس شدید طور پر ہو رہا تھا۔ میں بے نیازی سے بولا۔

"راجکماری۔ سنو میں تمہارا پردیپ نہیں بلکہ شاہد علی ہُوں جسے دُنیا چھوٹے میاں صاحب کے نام سے جانتی ہے۔ تم نے مجھے بلایا تھا میں چلا آیا مگر اب میں جا رہا ہوں۔ تمہارے سکون کے لئے میں خدا سے ضرور دُعا کروں گا۔"

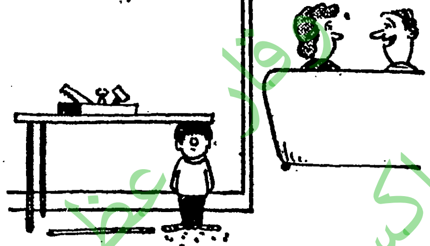
راجکماری میرے اس اچانک طرزِ عمل پر ششدر رہ گئی محبت کے بعد اچانک بے نیازی کے اس اظہار نے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ چند ساعت تک وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر مسہری سے اتر کر میرے قریب آنے لگی تو میں پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔ "تمہیں غلط فہمی ہُوئی ہے میں ایک اور شخص ہُوں۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو اور مجھ سے دُور رہو۔"

"تم کسی بھی صورت میں ہو۔ میرے پردیپ ہو۔ تم مجھے اپنے سینے میں چھپا لو۔ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔ میں اب سمجھ رہی ہُوں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" شیلا کے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں راجکماری۔ یہ گناہ ہے۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا تو راجکماری ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ میں شیلا ہوں تم مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔ بھگوان کے لئے مجھ سے دُور نہ رہو۔"

راجکماری مجھ سے التجا کرتی رہی۔ اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ میری سمت بڑھی تو میں خوفزدہ ہو کر پلٹا اور واپسی کے راستوں پر دوڑنے لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ویران راہداری میں میرے قدموں کی بازگشت میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں دوڑتا رہا۔ دوڑتا رہا۔ پھر اسی وقت رُکا، جب اپنے گوشے میں پہنچ گیا۔ میں نے خود کو کسی نہ کسی طرح بستر پر گرا دیا۔ راجکماری کو میں اپنے ذہن سے محو کر دینا چاہتا تھا مگر میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلّط ہو گیا تھا یہ سب کیا تھا۔ یہ پردیپ کون تھا جس کی شکل مجھ سے اتنی ملتی تھی کہ راجکماری دھوکا کھا گئی میرے وہاں سے رخصت ہوتے وقت



دیکھا۔ بڑھئی کے ان کھلونوں نے کیا اثر کیا۔ وہ کتنی دیر سے خاموش ہے۔

اس کی آنکھوں میں اداسیاں سمٹ آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اداسیوں کا راج تھا۔ اس کی کشادہ بانہیں مجھے حسرت بھری نظروں سے تک رہی تھیں۔ اس کے لہجے کا گداز ابھی تک میری سماعت پر طاری تھا۔ اس کا رُخ پُر درجمال کئی محرومیوں کی داستان بنا ہوا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کا جذبہ اُبھرا اور میں اس کے ساتھ اپنے طرزِ عمل پر غور کرنے لگا مجھے یہ احساس شدّت سے ستا رہا تھا کہ نہ جانے میری باتوں نے اس کے ستم زدہ دل پر کیا اثر کیا ہو؟ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ مجھے اس کو نرمی اور محبّت سے سمجھانا چاہیئے تھا لیکن میں تو خود نامعلوم جذبوں کے ہاتھوں کھلونا بن گیا تھا۔ میرے خدا۔ میرے خدا۔ مجھے مُعاف کردے۔"

میں راج کماری کی آتما کے متعلق سوچوں میں غرق تھا کہ قدموں کی آہٹ سُن کر چونکا۔ میں نے سہمی ہُوئی نظروں سے آہٹ کی سمت دیکھا۔ مجھے شبہ ہُوا تھا کہ راجکماری میرا تعاقب کرتی ہُوئی آئی ہوگی۔ لیکن جب میں نے دُرِّ شہوار کو پہچانا تو مجھے سکون آگیا۔ دُرِّ شہوار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ خلافِ معمول اس کے چہرے پر مغموم تاثرات محسوس کر کے مجھے خیال گزرا کہ کہیں دُرّی میرے اور راجکماری کے راز سے واقف تو نہیں ہوگئی؟ ایک ثانیے کے لئے میں دم بخود رہ گیا پھر اس وسوسے پر قابو پا کر بولا۔

"دُرّی۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ مجھے بتلائے بغیر۔"

"مجھے افسوس ہے کہ جاتے وقت میں آپ سے کچھ نہ کہہ سکی لیکن میں جانے پر مجبُور تھی۔" دُرِّ شہوار کا لہجہ مغموم تھا۔ "آپ اس وقت کسی عمل میں مصرُوف تھے۔ جب مجھے جانا پڑا۔ میرا ارادہ جلد آنے کا تھا مگر میں نہ آسکی۔ بادا جان کی طبیعت ناساز ہے۔ میں انہی کی مزاج پرسی کے لئے گئی تھی۔"

"ابوالحسن کی طبیعت ناساز ہے۔ کوئی زیادہ تشویش کی بات تو نہیں۔ مجھے سچ سچ بتاؤ دُرّی معاملہ کیا ہے۔"

"بس اللہ ہی اپنا رحم کرے۔" دُرِّ شہوار نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔

"خدا انہیں صحت دے۔ کاش میں وہاں ہوتا گر..."

دُرِّ شہوار میری بات کاٹ کر بولی "آپ فکرمند نہ ہوں اب پہلے سے انہیں اِفاقہ ہے۔"

میں دُرِّ شہوار کی دلجوئی کرتا رہا پھر میں نے اُسے اکبر اور ثمینہ کے بارے میں بتایا۔ اس کے بعد میں نے ان مایوسیوں کا ذکر چھیڑا جنہوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ دُرِّ شہوار سنجیدگی سے سب کچھ سنتی رہی۔ میں اس سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن ابوالحسن کی علالت کی خبر سُن کر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے مجھے امّید تھی کہ دُرِّ شہوار از خود مجھے بتائے گی کہ مجھے اپنے وظیفے میں پے درپے ناکامیاں کیوں ہو رہی ہیں۔ میں نے سرسری طور پر اس سے اپنی اُلجھن کا تذکرہ کیا۔

"یہ سب وقتی پریشانیاں ہیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دُرّی یقین کرو۔ میرے ذہن میں مختلف وسوسے اُٹھ رہے ہیں۔ مجھے یوُں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اندر کا توانا شخص مر گیا ہے۔ میں کمزور ہو گیا ہوں جیسے میں عنقریب کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔" میں نے اپنی بات واضح کی تو دُرِّ شہوار جلدی سے بولی۔

"الیاس مت سوچیئے۔ آپ کو خدا کی رحمتوں سے اتنی جلدی

3HIH
3H0
TH813
H33TH813

اگر آپ کو شک ہے کہ مندرجہ بالا رقوم کا میزان درست نہیں تو ذرا اس کے سامنے آئینہ رکھ کر دوبارہ غور فرمائیں۔

مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔"

"لیکن پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" دُرِّ شہوار نے نرمی سے کہا۔ "ذہن جب اس قدر منتشر ہو تو کسی ایک سمت کی طرف ارتکاز بھی مشکل ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ کچھ دنوں تک مکمل آرام کیجیئے۔ کسی عمل یا وظیفے کا وِرد نہ کیجیئے۔ بس خدا سے لَو لگائے رکھیئے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد آپ کو اطمینانِ قلب نصیب ہو گا۔"

"اطمینانِ قلب۔ یہ اس وقت تک ناممکن ہے دُرّی، جب تک رشیدہ، اس کے باپ اور ذکار نانھ کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "ویسے مجھے تمہاری شدید ضرورت ہے دُرّی۔"

"دُرّی ہمیشہ آپ کے ساتھ ہے۔ میں آپ کے لیئے ہمہ وقت موجود ہوں۔ البتہ باداجان کی علالت نے مجھے بھی پریشان کر دیا ہے۔ اگر مجھے آپ کی اُلجھنوں کا خیال نہ ہوتا تو، میں باداجان کو چھوڑ کر واپس نہ آتی۔"

دُرِّ شہوار کی زبانی دوبارہ ابوالحسن کی علالت کا تذکرہ سُن کر میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ اس وقت مجھے دُرِّ شہوار کو پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ میں نے کہا۔

"تم دُرست کہہ رہی ہو دُرّی۔ تمہیں اس وقت ابوالحسن کے پاس ہونا چاہیئے۔ انہیں واقعی تمہاری ضرورت ہو گی۔"

"باداجان مجھ سے ناراض ہیں۔ لیکن میرا فرض ہے کہ اس حالت میں اُن کی خدمت کروں۔" دُرِّ شہوار مضمحل آواز میں بولی۔ وُہ مجھے بیحد اداس نظر آ رہی تھی۔

میں نے اُسے یہی مشورہ دیا کہ واپس ابوالحسن کے پاس جائے اور اُن کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے، دُرِّ شہوار خاصی دیر میرے ساتھ ابوالحسن کی بیماری کی باتیں کرتی رہی، پھر بولی۔

"میں کبھی نہ جاتی لیکن میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ یہ میرا فرض بھی تو ہے، لیکن جاتے جاتے آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

"کہو دُرّی۔ کہو! میں تمہاری کسی بات کو کیسے نظرانداز کر سکتا ہوں۔"

"مجھے یقین تھا کہ آپ ایسا ہی کہیں گے۔" دُرِّ شہوار نے ایک پھیکی مسکراہٹ اپنے اُداس چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ "دیکھیئے۔ آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں آپ اس قلعے سے باہر نہیں جائیں گے، ہو سکتا ہے مجھے باداجان کے پاس دو چار دن سے بھی زیادہ لگ جائیں۔"

دُرِّ شہوار کی بات مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ میں نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی اور پوچھنے لگا۔

"دُرّی۔ کیا تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم مجھے قلعہ بند ہو کر بیٹھنے کا مشورہ کیوں دے رہی ہو؟"

"باداجان کی بیماری نے مجھے پریشان کر دیا ہے، میں ڈرتی ہوں کہ کہیں میری غیر موجودگی میں خدانخواستہ آپ بھی کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائیں۔ حالات نے مجھے کچھ بزدل بنا دیا ہے۔ نہ جانے کیوں میں سہم کر رہ گئی ہوں۔" دُرِّ شہوار نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ تاہم جب اس نے پیہم اصرار کیا تو میں نے اس سے وعدہ کیا کہ جب تک وہ واپس نہیں آئے گی۔ میں قلعے سے باہر نہیں جاؤں گا اور ایسی حالت میں جبکہ وُہ ابوالحسن کی بیماری کے باعث پہلے ہی پریشان تھی میں اس کے مشورے پر بحث کر کے یا اسکی بات رَد کر کے اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ غرضیکہ دُرِّ شہوار مجھ سے وعدہ لے کر مطمئن ہو گئی اور کچھ دیر بعد رخصت ہو گئی۔ میں اس کے جانے کے بعد دوبارہ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ ذہن تھکا ہوا تھا۔ اس لیئے جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔

دُرِّ شہوار کے جانے کے بعد دو روز تک کوئی ایسا قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا جسے لکھا جائے۔ البتہ میں نے ان دنوں میں یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ میں قلعے میں ایک قیدی کی طرح مقیّد ہو کر رہ گیا ہوں۔ ان دو دنوں میں مجھے اکبر اور ثمینہ کا خیال بھی بارہا آیا۔ قلعے کے مکین اجنّہ اکبر اور ثمینہ کو قریب کے ایک شہر میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے علاوہ ابوالحسن کی طرف سے بھی مجھے فکر تھی۔ میرا زیادہ تر وقت انہی باتوں کو سوچنے میں گزرتا۔ ایک دو بار میرا جی قلعے کے اس حصے کی طرف بھی جانے کو چاہا جہاں میں نے راجکماری شیلا کا جلوۂ جہاں افروز پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر میں اس طرف اشتیاق کے باوجود نہیں گیا۔ مجھے سب سے پہلے دُرِّ شہوار کی واپسی کا انتظار تھا۔ دو روز گزر گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئی تھی۔

تیسرے روز عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ مجھے گھٹن اور حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی مجھے ٹہلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر سے کسی عورت کے رونے اور کراہنے کی آواز آئی۔ اور قلعے کے شکستہ در و بام میں ارتعاش سا ہوا۔ دوسری بار جب وہی آواز پھر ابھری تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی عورت شدید کرب کی حالت میں مبتلا ہے۔ اتنی رات گئے وہاں کسی عورت کی آواز سن کر مجھے تعجب ہوا۔ نہ جانے وہ غریب کس مصیبت سے دوچار تھی۔ میرے قدم تیزی سے قلعے کے بیرونی دروازے کی سمت اُٹھ گئے لیکن میں دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ مجھے دُرِّ شہوار سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ میں واپسی کے ارادے سے پلٹا ہی تھا کہ پھر وہی نسوانی آواز اُبھری۔ اس بار وہ کراہنے کے بجائے بڑی اذیّت ناک آواز میں حلق پھاڑ کر چلّائی تھی، پھر اُس کی آواز یکلخت گھٹ سی گئی۔ جیسے کسی نے اسکا منہ بند کر دیا ہو۔ میں صبر نہ کر سکا۔ اور بے اختیار قلعے سے باہر آ گیا میرے ضمیر کی آواز نے دُرِّ شہوار سے کئے ہوئے وعدے پر سبقت پا لی تھی۔ میں نے یہی سوچا کہ کسی مظلوم عورت کو دیدہ و دانستہ ناگفتہ بہ حالات کے سپرد کر دینا اور اس کی مدد نہ کرنا بھی ایک عظیم گناہ ہے۔

قلعے سے باہر نکل کر میں تاریکی میں جانے پہچانے راستے پر

"تم نے"

اکثر دیکھا ہو گا کہ اکثر واعظ اور دُنیا دار حضرات مالدار اور صاحبِ جاہ و حشم لوگوں کی تعریفیں کرتے ہیں حالانکہ اس میں چار خرابیاں مدّاح کے حق میں اور دو خرابیاں ممدوح کے حق میں ہیں ——

خرابیاں مدّاح کے حق میں

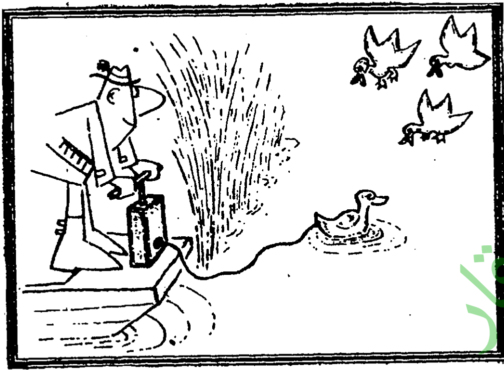
۱: تعریف میں ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جو واقعے کے خلاف ہوتی ہیں اور یہ صریح جھوٹ اور گناہِ کبیرہ ہے۔ ۲: جس محبت کا جوش و خروش سے اظہار کیا جاتا ہے وُہ دل میں نہیں ہوتی یہ صریح نفاق اور ریا ہے۔ ۳: قیاس اور گمان کے تیر چلائے جاتے ہیں مثلاً آپ بڑے متقی اور نہایت منصف ہیں' ظن اور قیاس کو یقین کا درجہ دینا عقل اور دانش کے خلاف ہے۔ ۴: کسی ظالم یا فاسق کی مدح سرائی کا یہ مطلب ہے کہ اس کا فسق و فجور کوئی معنی نہیں رکھتا جب کسی ظالم اور فاسق کی درازئ عمر کی دعا کی جاتی ہے تو گویا ظلم اور فسق کو تا دیر قائم رہنے کی دعا کی جاتی ہے جو عقل اور دین کے خلاف ہے۔

خرابیاں ممدوح کے حق میں

۱: اپنی تعریف سے ممدوح مغرور ہو جاتا ہے جو اس کی ہلاکت اور تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ رسُولِ مقبولؐ کے سامنے مجلس میں ایک شخص نے اپنے دوست کی خوب بڑھا چڑھا کر تعریفیں کیں تو آپؐ نے فرمایا کہ "تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔ اس کے نفس کی خود پسندی اور بڑائی اسے ہلاک کر دے گی"۔ ۲: اپنی تعریف سُن کر ممدوح کا نفس پھُول جاتا ہے اور اعمالِ خیر میں سُستی اختیار کرتا ہے۔ رسُولِ مقبولؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دو لیکن اس کی بے جا مدح سرائی نہ کرو۔ کند چھُری سے ذبح کر دینے میں صرف جان کا نقصان ہو گا لیکن جھوٹی مدح سرائی میں اس دُنیا کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی اور دوسری دُنیا کی زندگی بھی خسارے میں رہے گی ——"

امام غزالیؒ

دوڑتا ہوا اس سمت گیا جہاں سے عورت کی آواز سنائی دی تھی لیکن وہاں مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے ایک دو بار اونچی آواز میں "کون ہے" کی صدا بھی بلند کی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ غالباً عورت پر ظلم کرنے والے نے میرے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ پا کر کسی ٹیلے، کھنڈر یا درخت کی آڑ لے لی تھی مجھے ہَول آنے لگا۔ میں ہر قیمت پر اس مظلوم عورت کو نادیدہ شیطان کے چنگل



سے نجات دلانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ایک بار پھر اونچی آواز میں کہا "یہاں جو کوئی موجود ہے سامنے آجائے۔"
ایک لمحے تک قرب و جوار میں مکمل سکوت رہا پھر وہی نسوانی آواز قدرے دور دریا کی سمت سے ابھری اور فوراً گھٹ کر رہ گئی۔ یقیناً کوئی ظالم اس عورت کو مشق ستم بنانے کے درپے تھا۔ میں تیزی سے آواز کی سمت دوڑنے لگا۔ دریا کے قریب درختوں کی بہتات تھی اور مجھے یقین تھا کہ عورت، انہی درختوں میں سے کسی کی آڑ میں ظلم کا شکار ہو رہی ہے۔ میں نے کچھ سوچ کر پھر بلند آواز میں کہا۔
"نابکار۔ میں تجھے دیکھ چکا ہوں۔ اب چھپنا بے سود ہے۔ سامنے آجا۔"
میں اپنا جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک ایک عورت ایک درخت کی آڑ سے نکل کر "بچاؤ۔ بچاؤ۔" چلاتی ہوئی اور تیزی سے بھاگتی ہوئی میری طرف آئی اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ قبل اس کے کہ میں اس عورت سے کچھ دریافت کرتا، درختوں کے عقب سے ایک اور انسانی سایہ ابھر کر تیزی سے میری طرف آیا۔ وہ ایک لانبے قد کا شخص تھا۔ جسم گٹھا ہوا تھا چہرے پر کرختگی کے تاثرات موجود تھے۔ قریب آتے ہی وہ مجھ سے بڑے بیہودہ انداز میں بولا۔
"تم کون ہوتے ہو ہمارے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنے والے۔"
"بدبخت۔ عورت پر ہاتھ اٹھاتے تجھے شرم نہیں آتی۔ تو کیسا مرد ہے۔" میں نے طیش کی حالت میں جواب دیا اور عورت کو اپنے پیچھے کر لیا۔
"اپنا راستہ ناپو بڑے میاں۔" نووارد نے میری داڑھی کی وجہ سے اندھیرے میں میری عمر کا غلط اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "کیوں خوامخواہ میرے ہاتھوں اپنی مٹی پلید کرانا چاہتے ہو۔"
"زبان دراز، لفنگے! ٹھہر جا۔ میں ابھی تجھے بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں۔" میں غصے سے کانپتا ہوا آگے بڑھا تو نووارد میرے مقابلے پر آنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔
"کہیں آپ شاہد علی تو نہیں جو چھوٹے میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ اگر آپ وہی ہیں تو پھر میں آپ کے ساتھ کوئی نازیبا سلوک نہیں کر سکتا۔"
مجھے نووارد کی زبان سے اپنا نام سن کر تعجب ہوا میں نے بدستور کرخت لہجے میں کہا۔
"مردود۔ تجھے میرا نام کس طرح معلوم ہوا؟"
"تو کیا آپ ہی میاں صاحب ہیں؟" نووارد کے لہجے میں اس بار عقیدت تھی۔
"ہاں۔ لیکن تو کون ہے اور اس عورت کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔"
اچانک نووارد نے قہقہہ بلند کیا پھر سنجیدگی اختیار کر کے بولا۔

"بڑی مچھلی کو پھانسنے کے لئے اکثر چھوٹی مچھلی کو کانٹے میں لگانا پڑتا ہے۔ ہمیں تیری ہی تلاش تھی۔"

پھر اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دیتا نووارد نے تیز سیٹی کی آواز حلق سے نکالی اور اچانک چھ سات آدمی درختوں کی آڑ سے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ میرے لئے یہ سمجھ لینا دشوار نہ تھا کہ عورت کو مجھے پھانسنے کے لئے بطور چارہ استعمال کیا گیا تھا۔ میں اس وقت سات آٹھ آدمیوں کے نرغے میں گھر اکھڑا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا۔ لیکن میں نے ہزاروں دلوں پر حکومت کر رکھی تھی۔ ہزارہا عقیدت مند میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے پھرا کرتے تھے اور میری ایک نظر التفات کے متمنی رہتے تھے چنانچہ میں نے بلا کسی خوف و خطر کے ڈپٹ کر کہا۔

"وہ مجھ سے دور رہنا۔ کسی گھمنڈ میں مت رہنا سمجھ لو میں تنہا تم سب پر بھاری ہوں۔"

"وہ پکڑ لو اسے۔"

میرے بائیں جانب کھڑے ہوئے شخص نے کرخت آواز میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے تمام افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن بے سود۔ سات ہٹے کٹے آدمیوں نے مجھے پہلے ہی بے بس کر دیا تھا اور پھر۔ پھر میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن اس بیہوشی سے چھٹکارا نہ پا سکا۔ جو میرے ذہن پر بڑی تیزی سے غالب ہو رہی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس بیہوشی کی وجہ وہ رومال تھا جو میری ناک پر رکھا گیا تھا۔ اور اس میں سے پھوٹنے والی تیز مہک نے مجھ پر غنودگی طاری کر دی تھی۔

میرا خیال ہے میری بیہوشی کی کیفیت خاصی طویل رہی جب میرے ذہن پر طاری دھند چھٹی اور غنودگی کی کیفیت بتدریج زائل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی سخت فرش پر بے سدھ پڑا ہوں۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ میرے کانوں میں مدھم مدھم آوازیں آ رہی تھیں پھر رفتہ رفتہ یہ آوازیں صاف ہونے لگیں۔

"اس کی چنتا مت کرو ناتھو جی۔ میں نے ہر چیز کا بندوبست پہلے ہی سے کر دیا تھا۔"

یہ اونکار ناتھ کی آواز تھی۔ مجھے اپنے دماغ میں سنسناہٹ پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی لیکن یہ وقت طیش و جلال کے بجائے صبر و ضبط کا تھا۔ مجھے گزری ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ ساری باتیں اب سامنے تھیں۔ میں سمجھ گیا



کراونکار ناتھ تم نے مجھے ماتھر کے آدمیوں کے ذریعے دھوکے سے پکڑوایا ہے۔ یقیناً وہ سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا عورت کی آواز مجھے قلعے سے باہر نکالنے کی خاطر تھی۔ شاید اسی لئے درِ شہوار ابوالحسن کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر محض مجھ سے یہ وعدہ لینے آئی تھی کہ میں اس کی واپسی تک قلعے کی حدود سے قدم باہر نہ نکالوں۔ تو کیا درِ شہوار کو اس پیش آنے والے خطرے کا علم پہلے سے تھا؟ میں اگر درِ شہوار کی پس پردہ مصلحت جانتا ہوتا تو اس مصیبت سے کبھی دوچار نہ ہوتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماتھر کی آواز آئی۔

”مہاراج۔ مجھے صرف اس بات کا خدشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس کی گرفتاری کا علم ہو گیا تو شہر میں بلوا ہو جائے گا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ جائے گی۔ صورتحال سنگین نوعیت اختیار کر سکتی ہے۔“

”تم اونکار ناتھ کو نہیں سمجھے ماتھر جی۔“ اونکار ناتھ کے لہجے میں بڑا اعتماد تھا۔ ”میں ایک پجاری، پنڈت اور بہت کچھ ہونے کے علاوہ بھی اور کچھ ہوں۔ میں نے سادہ لباس والوں کو پہلے ہی ہدایت کر دی تھی کہ اس رنگیلے سیّار کو بکتر بند گاڑی میں لایا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ تم بالکل مت ہو ماتھر جی میرے ہوتے ہوئے تمہارے اوپر کوئی پریشانی نہیں آئے گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔“

”مہاراج میرا کہا مانو تو اُسے بیدار ہونے سے پیشتر ہی ختم کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شیطان جاگنے کے بعد کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دے۔“ اس بار ماتھر کے بجائے بیرسٹر راشد حسین کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”بیوقوف۔ کیسی باتیں کر رہا ہے۔“ اونکار ناتھ نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”تو بھی ابھی تک نہیں سمجھا کہ تو کس کی پناہ میں ہے۔ میرا نام اونکار ناتھ ہے۔ مت بھول کہ تو ابھی زندہ ہے، میں نے اپنے بیروں کے ذریعے اُسے مجبور و بے بس کر دیا ہے۔ پرنتو ایک بات کا سختی سے دھیان رکھنا۔ تیری بیٹی ثمینہ کو یہ نہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بھی ہمارے جال میں پھنس چکا ہے۔“

”اسے اتنا ہوش کہاں ہے مہاراج۔“ راشد حسین بھرائی ہوئی آواز میں مگر غصے سے بولا۔ ”وہ تو اس مردود اکبر کے غم میں رو رو کر پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ خدا جانے اس کمبخت نے میری معصوم بچی پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ ہر وقت بس اس کا اور اپنے قلاش شوہر کا کلمہ پڑھتی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں راشد حسین۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اکبر کی موت کے بعد پریم کی اگنی زیادہ دنوں نہیں جل سکتی۔“

میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اکبر اور ثمینہ کی بابت یہ جان کر کہ وہ بھی میری طرح مصیبت کا شکار ہوئے ہیں، میرے رگ و پے میں بجلیاں کوندگئیں۔ میں اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ خواہ حالات کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ثابت ہوں مجھے اب ہوش میں آ کر کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیئے۔ ٹھیک اسی وقت ایس پی ماتھر کہہ رہا تھا۔

”مہاراج۔ میں نے آپ کی آگیا سے ابھی تک اکبر حسین کو اپنی خفیہ قید میں رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا پتا معلوم کرنے کے لئے مجھے اس پر سختیاں بھی کرنی پڑی ہیں۔ لیکن یہ سب غیر قانونی ہے مہاراج۔ اگر بڑے افسروں کو اس کی خبر مل گئی تو“

”ان باتوں کی چنتا مت کرو ماتھر جی۔ میں نے جیسا وچار کیا ہے ویسا ہی ہوگا۔ میری شکتی کے بیر اس پاپی کو کچل کر نرکھ (دوزخ) میں جھونک دیں گے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ ہاں جب تک سارے کام پورے نہ ہو جائیں ثمینہ کو کڑی نگرانی میں رکھنا ہوگا۔“

اکبر کے سلسلے میں اونکار ناتھ کے ناپاک ارادے کا علم ہو جانے کے بعد صبر کا دامن میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت میں اونکار ناتھ، ایس پی ماتھر اور بیرسٹر راشد حسین کے درمیان فرش پر چت پڑا ہوا تھا۔ غصے کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں تمام احتیاطی تدابیر فراموش کر کے طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے ایس پی ماتھر کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہی کیفیت بیرسٹر راشد حسین کی بھی ہوئی لیکن اونکار ناتھ۔ وہ بدستور میرے روبرو سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس کی خوفناک اور سرخ سرخ آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر ہی اس کے چہرے پر

نفرت کے تاثرات پیدا ہو چکے تھے۔ میں نے ماحول کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اونکار ناتھ کے چہرے پر بڑی حقارت سے ایک نگاہ ڈالی اور کہا۔

"اونکار ناتھ تم سے کچھ نہ ہو سکا تو تم نے یہ گھٹیا حرکت کی۔ میں سمجھتا ہوں تم اس میں کامیاب ضرور ہو گئے۔ مگر تمہیں شرم ضرور آ رہی ہوگی۔ اگر تمہارے اندر ذرا بھی غیرت ہوتی تو خود میرے سامنے آ جاتے۔"

"سچ کہا تم نے شاہد میاں" اونکار ناتھ زہر خند سے بولا "مجھ سے بڑی بھول ہوئی جو میں یہ سمجھ بیٹھا کہ آپ جیسا مہان بزرگ ایک عورت کے چکّر میں آ جائے گا"

"تم بہت اچھی اور ایسی باتیں کر رہے ہو جو تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ تم ایک عالم بھی ہو۔ یہ بات میں تمہیں یاد دلاتا ہوں" میں نے بدستور غصیلی آواز میں کہا۔ "رہا مقابلے کا سوال۔ تو میں تمہیں مقابلے کی دعوت دیتا ہوں۔ جب جی میں آئے خود کو آزما کر دیکھ لو"

"کہاں مہاراج" اونکار ناتھ نے سہما ہوا لہجہ بنا کر جواب دیا۔ "اب میں اتنا مورکھ بھی نہیں جو آپ جیسی بلند ہستی سے مقابلہ کر کے اپنا کریا کرم کراؤں گا۔ میں تو آپ کا چیلا ہوں مہاراج اگر مجھ سے کوئی بھول ہوئی ہو تو مجھے شما کر دیجئے"

یہ محسوس کر کے کہ ایک نابکار پنڈت میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہے اور سفلہ پن پر اتر آیا ہے۔ میں بری طرح تلملا اٹھا اور گرجدار آواز میں بولا۔

"پنڈت۔ اپنے دماغ سے یہ بات نکال دو کہ تم اپنے اس کھیل میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم کتنے دنوں چارپائی پر پڑے رہے ہو۔ کیا تم یہ بھی بھول گئے کہ میرے موکلوں نے تمہاری زندگی ــــ حرام کر دی تھی۔ تم خود کو سمجھو اونکار ناتھ خود کو پہچانو۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے"

"شاہد علی" اونکار ناتھ کے بجائے ایس پی ماتھر نے غراتے ہوئے کہا "میں تمہارا بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ لیکن اب اگر تم نے مہاراج کی شان میں کچھ کہا تو۔"

"تم درمیان میں مت بولو ماتھر جی" اونکار ناتھ نے ہاتھ اٹھا کر ماتھر کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا پھر بگڑتے ہوئے تیور سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔ "مسلے! تو نے میرا اپمان کیا ہے۔ میرا مذاق اڑایا

ہے۔ میں تجھے بتاؤں کہ میں کیا ہوں۔ میں تجھے ہاتھ باندھ کر معافی مانگنے پر مجبور نہ کر دوں تو میرا نام اونکار ناتھ نہیں۔"

"میں۔ اور تجھ جیسے بے دین کے آگے ہاتھ باندھوں گا، حد سے مت گزر۔" میں نے تڑخ کر کہا۔ "میں بُت فروش نہیں بُت شکن ہوں پنڈت۔ میرے ساتھ میری پوری تاریخ ہے۔"

"میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" ایس پی ماتھر نے گرج کر کہا، لیکن وُہ ابھی تک مجھ سے دُور دُور ہی تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر غصّے اور بوکھلاہٹ کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ میں نے ماتھر سے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن اونکار ناتھ بول پڑا۔

"سنو شاہد علی۔ اگر تمہیں اپنا جیون پیارا ہے تو جو کچھ میں کہتا ہوں اُسے غور سے سنو۔ تم میرے اور میرے مندروں کے چرن چھو کر شما کی بھکشا مانگو۔ تمہاری مکتی کا کیول یہی ایک طریقہ ہے۔ پرنتو اگر تم نے اکڑفوں سے کام لیا تو پھر تمہیں سارا جیون پچھتانا پڑے گا۔"

"کمینے۔ تیری یہ مجال۔" میں آپے سے باہر ہو کر اونکار ناتھ کی طرف جھپٹا۔ میرا ارادہ تھا کہ آج اس نابکار پنڈت کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ہی دم لوں گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے کچھ غیر مرئی قوتوں نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ میں اس اچانک افتاد سے بوکھلا گیا۔ میں نے خود کو ان شیطانی قوتوں سے آزاد کرانے کی خاطر بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن میری ایک نہ چلی۔ میں نے جلدی سے دو چار آزمودہ وظائف کا سہارا بھی لیا مگر وہ بھی بے سُود ثابت ہُوئے۔ میں جن غیر مرئی قوتوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔

مجھے اپنا سانس اپنے سینے میں گھٹتا ہُوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے مرتبے کا خیال آیا اور ایک مردود شخص کے مقابلے میں اپنی ناکامی کا احساس ہوا تو میری آنکھیں بھر آئیں۔ ایس پی ماتھر اور بیرسٹر راشد حسین مجھے اونکار ناتھ پر جھپٹتا دیکھ کر پہلے تو چونکے تھے۔ لیکن اب میری مضحکہ خیز کیفیتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اونکار ناتھ جس کا داؤ میرے اوپر چل چکا تھا۔ بڑی تضحیک آمیز سنجیدگی سے مجھے مخاطب کر کے بولا۔

"کیا ہُوا میاں صاحب جی۔ آپ رُک گئے۔ مگر کیوں؟ کیا آپ کو میرے اوپر دیا آ گئی؟"

میں نے ایک بار پھر اپنی تمام قوتوں کو جمع کر کے خود کو آزاد کرانا چاہا مگر محض تڑپ کر رہ گیا۔ بولنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہُوا جیسے میری قوتِ گویائی بھی سلب ہو کر رہ گئی ہے، اونکار ناتھ نے کہا۔

"کچھ تو بولئے میاں صاحب۔ ایسی بھی کیا ناراضگی۔"

میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ کچھ کرنے یا کہنے کا یارا کہاں تھا۔ میں بے بس کھڑا سنتا رہا۔ اونکار ناتھ بڑی دیر تک میری بے بسی پر قہقہے لگاتا رہا پھر اس نے ماتھر کو مخاطب کر کے کہا۔

"ماتھر جی۔ تم نے دیکھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب میں نے اسے کیسا کاٹھ کا اُلّو بنا دیا ہے۔ اب یہ بالکل لاچار ہے۔ بنا میری آگیا کے ایک حرکت بھی نہیں کر سکتا۔"

"مہاراج۔" راشد حسین نے مجھے نفرت سے گھورتے ہوئے اونکار ناتھ سے کہا۔ "کیا آپ ثمینہ کی دیوانگی کا کوئی علاج نہیں کر سکتے۔ اگر اس کی یہی کیفیت رہی تو وہ مر جائے گی مہاراج۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا راشد حسین پرنتو پہلے مجھے اس میاں جی کا بندوبست کر لینے دو۔" اونکار ناتھ نے کہا۔ پھر وہ دوبارہ ایس پی ماتھر سے مخاطب ہُوا۔ "اب یہ تمہارا شکار ہے اسے حوالات بھیج دو۔ اس پر زناکاری کا الزام ثابت کرنے میں وہ عورت تمہارے بڑے کام کی ثابت ہوگی۔ جس نے اسے پکڑنے میں حصّہ لیا تھا۔"

"جو حکم۔ مہاراج۔" ماتھر نے رُک رُک کر جملہ پُورا کیا۔ اونکار ناتھ سے وہ بہت زیادہ مرعوب نظر آتا تھا۔

میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سُن رہا تھا۔ محسوس کر رہا تھا لیکن میرے اندر کی تمام متحرک قوتوں کو جیسے زنگ لگ گیا تھا۔ میں کوئی جوابی کارروائی کرنے سے لاچار تھا۔ ماتھر اونکار ناتھ کا اشارہ پا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد واپس ہوا تو اُس کے ساتھ چار سادہ لباس والے بھی تھے ـــــ ماتھر، ایک شخص کو جو سب سے آگے تھا اور جس کی نگاہوں سے کینہ توزی

جھلک رہی تھی، مخاطب کر کے بولا۔

"شرما جی۔ تم اسے اپنی نگرانی میں لے جا کر حوالات میں بند کرا دو۔ عورت کا بیان اور ڈاکٹری معائنے کی رپورٹ صبح تک تیار کرا لی جائے گی۔"

"بہتر ہے سر۔" شرما نے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ تھانے کے انچارج کو سختی سے ہدایت کر دینا کہ جب تک میں اجازت نہ دوں کسی شخص کو اس سے نہ ملنے دیا جائے اور اسے علیحدہ حوالات میں رکھا جائے۔ دوسری بات یہ کہ تم اسے حوالات تک لے جانے کے لئے قیدیوں والی پولیس وین استعمال کروگے۔ اپنے ساتھ اگر چاہو تو دو چار اور مسلح سپاہیوں کو لے لو۔ مگر یہ سارا کام بڑی رازداری سے ہونا چاہیے۔ جب تک کاغذات تیار نہ ہو جائیں، کسی کو اس کی بھنک بھی نہیں ملنی چاہیئے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سر۔" شرما نے سنجیدگی سے کہا۔

شرما کے اشارے پر اس کے بقیہ تین ساتھیوں نے آگے بڑھ کر مجھے گھیر لیا۔ پھر ایک سادہ لباس والے نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں ـــ میں اُف بھی نہ کر سکا۔ اونکار ناتھ بدستور سینہ تانے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب سادہ لباس والے مجھے لے جانے لگے تو اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"شاہد علی۔ کیا اب تمہیں اندازہ ہوا کہ تم نے میرے بارے میں کتنے غلط اندازے قائم کئے تھے۔ تم نے بڑی حماقت کی۔"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن الفاظ جیسے میرے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ میرے اوپر اب تک کچھ غیر مرئی شیطانی قوتوں کا تسلط تھا، میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی مفقود ہو چکی تھیں۔ میں خاموشی سے سادہ لباس والوں کے ساتھ باہر نکلا اور راہداری سے گزرتا ہوا باہر آگیا جہاں پولیس کے بہت سارے مسلح جوان موجود تھے۔ ماتھر کے دروازے سے قیدیوں والی گاڑی تک لے جانے کے لئے میرے جسم کے اوپری حصے پر ایک سیاہ کپڑا ڈال دیا گیا تاکہ باہر کا کوئی شخص میری ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد مجھے پولیس وین میں پچھلی سمت بٹھا کر باہر سے دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ چند لمحوں بعد وین حرکت میں آگئی میں اب حوالات کی سمت جا رہا تھا۔ سیاہ کپڑے کی وجہ سے مجھے شدید گھٹن ہو رہی تھی۔ میں باہر کی کسی چیز کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ مجھے ان راستوں کا بھی علم نہ ہو سکا جن پر وین چل رہی تھی۔

تھانے پہنچ کر مجھے ایس پی ماتھر کی ہدایت کے مطابق ایک علیحدہ حوالات میں بند کیا گیا اور ایک سنگین بردار سپاہی کو دروازے پر تعینات کر دیا گیا۔ شرما نے جاتے وقت تھانے کے ڈیوٹی آفیسر کو بڑی سختی سے ہدایت کی تھی کہ اس حوالات کی طرف کسی سپاہی کو بھی جانے کی اجازت نہ دی جائے۔

رات گئے تک میں جاگتا رہا۔ حوالات کی ٹھوس زمین پر بیٹھے بیٹھے میری کمر دُکھنے لگی تھی اس لئے میں تھک کر فرش پر لیٹ گیا۔

گھری تاریکی کے سبب مجھے اُلجھن ہونے لگی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر کب میری آنکھ لگی مجھے کچھ پتا نہ چل سکا۔ دوسری بار میری آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی میرا بازو تھامے مجھے آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو دم بخود رہ گیا۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ حوالات میں میرے قریب اس وقت وہی راجکماری شیلا سوگوار بیٹھی تھی جسے میں نے قلعے کے ویران گوشے میں دیکھا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے راجکماری کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے یاقوتی لبوں کو جنبش ہوئی اور اس کی مترنم مگر مغموم آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی۔

"پردیپ۔ صرف تمہارے کارن آج صدیوں بعد میں قلعے کے ویران گوشے سے نکل کر یہاں تک آئی ہوں۔ تمہارے اوپر جو بپتا پڑی ہے اس کی خبر سن کر میں بیاکل ہوگئی۔ میں تمہاری سہاتا کرنے یہاں آئی ہوں پردیپ۔"

شیلا کے لہجے میں پیار کی کسک موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے سینکڑوں دیپ روشن نظر آرہے تھے۔ اس کا ہوش رُبا جمال قید خانے میں بھی میرے دل کو گرما رہا تھا لیکن میں بولنے سے قاصر تھا۔

"تم چپ کیوں ہو پردیپ۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم نے دوسرا جنم لے لیا ہے اور پہلے جنم کی تمام باتیں اور۔ اپنی شیلا کو بھی بھول گئے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ میں راجکماری کی دل شکنی نہیں چاہتا تھا۔ میری نظریں اس کے معصوم چہرے پر جمی رہیں۔ شیلا نے مجھ سے جواب نہ پاکر ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

"میرے بھاگ میں یہی لکھا تھا پردیپ۔ میں اب نراش ہوچکی ہوں۔ میری آتما کتنی بے چین رہی ہے تم کیا جانو۔ تم نہیں جان سکتے پردیپ۔ تم نے تو سب کچھ بھلا دیا۔ سب کچھ۔"

میں شیلا کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کیا۔ یہ بات کہنے میں اب مجھے عار نہیں۔ اس کے حسن اور اس کی معصومیت نے مجھے اپنے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ میں اس سے خوبصورت اور شگفتہ گفتگو کرنے کو بے چین تھا میں کہنا چاہتا تھا کہ اس کی خاطر میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں اس کی روح کی بے قراری دور کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا لینا چاہتا تھا لیکن حالات نے مجھے اس قدر بے بس کر دیا تھا کہ میں کھل کر کسی جذبے کے اظہار سے قاصر تھا۔ شیلا کی آنکھوں میں اداسیوں کا راج تھا۔ وہ بڑی مغموم نظر آرہی تھی۔ میں اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ اس کے چہرے سے لگا رہا تھا۔

چند ثانیے تک حوالات میں سناٹا طاری رہا پھر شیلا بولی۔

"پردیپ۔ اب تمہیں دوش دینے سے کیا حاصل۔ بھگوان نے یہ ستم کیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کروں۔ تم اب بھی میرے لئے پردیپ ہو۔ یہ بھاگ کا پھیر ہے پر میں ابھی تک تمہیں اپنا دیوتا بنائے تمہاری پوجا کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں سے نکلتے ہی پھر مجھ سے دور بھاگنے کی کوشش کرو گے۔ لیکن تم میرے ہو۔ میں اور انتظار کروں گی بتاؤ اپنی داسی سے تم کیا کام لینا چاہتے ہو۔"

شیلا اتنا کہہ کر رونے لگی تو میں بھی رونے لگا۔ اسکی پلکوں کی اوٹ سے اُبھرنے والے آنسو جو اسکے گالوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے دامن میں جذب ہو رہے تھے۔ میری بے بسی کے لئے تازیانہ ثابت ہو رہے تھے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس وقت ہر احتیاط سے منہ موڑ کر شیلا کی زلفوں میں خود کو چھپا لیتا۔ اس کے آنسوؤں کو یوں نہ بہنے دیتا۔ اپنا مافی الضمیر سمجھانے کی خاطر میں نے گردن کو نفی میں جنبش دینی شروع کر دی۔ میں اشارے سے اسے یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ گریہ بند کر دے اور اپنے آنسوؤں کو خشک کر لے۔ مگر اس نے میرے اشارے سے کا کچھ اور مطلب نکالا اور تڑپ کر بولی۔

"تم مجھ سے کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے۔ میں جا رہی ہوں پردیپ۔ تم خوش رہو۔ میں اب جا رہی ہوں۔ شاید میری صورت دیکھ کر تمہیں دکھ ہوتا ہے۔ میں اب بھی تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے وشواس ہے کبھی نہ کبھی تمہیں میرا خیال ضرور آئے گا۔

تمہیں سب یاد آجائے گا۔"

اور پھر قبل اس کے کہ میں شیلا کو اپنا مقصد سمجھانے کے لئے کوئی دوسرا اشارہ کرتا وہ بڑی تیزی سے تاریکیوں میں مدغم ہو گئی۔ میرے دل سے ہوک اٹھ کر لبوں تک آ گئی۔ میں نے اپنا سر زمین پر مارنا شروع کر دیا۔

وہ رات، مجھے خوب یاد ہے، وہ رات میں نے بڑے کرب کے عالم میں بسر کی۔ ایک لمحے کے لئے بھی نیند نہیں آئی۔ راجکماری کا اداس چہرہ تمام رات میرے تصور میں رہا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے میں اسے ایک عرصے سے جانتا ہوں جیسے وہ میرے بہت قریب رہ چکی ہو۔ اتنا قریب کہ اب اس کی ایک لمحے کی جدائی بھی منظور نہیں تھی۔

میں ساری رات راجکماری کے خیال میں گم رہا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میں اونکار ناتھ کے شیطانی چکروں سے آزاد ہوا تو راجکماری سے ضرور ملوں گا۔ اس کی بے قرار روح کو قرار بخشوں گا اور شیلا کو بتاؤں گا کہ — تیری روٹھی ہوئی صدیاں تجھ سے من گئی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ اس قید و بند میں بھی تمام رات میں شیلا کے سلسلے میں منصوبے بناتا اور توڑتا رہا۔ رات اسی طرح گزر گئی جب صبح ہوئی تو گردش حالات نے ایک بار پھر مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

حوالات میں سب سے پہلے شرما داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے تاثرات ابھر رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ مجھے حاکمانہ نظروں سے گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں بولا۔

"شاہد علی — دو گھنٹے بعد تمہیں مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ تمہارے اوپر ایک ہندو لڑکی کلپنا کی آبروریزی کا الزام ہے۔ تم اسے رات گئے شہر سے اغوا کر کے لے گئے تھے بعد میں تم نے اسے اپنی ہوسناکیوں کا نشانہ بنایا۔ کلپنا کا بیان اور ڈاکٹری رپورٹ تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ لیکن اس سمے میں تم سے ایک خاص بات کہنے آیا ہوں اگر تم نے مجسٹریٹ کے سامنے زبان کھولی اور الزام کی تردید میں کچھ کہا تو ایس پی ماتھر تمہیں خطرناک حالات سے دوچار کر دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ جو اذیتناک تشدد وہ تم پر کریں وہ عدالت کی سزا سے زیادہ بھیانک ہو اس لئے میں تاکید کرتا ہوں کہ تم مجسٹریٹ کے سامنے اپنی گندی زبان بند ہی رکھنا۔ اسی میں تمہاری مکتی ہے۔"

میں اس مردود کی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتا جبکہ ابھی تک غیر مرئی اور شیطانی قوتوں نے میری زبان بند کر رکھی تھی۔ میرا دل آنے والے خطروں کے پیش نظر دھڑکنے لگا میں یہ سوچ کر تڑپ اٹھا کہ اگر عدالت کے روبرو بھی میری یہی کیفیت رہی اور میں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکا تو میری خاموشی کو یقینی طور پر اعتراف گناہ پر محمول کیا جائے گا اور پھر —

"بولتا کیوں نہیں ہے" شرما کی گرجدار آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ "کیا تو نے سن لیا کہ میں تجھ سے کیا کہہ رہا ہوں؟"

میں نے جلدی سے اثبات میں سر کو جنبش دی تو شرما کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ ابھر آئی۔ مجھے نفرت سے گھور کر تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔

"تمہارے کرتوت کی کہانی جب اخبارات میں چھپے گی تو تمہارے چیلے چپاٹے شور مچانے کے بجائے تم سے نفرت کرنے لگیں گے دنیا جان جائے گی کہ تم نے اپنی مہان شکتی کا ڈھونگ کس لئے رچایا تھا۔"

شرما اتنا کہہ کر چلا گیا تو بے بسی اور مستقبل میں ہونے والی ذلت

کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ جو کچھ شرما نے کہا تھا اگر وہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا تو میرے عقیدت مند یقیناً مجھ پر افسوس کرنے کے بجائے میرے کردار پر تھوتھو کریں گے۔ میرا نام بڑی حقارت سے لیا جائے گا۔ میری برسوں کی عبادت اور ریاضت خاک میں مل جائے گی اور کیا عجب ہے کہ لوگ میرے نام کے ساتھ ساتھ میاں صاحب کی ذاتِ بابرکات پر بھی انگلیاں اٹھانی شروع کر دیں۔

پریشان خیالات کا ایک ہجوم مجھے مضطرب کر رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات سے کیونکر چھٹکارا حاصل کروں۔ میں بےچین ہو کر حوالات میں ٹہلنے لگا۔ کبھی ابوالحسن کی نصیحتیں میرے کانوں میں گونجنے لگتیں کبھی مجھے اکبر کے قیمتی مشوروں کا خیال آتا اور کبھی درشہوار کی باتیں ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج اٹھتیں۔

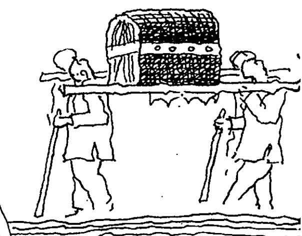
میری حالت ابتر ہونے لگی۔ ذہن ماؤف ہونے لگا۔ مجھے اکبر کا خیال بار بار پریشان کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ غریب کس حال میں ہو اور اس پر کیا کیا ظلم توڑے جا رہے ہوں اور مجھے یہ احساس زیادہ مضمحل کئے دے رہا تھا کہ اکبر میری وجہ سے صعوبتوں کا شکار ہوا ہے ورنہ اس کی اور اوزکار ناتھ کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ اس غریب کا مستقبل بھی میری وجہ سے تباہیوں میں تھا۔ یکے بعد دیگرے مختلف خیالات اور تصورات نے میرے ہوش و حواس گم کر دیئے تھے۔ پھر اچانک میرے تصورات میں راجکماری شیلا کا تصوراتی ہیولا ابھر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آسمانوں کی سمت اڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کے حسین چہرے پر بلا کا تقدس اور معصومیت ہے۔ پھر میں نے خود کو اس کے پیچھے جاتا محسوس کیا لیکن وہ میری دسترس سے بہت دور بادلوں میں پرواز کر رہی تھی۔ میں ابھی اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ کہیں سے ایک سفید گدھ خون میں لتھڑا ہوا ادھر سے گزرا۔ اکبر کا خواب مجھے یاد آنے لگا۔ اس خیال سے کہ میاں صاحب نے بھی مجھے گدھ کے ہاتھوں نجات نہیں دلائی تھی میرا دل ڈوبنے لگا۔ یقیناً مجھ سے بڑی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔ میں نے ابوالحسن، اکبر اور درشہوار کے مشوروں کو ٹھکرا کر جو قدم جلدبازی میں اٹھائے آج انہی کی سزا مجھے مل رہی تھی میں نے پہاڑی کو چھوڑ کر علم و فضل کو رسوا کیا۔ میں نے اپنے مرتبے کو فراموش کر کے ذاتی اغراض اور سرکش نفس کے فریب میں آ کر خود کو تباہ کر لیا تھا۔ میں نے احکامِ الٰہی کو نظرانداز کیا تھا۔ جو کچھ میں کرتا رہا وہ کسی عالمِ باعمل کے منصب کے شایانِ شان نہیں تھا۔ جب میں نے دنیا سے کنارہ کشی کر کے ربّ العزّت سے رشتہ جوڑا تھا تو مجھے فیصلے خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں تھے۔ وہ منصف ہے، وہ حق کا امین ہے۔ میں نے خود کو کھو دیا۔ میں نے میاں صاحب کے مرتبے کا بھی خیال نہ کیا۔ یہ میں نے کیا کیا۔ پر اب وقت گزر چکا تھا۔

حوالات کا دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا کہ شرما تین چار سنگین بردار سپاہیوں کے ساتھ حوالات میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا ہولناک مستقبل میرے سامنے تھا میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ شرما نے ایک بار پھر مجھے کرخت لہجے میں تاکید کی کہ مجسٹریٹ کے روبرو مجھے اپنی زبان بند رکھنی ہو گی۔ اس کے بعد ایک سادہ لباس والا اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں وہی سیاہ کپڑا موجود تھا جو رات میرے چہرے پر ڈالا گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ایس پی ماتھر اور اس کے گرگے مجسٹریٹ کے فیصلے تک مجھے لوگوں کی نظروں سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر میرے معاملات قبل از وقت منظرِ عام پر آ گئے تو نقصِ امن کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

شرما کے اشارے پر جب سادے لباس والا سیاہ کپڑا لے کر میری سمت بڑھا تو میرے دل پر ایک ضرب سی لگی۔ میں پتھرائی ہوئی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ حوالات کے دروازے کی سمت اٹھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے جسم میں حرارت کے اثرات پیدا ہونے لگے۔ میں نے درشہوار کو حوالات کے دروازے پر کھڑے دیکھا جو بڑی قہر آلود نظروں سے شرما اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے میں امید کی ایک کرن چمکی تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں اور میرے قدم مضبوطی سے زمین پر جم رہے ہیں۔



میاں شاہد علی پر آگے کیا گزری ہے؟ ’غلام روحیں‘ کے پُراسرار واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے





نوشادی بیگم کی شادیاں

۱۹۲۲ء کی ایک جرائم رپورٹ

قارئین۔ یہ کوئی کہانی نہیں ایک دلچسپ اور عبرتناک واقعہ ہے۔ جو ۱۹۲۵ء میں پیش آیا۔ اسے جناب سراج احمد چشتی (مرحوم) نے تحریر کیا ہے جو اس زمانے میں یوپی کی پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ واقعہ ہفت روزہ انجام دہلی کے ۵ جون ۱۹۴۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

سال ۱۹۲۳ء کا زمانہ ہے۔ ابتدائی جاڑوں کا ہلکا گلابی موسم جمعہ کا دن شہر آگرہ کی جامع مسجد کے شمالی دروازے کے پاس ایک سیاہ برقعہ پوش عورت تنہا بڑی دیر سے بیٹھی ہے۔ لوگ آتے جاتے اُسے دیکھتے ہیں۔ برقعہ کی جالی میں سے آنکھ ناک کی چمک دکھائی دینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جوان العمر اور اچھے گھرانے کی ہے۔ مگر کسی کے سامنے نہ دستِ سوال دراز کرتی ہے اور نہ کچھ کہتی ہے لوگ اُس کی طرف غور سے اور شوق سے دیکھتے ہیں مگر وُہ کسی کی طرف متوجّہ نہیں ہوتی۔ نماز ختم ہوگئی اور مسجد قریب قریب خالی ہوگئی مگر وُہ یکساں بیٹھی رہی۔ اس طرف بازار میں قریب ہی سامنے ایک تمباکو والے کی دکان ہے، جسے خان صاحب کے نام سے پکارتے ہیں

دکان پر خان صاحب مع اپنے چند دوستوں کے حقہ پی رہے ہیں اور اس عورت کے متعلق چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ آخر طے ہوا کہ اس عورت سے اس کا حال پوچھنا چاہیئے۔ اس کام کے لئے ایک چرب زبان کو جسے میر صاحب کہا کرتے تھے بھیجا گیا اور انہوں نے جا کر اس عورت سے یوں گفت گو کی۔

"آپ کون ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟ اتنی دیر سے یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ نہ کسی سے سوال کرتی ہیں۔ خیر تو ہے، آخر ماجرا کیا ہے؟"

"میں ایک مصیبت زدہ قسمت کی ماری، لاچار پردیسن ہوں رہنے والی تو علی گڑھ کی ہوں۔ مگر میرے شوہر اجمیر شریف میں ریلوے میں بابو تھے، اجمیر شریف ہی میں رہا کرتی تھی عرصہ چار ماہ کا ہوا میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ عدت کے دن پورے کر کے خالی ہاتھ وطن جانے کے لئے چل کھڑی ہوئی ہوں۔ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ شوہر کی بیماری میں خرچ ہو گیا۔ یہاں تک تو آ پہنچی آگے اللہ مالک ہے۔ جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی۔" عورت کے اندازِ گفت گو اور لب و لہجہ سے معلوم ہوا کہ شریف و شائستہ عورت ہے فلک زدہ ہے۔ اُس کی گفتگو سے بیچارگی اور بے کسی کا اظہار ہوتا تھا۔

میر صاحب خوش خوش، خان صاحب کے پاس آئے اور بولے "عورت جوان ہے۔ حسین بھی معلوم ہوتی ہے، بڑی پیاری بولی ہے۔ کسی شریف گھرانے کی ہے۔ حال ہی میں بیوہ ہوئی ہے، کوئی اولاد وغیرہ بھی نہیں ہے۔ تنہا بے یار و مددگار۔ اپنے گھر علی گڑھ واپس اجمیر سے جا رہی ہے۔ لو یار تم ہو تو خوش نصیب، تمہیں ایسی ہی عورت کی تلاش تھی۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔ گھر بیٹھے مراد مل گئی۔"

ان خان صاحب کی بیوی کا بھی حال ہی میں انتقال ہوا تھا ادھیڑ عمر کے آدمی تھے اور خوشحال تھے۔ دکان خوب ٹھاٹھ سے چل رہی تھی۔ خوش وضع اور خوش شکل بھی تھے، اُن ہی کی دکان کے سامنے یہ عورت دیر سے بیٹھی قسمت آزمائی کر رہی تھی۔ تجویز ہوئی کہ خان صاحب سے شادی کرنے کا پیغام اس عورت کو دینا چاہیئے۔ چنانچہ میر صاحب ہی کو مامور کیا گیا۔ وہ دوبارہ جا کر اس عورت سے یوں گویا ہوئے۔

"بیگم! تمہاری رُوداد سُن کر ہم سب کو نہایت قلق ہے تم ابھی ماشاء اللہ جوان ہو تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، یوں بے سر و سامانی اور پریشانی میں مارے مارے پھرنے سے تو بہتر یہ ہے کہ تم ہماری ایک نیک صلاح مانو اور بموجب حکمِ شرع اپنا عقدِ ثانی کر لو۔ ورنہ زمانہ بہت نازک ہے۔ آگے نہ جانے کیا آفت پیش آئے۔ یہ سامنے والے خان صاحب دکاندار اللہ کے فضل سے خوب خوش حال اور تندرست خوبرو جوان ہیں۔ حال ہی میں اُن کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ بھی دوبارہ گھر آباد کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ بھی شریف ہیں اور تم بھی شریف ہو۔ بسم اللہ کر کے ان سے نکاح پڑھا لو اور چین سے زندگی بسر کرو۔"

مسافرہ نے خاموش رہ کر گردن جھکا لی اور چند ٹھنڈی سانسیں لیں پھر بولی "تقدیر میں دربدر کی ٹھوکریں کھانا ہی لکھا ہے۔ مقدر میں جو لکھا ہے وہ ہوگا" اور یہ کہہ کر پھر خاموش ہو گئی۔

میر صاحب بولے "خاموشی نیم رضا" اور آواز دے کر خان صاحب سے مخاطب ہوئے "مبارک ہو مبارک، خانہ آبادا الحمد للہ" عورت نے شرم سے گردن نیچی کر لی اور اصرار کرنے پر سر کی جنبش سے ہاں بھر لی۔

بس بات طے ہو گئی۔ قصہ مختصر تانگے میں سوار ہو کر خان صاحب کے مکان پر لائے۔ نکاح کی تیاریاں ہو گئیں۔ خان صاحب کے رشتے کی عورتوں نے دیکھ کر صورت شکل پسند کر لی اور اسی شب بعدِ عشا قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا اور دونوں میاں بیوی خوشی خوشی رہنے لگے۔ شادی کو دو ہفتے گزرنے کے بعد ایک دن بیوی نے خان صاحب سے کہا کہ "میرا طلائی زیور تین ہزار روپے کی مالیت کا ہے جو میں نے اپنے شوہر کی بیماری میں علاج معالجے کے لئے پانچ سو روپے میں رہن رکھ دیا تھا اگر جلد نہ چھڑایا گیا تو ڈوب جائے گا۔ کیا اچھا ہو کہ تم مجھے ساتھ لے جا کر اس زیور کو چھڑا لاؤ۔"

خان صاحب فوراً ہی راضی ہو گئے اور دو تین دن بعد پانچ سو روپے سینے میں اپنی کمر سے باندھ کر بیگم کو ساتھ لے کر رات کی آٹھ

بجے کی گاڑی سے آگرہ فورٹ اسٹیشن والی چھوٹی لائن سے علی گڑھ جانے کے لئے سوار ہو کر رات کو مینڈھو یعنی ہاتھرس جنکشن کے اسٹیشن پر اُترے کہ یہاں سے صبح گاڑی بدل کر بڑی لائن سے علی گڑھ جائیں گے۔ لہٰذا بڑی لائن کے مسافر خانے میں بستر بچھا کر ٹھہر گئے۔ بیگم نے پاندان سے پان بنا کر خود کھایا اور پھر خان صاحب کو بھی کھلایا۔ تھوڑی دیر بعد خان صاحب پر غنودگی طاری ہو گئی۔ لیٹ کر غافل ہو گئے۔

صبح ہو چکی۔ علی گڑھ جانے والی ٹرین بھی دیر ہوئی جا چکی۔ مسافر خانہ خالی ہو چکا مگر تنہا ایک مسافر بے خبر پڑا سو رہا تھا پولیس کانسٹیبل نے ہر چند اُسے جگایا۔ جھنجھوڑا۔ مگر بے اثر سوائے دری بچھونے کے کچھ سامان اس کے پاس نہیں تھا نبض دیکھی، سانس دیکھی معلوم ہوا کہ بیہوش ہے۔ ریلوے پولیس کے تھانے میں رپورٹ درج کرا کر خان صاحب کو بیہوشی کے عالم میں معائنے کے لئے اسپتال بھیجا گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ کوئی زہر دیا گیا ہے جس کے اثر سے بیہوش ہیں۔"

علاج معالجے کے بعد جب خان صاحب کو ہوش آیا تو پوچھنے لگے کہ "میں کہاں ہوں۔ میری بیوی کہاں ہے" مگر ٹٹول کر سبنی دیکھی۔ دیکھا غائب ہے۔ چلّا اٹھے کہ "ہائے میری سبنی ہائے میرے پانچ سو روپے۔ ہائے میری بیوی۔"

جب اُن کو یہ بتایا گیا کہ وہ صبح مسافر خانے میں تن تنہا بیہوش پڑے ملے تھے تو وہ بیان دینے کے قابل ہوئے، اور ساری سرگزشت لکھائی۔ اب اُن پر کھل چکا تھا کہ یہ اُن کی نئی بیگم کے کرتوت ہیں۔ مقدمہ زہر خورانی اور سرقہ بنام مسماۃ حسینی بیگم ریلوے پولیس میں قائم ہو کر تفتیش شروع ہوئی مگر ملزمہ کا کوئی سُراغ نہیں ملا اور اس وقوعے کی مختصر کیفیت پولیس کے گزٹ میں جو الٰہ آباد سے نکلتا تھا، شائع ہوئی۔

پھر یہ اُترتے جاڑوں کا زمانہ ہے۔ شہر قنوج میں جہاں کا عطر اور تیل بہت مشہور ہے۔ جمعہ کے دن ایک سیاہ برقعہ پوش نوجوان عورت جامع مسجد کے دروازے کے پاس تنہا بیٹھی ہوئی ہے نہ کسی سے کچھ سوال کرتی ہے نہ کلام، وہی سین ہے جو تین چار ماہ پہلے آگرہ کی جامع مسجد کے دروازے پر دیکھا گیا تھا اور اب یہاں دُہرایا جا رہا ہے۔ برقعہ پوش عورت جو دیکھنے میں جوان حسین نظر آتی ہے کچھ لوگوں نے اس پر ترس کھا کر اس کا حال پوچھا تو بتایا کہ "میرا شوہر کانپور میں ریلوے اسٹیشن پر تار بابو تھا۔ چار ماہ ہوئے بیماری میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اس کے کوئی اولاد ہے نہ کوئی والی وارث بیوہ ہونے کے بعد عدّت کے دن پُورے کر کے اپنے وطن شہر متھرا کو واپس جانے کے لئے چلی، بے سروسامانی اور مفلسی کی وجہ سے کچھ پیسہ پاس نہ تھا۔ قنوج تک کا کرایہ تھا۔ اب اللہ مالک ہے، دُنیا میں کوئی اس کا عزیز و قریب نہیں ہے۔"

لوگوں نے کہا کہ "تم جوان العمر ہو، بہتر ہو گا کہ تم کسی اچھے کھاتے پیتے نیک چلن شخص سے اپنا عقد ثانی کر لو۔"

بعد پس و پیش برقعہ پوش عورت راضی ہو گئی اور ایک مالدار عطر فروش سے جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا عقد کر دیا گیا۔ عطر فروش صاحب جوان العمر، خوبصورت، خوش گفتار، نیک آثار بیوی کو پا کر بہت خوش تھے۔ پھُولے نہیں سماتے تھے کہ مفت میں بیٹھے بٹھائے یہ نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔

عقد کے دو ہفتے گزرنے کے بعد نئی بیگم نے شوہر سے کہا کہ "میرا تین ہزار روپے کا زیور ہے جو میرے شوہر کی بیماری اور علاج معالجے میں خرچ کے لئے صرف پانچ سو روپے میں رہن رکھا ہوا ہے اگر جلدی نہ چھڑایا گیا تو ڈوب جائے گا۔"

شوہر بولے "یہ کون سی بڑی بات ہے۔" سوچا سودا اچھا ہے کہ پانچ سو روپے میں تین ہزار روپے کا زیور ملتا ہے۔ فوراً راضی ہو گئے۔

ایک شب، مع اپنے چھوٹے بھائی اور نئی بیگم کے پانچ سو روپے کمر سے باندھ کر رات کی ریل سے متھرا کو روانہ ہو گئے۔ کانپور اچھرہ آگرہ والی چھوٹی لائن کی گاڑی سے سفر کر رہے تھے۔ مارہرہ ضلع ایٹہ کے ریلوے اسٹیشن تک آنے کے بعد سب نے مل کر کھانا کھایا کھانا کھانے کے بعد بیگم صاحبہ نے پاندان سے پان بنا کر اوّل خود کھایا۔ پھر ایک ایک پان دونوں بھائیوں کو کھلایا۔ دونوں بھائی پان کھا کر لیٹ گئے۔ پھر سو گئے۔ اس کے بعد متھرا اور اچھرہ جنکشن

بھی نکل چکا اور یہ ریل کا ڈبا جس میں یہ دونوں بھائی غافل پڑے سو رہے تھے۔ ٹرین سے کاٹ کر اجمیر جانے والی راجپوتانہ ریلوے ٹرین میں جوڑ دیا گیا۔ کوٹا بوندی جنکشن پر علی الصبح ٹرین گارڈ کانسٹیبل نے آ کر اُٹھایا کہ کہاں جانا ہے؟ جواب نہیں ملا تو جھنجھوڑا مگر یہ پھر بھی نہ بولے۔ جے پور جنکشن پر پہنچ کر ٹرین گارڈ کانسٹیبل مذکور نے جے پور ریلوے اسٹیشن کے تھانے پر رپورٹ لکھ دی کہ دو مسافر تیسرے درجے میں بیہوش پڑے ہیں۔ دونوں کو بحالتِ بیہوشی اُتار کر شفاخانے پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے بعد معائنہ بتایا کہ ان کو کوئی زہر کھلایا گیا ہے۔ علاج کے بعد ہوش آیا تو اپنے کو اسپتال میں پایا۔ بیوی اور پانچ سو روپے دونوں کے غائب ہو جانے کا حال کھلا۔ پولیس کو اپنا سارا ماجرا لکھایا۔ چونکہ مارہرہ ریلوے اسٹیشن پر چلتی ٹرین میں دونوں کو پان میں کچھ زہر کھلایا گیا تھا۔ لہٰذا مقدمہ زہر خورانی مع سرقہ قائم کئے جانے کے لئے جے پور ریلوے پولیس نے ریلوے پولیس کاسگنج ضلع ایٹہ کو لکھا کیونکہ مارہرہ ریلوے اسٹیشن کاسگنج جنکشن کی ریلوے پولیس تھانے کے حلقے میں تھا۔ پولیس ریلوے کاسگنج مصروف بہ تفتیش رہی مگر ملزمہ کا پتا نشان کچھ نہ چلا۔

میں ان ایّام میں تھانہ ہنسائن ضلع علی گڑھ میں اسٹیشن افسر تھا ہنسائن ایک چھوٹا سا موضع ہے جو چھوٹی لائن پر واقع ریلوے اسٹیشن رتی کا نگلہ سے چار میل براستہ خام واقع ہے۔ یہ اسٹیشن کاسگنج جنکشن اور ہاتھرس جنکشن کے درمیان ہے۔ ہاتھرس جنکشن صرف ایک اسٹیشن دور ہے، یہ دونوں واقعے زہر خورانی کے ایک ہاتھرس جنکشن ضلع علی گڑھ میں دوسرا مارہرہ اسٹیشن ضلع ایٹہ میں واقع ہوئے تھے۔

ان دونوں وقوعات سے پہلے کا ذکر ہے کہ میں ایک دن گھوڑی پر سوار قریب ۱۰ بجے دن ہنسائن کی آبادی میں ہو کر کسی گاؤں کو جا رہا تھا۔ ہنسائن کا تھانا گاؤں کی آبادی سے باہر ایک فرلانگ دور تھا۔ سڑک خام تھی، ہنسائن رتی کا نگلا پر ہنسائن کی آبادی میں سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک کچّے مکان کے دروازے کے باہر کے چبوترے پر ایک جوان مسلمان عورت بہت عمدہ لباس فاخرہ پہنے کھڑی ہے میری طرف اُس کی پشت تھی۔ پاؤں میں زرد مخمل کا سلیم شاہی جوتا، غرارہ دار ڈھیلا پاجامہ ریشمی قمیص اور دوپٹہ گلابی رنگ کا پہنے تھی۔ میں اُسے غور سے دیکھتا ہوا جب قریب سے گزرا تو اُس نے مجھے دیکھ لیا اور جھٹ سے اپنے گھر کے اندر چلی گئی، یہ ایک سانولے رنگ کی عورت تھی اسکی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ میں اور کچھ نہ دیکھ پایا۔ اور چلتا چلا گیا۔ مگر مجھے بڑا العجب تھا کہ ایسے سادہ موضع میں شہری لباس پہننے والی یہ عورت کہاں سے آ گئی۔ خیال کیا، کوئی مہمان کہیں سے آئی ہوگی۔ واپس آ کر میں اسی ادھیڑبن میں رہا۔ ہنسائن میں مسلمان بہت کم اور ہندو زیادہ آباد ہیں۔ راجا آوہ گڑھ کی زمینداری ہے مسلمان کاشتکار ہیں۔ اس عورت کی بابت راز جوئی سے پتا چلا کہ وُہ ایک حمّن مسلمان کاشتکار دیہہ کی زوجہ ہے عرصہ گزرا کہ یہ اس گھر میں جو اسی کاشتکار کا ہے رہتی ہے، اس کا شوہر علاوہ کاشتکاری کے ایک بیل گاڑی یعنی بہلی کرائے پر چلایا کرتا ہے۔ بیل اور گاڑی اسی کے ہیں۔ زیادہ تر ریلوے اسٹیشن رتی کا نگلا سے ہنسائن آنے جانے والوں کو کرائے پر لاتا لے جاتا ہے۔ خوش حال شخص ہے۔ میں اس شخص کی بہلی میں رات کے وقت ریلوے اسٹیشن سے ہنسائن کو آتا ہوا دیکھ چکا تھا۔ یہ بہت تندرست اور قوی جوان تھا۔ عمر قریباً ۴۵ سال تھی۔ چھوٹی سی داڑھی تھی مگر رنگ گہرا سانولا اور چہرہ بدنما تھا۔ سر پر صافہ اور دھوتی کُرتا پہنتا تھا۔ اس کی عورت کی بابت معلوم ہوا کہ کسی شہر کی رہنے والی ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کون سے شہر کی ہے۔ اکثر اپنے گھر سے اپنے میکے جانے کے لئے آتی جاتی رہتی ہے اور مہینہ دو مہینہ تک نہیں آتی ہے —— میری ایک ملازمہ نائن اسی ہنسائن کی رہنے والی تھی۔ اس سے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ اس کے گھر میں کسی اور عورت کے آنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وُہ عورت پردہ کرتی ہے مگر رہتی ہے امیرانہ لباس میں، اور کوئی عورت مرد یا بچّہ اس گھر میں نہیں ہے۔ اور کچھ پتا نہ چلا۔ جب مجھے ہاتھرس جنکشن کے وقوعے کا علم پولیس گزٹ سے ہوا تو میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں یہ وُہ عورت تو نہیں اس کا لباس دلہنوں جیسا ہے کہیں یہی تو وہ مسماۃ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دن میں نے ہاتھرس جنکشن ریلوے پولیس کے سب انسپکٹر سے اس عورت کا مزید حلیہ وغیرہ بھی پوچھا — اور کہا — کہ انشاء اللہ میں اس عورت کا پتا لگاؤں گا۔

میں اسی ٹوہ میں رہا۔

ہنسائن خاص اور گرد و نواح میں گلاب کی کاشت بہت ہوتی ہے یہاں کی زمین خاص طور پر گلاب کی پیداوار کے لئے مشہور ہے۔ دُور دُور تک گلاب کے کھیت پھولوں سے لدے ہوئے لہلہاتے مہکتے ہوئے چلے گئے ہیں مارچ اپریل میں یہاں گلاب کا سیزن شروع ہوتا ہے۔ اور گلاب کے پھول تڑوا کر اور جمع کرا کر کھیت والے عرق گلاب اور عطر گلاب کھینچنے والوں کے ہاتھ معقول داموں فروخت کرتے ہیں۔ قنوج، لکھنؤ وغیرہ کے عطر فروش یہاں آ کر مقیم ہو کر بھٹیاں بنا کر بھپکے لگا کر عرق اور عطر کشید کرتے ہیں۔

حسنِ اتفاق سے قنوج کا ایک عطر ساز مجھ سے آ کر ملا اور اپنا سارا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح ایک بیوہ عورت سے اُس نے عقد کیا تھا اور وُہ کس طرح اُس کو جُل دے کر چلتی ریل سے فرار ہو گئی ——— وُہ اُس کا نقد پانچ سو روپیہ جس کا مفصل تذکرہ اوپر درج کیا جا چکا ہے، لے کر غائب ہو گئی۔ اُس نے کہا "آپ یہاں میں عطر کشید کرنے ہنسائن آیا تو آج اتفاق سے ایک دروازے پر دُور سے میں نے ایک مسلمان عورت کو کھڑے دیکھا جو مجھے آتا دیکھ کر جھٹ سے اندر چلی گئی۔ مگر وُہ جو دوپٹہ اور کپڑے پہنے ہوئے تھی وہ وُہی تھے جو اس نے شادی پر اپنی اس نئی بیوی کو بنا کر دیئے تھے۔ میں اس کی صورت تو نہیں دیکھ پایا مگر مجھے پورا یقین ہے کہ وُہ کپڑے میرے ہی بنائے ہُوئے تھے۔ اور یہ وہی عورت ہے جس نے مجھے زہر دے کر دغا دی ہے۔ میں اس عورت کو دیکھ کر پہچان لوں گا۔" میں اس شخص کے آنے سے دل میں خوش ہُوا۔ مثل مشہور ہے "جوئندہ یابندہ" اس مشہور عورت کا معمّہ حل ہونے کو آ گیا۔

میں فوراً رپورٹ درج کرا کے اس عطر والے کو ساتھ لے کر عورت کے گھر پہنچا۔ اس کا شوہر بھی موجود تھا۔

اس سے میں نے کہا کہ "یہ عطر والا قنوج سے آیا ہے، اور تمہاری عورت کی اس سے شناخت کرائی جائے گی اور تلاشی لی جائے گی۔" جرم کی نوعیّت بھی بتا دی گئی۔ وُہ عورت اندر سے یہ بیان سُن رہی تھی اور اُس نے عطر والے کو دیکھ کر پہچان بھی لیا تھا۔ لہٰذا جب ہم اندر باضابطہ تلاشی وغیرہ کو داخل ہوئے اور اس عورت کو بلایا کہ سامنے آ۔ تو وُہ منہ چھپا کر میلے پُرانے دیہاتی کپڑے پہنے سامنے آئی۔ بالکل بوڑھی کمزور۔ نحیف و نزار عورت معلوم ہوتی تھی۔ بمشکل منہ کھُلوایا تو اس عورت نے اس چالاکی سے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا کہ وہ شخص شناخت کرنے میں تامّل کرنے لگا۔ یعنی اُس نے اپنی دونوں آنکھیں اس عیّاری سے ٹیڑھی کر لیں (یعنی پھیر لیں) کہ بالکل بھینگی معلوم ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی طور پر بھینگی ہی ہے۔ اُس نے گال پچکا کر منہ ٹیڑھا کر لیا جس سے وہ قریباً چالیس سالہ بُڑھیا۔ لقوے کی ماری۔ ٹڑھ موٹی دکھائی دینے لگی۔ میں بھی جو اُس کی شکل کو ایک بار سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا نہ پہچان سکا۔ مگر اس عورت نے چالاکی سے اپنا ماتھا ابروؤں سے اوپر کا حصّہ اپنے دوپٹے سے ڈھک رکھا تھا۔

اس پر اس کے جدید شوہر یعنی عطر والے نے کہا کہ "اس کا ماتھا کھلوایا جائے کیونکہ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا، جس کی بابت اس نے یہ بتایا تھا کہ ایک بار اس کی ساس نے اس کے ماتھے پر چمٹا مار دیا تھا جس سے زخم ہو گیا تھا۔" چنانچہ اس عورت سے ماتھا کھولنے کو کہا تو وُہ ماتھا کھولنے کو تیّار نہیں ہُوئی۔ بمشکل اس کے عطر والے شوہر نے زبردستی ماتھا کھلوایا تو ماتھے پر زخم کا نشان موجود تھا۔ جس کو دیکھ کر اس نئے شوہر یعنی عطر والے نے پہچان لیا کہ بلا شک و شبہ یہی وُہ عورت ہے جس نے

اس سے شادی کی تھی اور اسکے ساتھ یہ سنگین جرم کیا تھا۔ اب اس کی خانہ تلاشی لی گئی، تو شادی کے جوڑے اور کپڑے جو عطر والے نے اس کو بنا کر دیئے تھے۔ ایک ٹرنک سے دستیاب ہو گئے اور ایک دوسرا ٹرنک عمدہ عمدہ یعنی شادی کے جوڑوں سے، جو دلہنوں کو دیئے جاتے ہیں۔ بھرا ہوا ملا۔ مگر زیور اور نقد کچھ نہیں مل سکا۔ البتہ کچھ جڑی بوٹیاں اور پتیاں دو ڈبوں میں رکھی ہوئی ملیں، جن پر خیال گزرا کہ یہ وہی زہریلی نشہ لانے والی قسم کی ہیں جن کو یہ عورت پان میں کھلا کر اپنے نئے شوہر کو اثنائے سفر ریل میں بیہوش کر کے اس کا زر نقد لے کر فرار ہو جاتی تھی۔ یہ عروسی جوڑے اور ادویات قبضے میں کر لی گئیں۔ عورت مسلسل جرم سے انکار کرتی رہی۔ ازاں بعد فوراً ہاتھرس جنکشن کے ریلوے پولیس سب انسپکٹر کو بھی اطلاع دی گئی کہ تمہارے مقدمہ زہر خورانی کی ملزمہ گرفتار کر لی گئی ہے۔ چنانچہ وہ بھی بعد کو آ گئے اور انہوں نے ملزمہ کا بیان لیا تو وہ انکار ہی کرتی رہی۔ مشتبہ عروسی جوڑے ان کی فہرست مال مسروقہ کے مطابق نکلی، جس کی بابت انہوں نے کہا کہ آگرہ سے سابق شوہر کو بلا کر شناخت کرائی جائے گی کیونکہ مستغیث جس نے ملزمہ کو شناخت کر لیا تھا۔ حال کی واردات تازہ کا مستغیث تھا اور اس نے اپنے کسی ساتھی کو فوراً ہی ریلوے پولیس کاسگنج کو بھی اطلاع بھیج دی تھی لہٰذا ریلوے پولیس کاسگنج ——— (دقوعہ علاقہ مارہرہ نزد کاسگنج تھا) دوسری ٹرین سے آ گئے مقدمہ ابھی ان کے زیر تفتیش تھا اس لئے گرفتار ملزمہ کو مع مال مشتبہ کے حوالے کر دیا گیا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ ملزمہ کا چالان زہر خورانی سرقہ میں کر دیا گیا۔ ادھر ہاتھرس جنکشن کی ریلوے پولیس نے بھی آگرہ کے شوہر سے مال و ملزمان کی شناخت کرا لی اور مقدمہ زہر خورانی کا چالان کر دیا۔ اوّل کاسگنج والا مقدمہ ضلع ایٹہ میں پیش ہوا۔ ملزمہ جیل میں جا کر سخت بیمار ہو گئی۔ اس کی چھاتی میں ایک پرانا ناسور بھی تھا جس کا زخم بن گیا۔ سول سرجن ایٹہ نے جو جیل کے بھی انچارج تھے لکھا کہ "یہ ملزمہ سخت بیمار ہے جاں بر نہیں ہو سکے گی"۔ لہٰذا عدالت سیشن ایٹہ سے تین سال قید سخت کی سزایاب ہو گئی اور سول سرجن ایٹہ کی اس سفارش پر (جو ہندوستانی ڈاکٹر تھے) ملزمہ پر دوسرا مقدمہ زہر خورانی کا نہیں چلایا گیا کہ اس پر دوسرا مقدمہ چلانا گورنمنٹ کا پیسہ ضائع کرنا تھا۔ اس پر ایک ہی مقدمہ چلایا گیا اور عورت وہاں سے کسی دوسری پوربی ضلع کی جیل میں منتقل کر دی گئی۔ حیرت یہ ہے کہ یہ سب کارروائی جیل میں ملزمہ نے جعل

دے کر اور زردار و غیرہ جیل سے ساز باز کر کے کرائی تھی۔ غرض کہ ایک بڑی قطامہ، حرافہ و عیار عورت سزایاب ہو گئی۔ جو نہ معلوم کتنی بار اس طرح کے جُل اور دغا دے کر نئی نویلی دلہن بن کر سیدھے سادے لوگوں کو پھانس کر نئی نئی شادیاں رچایا کرتی اور بعد کو نئے شوہر کو جھکمہ دے کر اس کو کنیر کی جڑ وغیرہ پان میں کھلا کر بے ہوش کر کے اس کی خاصی معقول رقم لے کر چمپت ہو جاتی تھی۔ اس کے ارتکاب جرم کا طریقہ ہر جگہ یکساں ہوتا تھا۔ یہ دونوں وقوعے جو یوپی میں ہوئے ان کا پتا چل گیا۔ مگر اور بھی وقوعے جو راجپوتانہ یا پنجاب کی طرف کئے گئے تھے ان کا علم نہ ہو سکا۔

سزایابی کے بعد ملزمہ صرف ایک سال جیل میں رہی۔ اس نے اپنی عیاری سے یا کسی اور طرح سپرنٹنڈنٹ جیل سے رپورٹ کرا کر جیل سے رہائی حاصل کر لی اور رہائی کے بعد ایک جیلر کے گھر میں پڑ گئی وہ ایسی تیز و طرار گفتگو کرنے والی عورت تھی کہ کوئی پڑھی لکھی عورت بھی کیا ہو گی۔ اس واقعے کا دور دور چرچا ہوا۔ پولیس کی تاریخ میں ایسی حرافہ عورت کی مثال نہیں ملتی۔

سنہ ۱۹۲۵ء میں جب میں تھانہ جلیسر ضلع ایٹہ میں انچارج تھا جو ہنسائن سے ملا ہوا ہے تو یہ عورت جس کا نام نوشادی بیگم تھا۔ مجھ سے ملنے آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ "میں جیل سے چھوٹ کر آ گئی ہوں ہنسائن اپنے گھر سے اپنا مال زیور، نقدی وغیرہ جو زمین میں گاڑ رکھا تھا لینے آئی ہوں اور میں نے ایک جیلر سے شادی کر لی ہے۔ اس نے مجھے نقدی وغیرہ لانے کے لئے یہاں آنے کی اجازت دی ہے۔ اسلئے میں ہنسائن پرانے شوہر کے پاس (جو نہ معلوم حقیقی تھا بھی یا نہیں) نہیں رہوں گی۔ آپ کی خبر لگی کہ آس پاس کے تھانے میں ہیں۔ ریل سے جلیسر کے اسٹیشن پر اتر کر ہنسائن رک گئی تھی اور آپ کو خوش خبری سنانے آئی تھی۔ میں نے دیکھا تو وہ وہی جوان، تندرست، قبول صورت اور خوش گفتار عورت تھی جس کی ایک جھلک میں نے ایک بار دیکھی تھی۔ تو یہ تھی زمانہ حال کی افسانوی ڈلاّ نوشادی بیگم۔ 


قمر الاسلام عثمانی
خونی گھنٹے

وہ اندھیرے میں بہت دیر سے ایک پُرانی اور بڑی سی عمارت کی کھڑکی سے لگا اندر جھانک رہا تھا۔ یہ عمارت اس کے سابق مالک مسٹر برگ کی تھی۔ مسٹر برگ بہت دولت مند آدمی تھے۔ مگر ایک دن اچانک انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ دیوالیے ہو چکے ہیں اور اپنے دیوالیے ہو جانے کا ثبوت انہوں نے اس طرح دیا کہ اعلان کے فوراً بعد اپنے سارے ملازمین کو چھٹی دے دی۔

پلین کو یہاں اس طرح چھپ کر آتے اور چوروں کی طرح تاک جھانک کرتے ہوئے سخت ندامت ہو رہی تھی مگر وہ کرتا بھی کیا۔ مسلسل بے کاری اور مفلسی نے اس کے ہوش و حواس زائل کر دیے تھے۔ اُسے اب تک کوئی کام بھی نہ مل سکا تھا۔ بے کاری کی وجہ سے اسے کوئی قرض بھی نہ دیتا تھا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ اسے اپنی اور نوجوان بیوی پولین کی زندگی گزارنی بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ مسٹر برگ پر اب بھی اس کی تنخواہ کے ۲۵۰ ڈالر واجب الادا تھے۔ اگر اسے یہ رقم مل جاتی تو کچھ عرصے کے لیے انہیں زندگی گزارنا آسان ہو جاتا۔

کمرے میں ایک شخص بڑی دیر سے بیٹھا مسٹر برگ سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب یہ آدمی چلا جائے گا تو وہ مسٹر برگ سے مل کر اپنی ضرورت بیان کرے گا کیونکہ اس کی شرافت اسے تنبیہ کر رہی تھی کہ ایک غیر شخص کی موجودگی میں اپنے دیوالیے مالک سے یہ رقم طلب کرنا مناسب اور معقول بات نہیں ہے۔ اوّل تو وہ یہاں آنے کے ہی حق میں نہ تھا۔ طوعاً و کرہاً بڑی بددلی سے آیا تھا۔ پولین دسیوں مرتبہ اُسے بزدل اور کاہل ہونے کا اگر طعنہ نہ دے چکی ہوتی تو وہ ہرگز نہ آتا۔ اس نے بیوی سے اس سلسلے میں کئی بار جھوٹ بھی بولا تھا کہ وہ کئی بار مسٹر برگ کے پاس جا چکا ہے مگر اُن کے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر مسٹر برگ کے پاس پیسے ہوتے تو وہ اس کی رقم بغیر مانگے ہی بے باق کر دیتے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی بہت دیر تک مسٹر برگ کے پاس بیٹھے گا۔ چنانچہ اس نے ان لمحات کو غنیمت جانا اور دل ہی دل میں ان کلمات کی ریہرسل شروع کر دی جو رقم مانگتے وقت اسے کہنے تھے۔ اس نے عالمِ تصوّر میں دیکھا کہ وہ گڑگڑا رہا ہے "حضور! میں آپ کا قدیم نمک خوار اور زیرِ بارِ احسان ہوں مجھے میری مجبوری یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ پر میری کچھ رقم باقی ہے۔ البتہ اگر آپ مجھے کچھ بطور قرض دے دیں گے۔" لیکن پلین کو یہ جملے کچھ جچے نہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کی عاجزی اور انکسار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے دوبارہ سوچنا شروع کیا۔ "حضور! میری بیوی سخت بیمار ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ علاج کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ جب آپ نے مجھے اپنی خدمت سے موقوف کیا تھا تو اس وقت آپ کی طرف...."

پلین کا جملہ ناتمام رہ گیا۔ مسٹر برگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دیوار سے لگی ہوئی بڑی سی تجوری کے قریب جا چکے تھے۔ وہ مخصوص نمبروں سے کھلنے والے قفل کو اِدھر اُدھر گھما رہے تھے۔ پلین آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا قفل ۸-۳-۱۰ کے نمبروں پر آ کر کھل گیا ہے۔ مسٹر برگ نے تجوری کھولی اور اس میں سے بڑا سا چرمی بیگ نکالا۔ جب انہوں نے اس چرمی بیگ کو کھولا تو اس نے دیکھا کہ وہ کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ مسٹر برگ نے اس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اجنبی شخص کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے بعد بیگ بند کر کے دوبارہ پھر تجوری میں رکھ دیا۔

پلین کا دل غم اور غصے سے بھر گیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اس اجنبی شخص کی جگہ ہوتا اور برگ سے کچھ رقم حاصل کر سکتا۔ یکایک فرش پر کرسی گھسیٹنے کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے دیکھا اجنبی شخص اٹھ کر باہر جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ احساس دُکھ پہنچا رہا تھا کہ رئیس ہونے کے باوجود مسٹر برگ نے اپنے دیوالیے ہونے کا جھوٹا اعلان کیا تھا۔ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مسٹر برگ اتنے بددیانت انسان ثابت ہوں گے۔ وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسٹر برگ نے کمرے کی روشنی بجھا دی اور بالائی منزل پر جانے کے لیے زینے طے کرنے لگے۔ پلین سمجھ گیا کہ وہ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ عمارت کے گیٹ کی طرف اس خیال سے بھاگا کہ اطلاعی گھنٹی بجا کر مسٹر برگ کو اپنی موجودگی سے مطلع کر دے۔ لیکن اسی لمحے پوری عمارت کی روشنی غائب ہو گئی۔ اس کی انگلی اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر رکھی کی رکھی رہ گئی۔

اب اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ رنج اور مایوسی میں پیچ و تاب کھاتا ہوا عمارت کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ آخر ایک جگہ وہ غیر اختیاری طور پر رک گیا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جہاں سے ابھی تھوڑی دیر پہلے کھڑا وہ اندر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ دیر تک کھڑا تجوری کو گھورتا

رہا ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ آخر کیا حرج ہے اگر وہ اندر جا کر اپنی مطلوبہ رقم خود ہی نکال لے کیونکہ یہ چوری ہرگز نہ تھی بلکہ اس کا حق تھا۔ اسے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ کھڑکی اندر سے بند نہ ہوتی تھی، یہ سوچ کر اس نے آہستہ سے کھڑکی کے پٹوں کو دھکا دیا۔ کھڑکی کھُل گئی۔ وہ کوئی آواز پیدا کیے بغیر نہایت احتیاط سے اندر کود گیا۔ اور اپنے پیچھے کھڑکی کو مضبوطی سے بند کر دیا کیونکہ واپسی کے لیے اس نے کمرے کا دروازہ منتخب کیا تھا۔

کمرے میں ہولناک اندھیرا تھا۔ اس میں بجلی جلانے کی بھی ہمّت نہ تھی، اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے رومال نکال کر چہرے پر باندھ لیا اور اس خوف سے کہ کسی چیز پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہ رہ جائیں، دونوں ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے۔ پھر تجوری کے قریب جا کر ۸-۳-۱۰ کے اعداد ملانے لگا۔ اچانک "کلک" کی آواز آئی اور تجوری کے پٹ کھُل گئے۔ پین کے قلب کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کے پاؤں میں ہلکی ہلکی لرزش سی ہونے لگی اسے اپنی اس حرکت پر ذرا سی دیر کے لیے ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر چرمی بیگ پر پڑی وہ سب کچھ بھول گیا۔ اپنی رقم حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس نے بیگ نکال لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اسے کھولنے لگا۔ یک بیک پورا کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ پین بے ساختہ اُچھل پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بار زور سے دھڑک کر حرکتِ قلب ہمیشہ کے لئے رک جائے گی۔ سردی کے باوجود اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ سامنے مسٹر برگ کھڑے تھے۔

"اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔"

مسٹر برگ کے ہاتھوں میں دبا ہوا خوبصورت ریوالور روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑے ہوئے تھے۔

"اس میں شک نہیں کہ تم بڑے ذہین چور ہو۔ تجوری تم نے بڑی خوبصورتی سے کھول لی لیکن کاش تم یہ بھی جانتے ہوتے کہ اس تجوری کے کھُلنے اور بند ہونے کا نظام میری خواب گاہ سے وابستہ ہے۔ تجوری کے کھُلتے ہی میری خواب گاہ میں خطرے کی گھنٹی فوراً بج اٹھتی ہے۔"

پین پر ندامت کا دورہ سا پڑا۔ اس نے سوچا کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتا۔ یا کسی صورت ہوا میں تحلیل ہو جاتا، اور نہیں تو پانی ہو کر زمین میں جذب ہو جاتا۔ کاش وہ رقم حاصل کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا۔ بھلے ہی بھوکوں مر جاتا۔ مگر مسٹر برگ کے سامنے ایک چور کی حیثیت سے نہ کھڑا ہوتا۔ مسٹر برگ اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ کون ہو تم؟"

پین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سوچا اگر وہ جواب دے گا تو مسٹر برگ اسے فوراً پہچان لیں گے۔ وہ مسٹر برگ کی گولی کا منتظر تھا کیونکہ اس کے نزدیک مر جانا اس سے بہتر تھا کہ جیتے جی بحالت ہوش و حواس پہچان لیے جانے کی ذلت سے ہمکنار ہو۔ وہ خشک لکڑی کے مانند کھڑا تھا۔ آخر وہ اپنی اس رسوائی کے متعلق بیوی کو کیا بتائے گا۔ اس کے لیے یہ تصور ہی بڑا سوہان روح تھا کہ اس کی بیوی اسے ایک چور، بے ایمان اور بزدل کے روپ میں دیکھے۔

"رومال چہرے سے ہٹاؤ میں بھی تو دیکھوں کہ تم ہو کون؟" مسٹر برگ نے ریوالور والا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر پین ویسے ہی چُپ چاپ کھڑا تھا۔ مسٹر برگ غصّے سے چلاّئے۔

"میں کہتا ہوں بے ہودہ یہ رومال چہرے سے ہٹاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

پین نے دہشت سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"اچھی بات ہے تو تمہاری رونمائی کا کام میں خود انجام دیتا ہوں۔" مسٹر برگ تیزی سے اس کی طرف جھپٹے۔ ان کا بڑھتا ہوا ہر قدم پین کو اپنے دل و دماغ پر ٹھوکریں مارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، مسٹر برگ بالکل اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اب پین کے لیے سوچنے سمجھنے کا موقع بالکل نہ تھا جیسے ہی مسٹر برگ کا ہاتھ اس کے چہرے سے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک زوردار ضرب مسٹر برگ کی کلائی پر لگائی۔ پستول ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ پین نے اسی پر بس نہ کیا۔ اُچھل کر ایک لات پیٹ پر رسید کر دی۔ مسٹر برگ دوہرے ہو گئے اور درد سے کراہنے لگے۔ ان کی سانس رُک گئی۔ پین نے آخری ٹھوکر ان کے چہرے پر لگائی اور وہ

لہراتے ہوئے فرش پر آ رہے۔

"تو یہ تم ہو پین!"۔۔۔ مسٹر برگ کراہ کر بولے۔

پین کو فوراً احساس ہوا کہ رومال کا کچھ حصہ کھنچ کر برگ کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔ مسٹر برگ نے اسے دیکھ لیا تھا، پہچان لیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ننگا محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ کئی جرموں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ چوری، زدوکوب اور قتل عمد کی کوشش جیسے کئی ، بھیانک اور سنگین جرائم سرزد ہو چکے تھے۔ اس نے دیکھا مسٹر برگ اسے بڑی نفرت سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر وہ گھومے اور آہستہ آہستہ فرش پر پڑے ہوئے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ ریوالور تک پہنچ گئے تو یقیناً اُسے مار ڈالیں گے۔ اور قانونی طور پر یہ جائز بھی تھا۔ پین نے ایک لمحہ کھوئے بغیر مسٹر برگ کے چہرے پر ایک ٹھوکر اور رسید کر دی۔ مسٹر برگ تکلیف کی شدت سے فرش پر لوٹنے لگے۔ ان کی ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ پین نے ریوالور فرش سے اٹھا لیا اور مسٹر برگ کی طرف تان لیا۔

"پین" مسٹر برگ لڑکھڑائی آواز میں بولے "تم نمک حرام ہو۔ تم نے یہ جو کچھ بھی کیا ہے اس کی سزا ضرور بھگتو گے۔"

اچانک ان پر خوف طاری ہو گیا۔ دہشت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"تت۔ تم۔ مجھے قتل کرو گے۔ نن نہیں۔ مجھے نہ مارو۔ میں کسی سے کچھ نہ کہوں گا۔ میں آج۔۔۔۔"

لیکن مسٹر برگ اپنا جملہ پورا نہ کر سکے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے پین کے ریوالور سے ۴ گولیاں نکلیں اور ان کے جسم میں پیوست ہو گئیں، کمرے کی فضا میں بارود کی ناگوار بو پھیل گئی۔ پین مالک کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خود حیرت تھی کہ کس طرح اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی۔ مسٹر برگ کا چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ سے خون اُبل رہا تھا۔ مسٹر برگ کے مرنے کے بعد کمرے میں تکلیف دہ خاموشی چھا گئی۔ وہاں سکوتِ مرگ طاری تھا۔ پین کو محسوس ہوا جیسے اسے تیز بخار چڑھ آیا ہو۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ اس نے ریوالور فرش پر ڈال دیا اور مسٹر برگ کی لاش غور سے دیکھنے لگا۔ مسٹر برگ مر چکے تھے۔ پین کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا

"میں نے انہیں قتل کر دیا ہے۔ میں قاتل ہوں۔ مجھے سزا ملے گی۔ پھانسی پر چڑھا دیا جاؤں گا۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھے قاتل سمجھیں۔"

وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اٹھا اور مسٹر برگ کے ہاتھ سے رومال کا ٹکڑا لے کر ریوالور کا دستہ صاف کرنے لگا۔ یہ احساس کیے بغیر کہ اس کے ہاتھوں میں دستانے پہلے سے موجود ہیں۔ پھر اس نے ریوالور اور رومال کے ٹکڑے کو کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قبر میں بند ہے۔ اس کی نظریں فرش پر پڑے ہوئے چرمی بیگ پر آ کر ٹھہر گئیں، محض ۲۵۰ ڈالر کی خاطر وہ قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ اور ۲۵۰ ڈالر بھی کس کے۔ اس کے اپنے بیگ میں کم از کم ہزار ڈیڑھ ہزار ڈالر ضرور رہے ہوں گے۔ وہ سوچ رہا تھا، مسٹر برگ خود اپنی غلطیوں سے ہلاک ہوئے۔ اگر وہ یہ رقم اسے دے دیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔"

اس نے بیگ کھولا۔ اور صرف ۲۵۰ ڈالر نکال لیے۔ وہ زیادہ کیوں لے۔ اس کا حق صرف ۲۵۰ ڈالر کا تھا۔ اس کے علاوہ چرمی بیگ کی جملہ رقم لے جانے سے پولیس شبہے میں پڑ جاتی اور خود اس کی بیوی بھی بدگمان ہو جاتی۔ ۲۵۰ ڈالر کے لیے تو وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ مالک نے اسے خود دیے تھے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مالک سے اپنی ملاقات کا صحیح وقت بھی بتاتا۔ وہ قتل کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کرے گا۔ البتہ پولیس کی پوچھ گچھ سے بچنے کے لیے بیوی کو سمجھا دے گا کہ مسٹر برگ سے ملاقات اور رقم لینے کا ذکر کسی سے نہ کرے۔

اب پین کو کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ عقل کچھ کچھ کام کرنے لگی تھی۔ اس نے ڈھائی سو ڈالر جیب میں ڈالے، بیگ کو بند کر کے تجوری میں رکھا۔ تجوری بھی احتیاط سے بند کر دی۔ تجوری کے ہینڈل اور قفل پر سے انگلیوں کے نشانات مٹا دیے۔ اس کے بعد کھڑکی کو دوبارہ چیک کیا۔ وہ اچھی طرح بند تھی۔ جیب سے رومال نکال کر چہرے اور پیشانی کا پسینہ خشک کیا۔ پھر کمرے کی روشنی بجھا دی اور دروازے کے راستے باہر نکل آیا۔ اس نے ایک بار پھر چہرے کے گرد رومال لپیٹ لیا تاکہ کوئی اسے مسٹر برگ کے مکان سے باہر نکلتے ہوئے پہچان نہ لے۔ عمارت سے باہر نکلتے وقت اس نے اِدھر اُدھر خوب اچھی طرح دیکھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہر طرف ویرانی اور تاریکی تھی۔

وہ بہت خوش ہوا اور تیزی سے اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔

مسٹر برگ کے مکان سے کچھ دور آ جانے کے بعد اس نے چہرے سے رومال ہٹا لیا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ آسمان بالکل سیاہ پڑا ہوا تھا۔ وہاں ایک ستارہ بھی روشن نہ تھا۔ پین اگرچہ بڑی حد تک مطمئن ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اس پر قتل کا گمان نہ کیا جا سکے گا، تاہم دل کا چور اسے بڑی طرح پریشان کر رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ کبھی پسینہ چھوٹنے لگتا۔ کبھی ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ معلوم نہیں سردی کیوں پڑنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس ذہنی انتشار اور بدحواسی کے عالم میں جب وہ گھر جائے گا تو یقیناً بے ربط اور بہکی بہکی باتیں کرے گا اس لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے وہ کہیں اطمینان سے گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اپنے حواس درست کر لے اور اس کے لیے بار سے بہتر کوئی جگہ نہ ہو سکتی تھی۔ وسکی کے دو پیگ اسے سنبھالا دے سکتے تھے۔

پین شرابی نہیں تھا۔ بلکہ شراب سے اُسے سخت نفرت تھی۔ مگر آج! آج کے دن وہ مجبور تھا۔ اس نے دور سے ایک بار دیکھا اور اسی میں گھس جانا مناسب سمجھا۔ یہ بار اس قبیل کا تھا کہ اس میں زیادہ تر گھر بار والے لوگ آتے تھے اور بارہ بجے سے پہلے پہلے بال بچوں میں لوٹ جاتے تھے۔ بارہ بجتے ہی بار ویران ہو جاتا تھا۔ پین یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اس وقت وہاں سوائے بار کے مالک کے اور کوئی نہ تھا۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا اور ایک پیگ وسکی کا آرڈر دیا۔ خود کو پکا شرابی ظاہر کرنے کے لیے ایک گھونٹ میں پورا پیگ چڑھا گیا۔ اس کے بعد دوسرے پیگ کا آرڈر دیا۔ اور اسے بھی ایک سانس میں چڑھا گیا۔ بار کا مالک اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اب پین کو احساس ہوا کہ اس سے کیسی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے شراب پینے کا انداز سراسر مصنوعی تھا۔ شراب پینے والے تو آہستہ آہستہ گھونٹ لیتے ہیں۔ پانی یا دوا کے مانند یک بارگی نہیں پی جاتے وہ کچھ خوفزدہ نظر آنے لگا اور بار بار کنکھیوں سے بار کے مالک کی طرف دیکھنے لگا۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ جس سے ایک دلنشیں دُھن نشر ہو رہی تھی۔ اچانک دُھن رُک گئی اور اناؤنسر نے بلند آواز سے کہا۔ ”اب شہر کی خبریں نشر کی جائیں گی۔“

پین کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگر اس نے اپنے چہرے سے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ بڑی پُرسکون آواز میں وہ بار کے مالک سے بولا۔ ”ریڈیو بند کر دو۔“

بار والے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آف کر دیا۔ اس نے پین کے کہنے سے ریڈیو بند تو کر دیا تھا مگر بڑی عجیب نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ اس کی نظریں پین کے چہرے اور سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں، پین نے پہلو بدلا اور سوچا ”بہت بُرا ہوا۔ اس نے خفت مٹانی چاہی۔

”ریڈیو کھول دو۔ میں مذاق کر رہا تھا“ وہ زبردستی سوکھے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتا ہوا بولا۔

بار والے نے ناگواری سے منہ بنا لیا۔ اور کچھ دیر بعد بولا ”ذرا جلدی کیجیے۔ بار بند کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

پین اُٹھ کھڑا ہوا۔ وسکی کا بل ۸۰ سنیٹ بنتا تھا۔ اس کے پاس ریزگاری میں ۸۰ سنیٹ نہیں تھے۔ کچھ کم پڑتے تھے اور بار والے کے سامنے ۲۵۰ ڈالر نکالنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا نوٹ خون آلودہ ہو گئے تھے اس سے بار والے کے ذہن میں شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کہا۔

”تم نے غلط بل بنایا ہے دوسرے بار میں اتنی ہی وسکی کے صرف ۳۵ سنیٹ لگتے ہیں۔“

”جناب یہ بڑی پُرانی وسکی ہے۔ اس کا ایک پیگ ۴۰ سنیٹ کا آتا ہے۔“

بار والے سے زیادہ بحث و تکرار مناسب نہ تھی۔ اس نے بار والے سے اجازت لی اور ٹوائیلٹ میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے نوٹوں کا بنڈل نکالا۔ اور انہیں دیکھنے لگا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ نوٹ خون آلودہ نہیں تھے۔ اس نے ایک چھوٹا سا نوٹ نکالا اور واپسی کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ باہر سے بار والے کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”آخر یہ اندر ہو کیا رہا ہے؟“

پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ اور اس کا پٹ پین کے منہ پر آ لگا۔ اس کا توازن بگڑ گیا۔ سارے نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ پین بدحواس ہو گیا۔ اور جھک کر جلدی جلدی نوٹ سمیٹنے لگا جھکتے وقت ریوالور جیب سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ وہ بُری طرح بوکھلا گیا۔ بار والے نے اندر جھانکا اور غصّے سے بولا۔

"باہر نکلتے ہو۔ یا نہیں؟"

پھر اس کی نظریں بکھرے ہوئے نوٹوں اور فرش پر پڑے ہوئے ریوالور پر جم گئیں۔ پین نے جلدی سے ریوالور اٹھا لیا اور اس کی طرف پلٹا۔ بار والا نہ جانے کیا سمجھا۔ بے اختیار پین پر ٹوٹ پڑا۔ وہ پین پر حاوی ہو گیا تھا' وہ پین کو گھسیٹتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ دیوار سے ٹکا کر اس کا گلا پکڑ لیا اور بری طرح دبانے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیختے جا رہا تھا۔ "پولس پولس۔ مدد مدد"

اب پین بالکل مجبور ہو چکا تھا۔ بار والے کا منہ بند کرنا بہت ضروری تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نالی بار والے کے پیٹ سے لگا دی اور ٹریگر دبا دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے گلے پر بار والے کی انگلیوں کا دباؤ کم ہوتا گیا۔ بار والے کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ اور وہ فرش پر آ رہا۔ اس کی آنکھیں وحشت اور حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

پین نے ریوالور جیب میں رکھا۔ نوٹوں کو جمع کیا اور آہستگی سے ٹوائلٹ سے باہر نکل آیا۔ یہ دوسرا قتل تھا جو اس نے اپنی دانست میں مجبوراً کیا تھا۔

"خدایا مجھے بخش دینا" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سڑکیں ویران ہو چکی تھیں در و دیوار اونگھتے سے معلوم ہوتے تھے۔ پولین یقیناً سو گئی ہوگی۔ اس کا فلیٹ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ اس نے ان حالات میں لفٹ استعمال کرنا مناسب نہ سمجھا' زینے طے کر کے اوپر پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا واقعی اس کی خوبصورت بیوی پولین سو چکی تھی۔ وہ بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے سوچا پولین بھی کتنی سادہ اور معصوم ہے۔ بے خبر سو رہی ہے۔ میری جگہ کوئی دوسرا شخص بھی کمرے میں داخل ہو سکتا تھا۔ وہ بیوی کو محبت بھری نظروں سے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کا دل اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ پولین اب ایک قاتل کی بیوی ہے۔ ہاں' وہ قاتل ہی تو تھا۔ مختصر سے وقفے میں اس سے دو قتل سرزد ہو چکے تھے۔

صبح آفتاب کی نرم اور گرم کرنوں نے پین کو بیدار کر دیا۔ دھوپ تمام کمرے میں پھیل چکی تھی۔ وہ اٹھا اور بھاگ کر نیچے سے اخبار خرید لایا اور بیٹھ کر پڑھنے لگا اس میں ابھی تک مسٹر برگ کے قتل کی خبر نہیں چھپی تھی۔ وہ ابھی اخبار پر نظریں دوڑا رہا تھا کہ پولین کچن سے برآمد ہوئی۔

"سچ پین تم بڑے وہ ہو۔ مسٹر برگ...."

پین نے جلدی سے بیوی کا جملہ کاٹ دیا۔

"پولین۔ میری زندگی۔ مجھے کل اتنی بھی فرصت نہ مل سکی کہ میں مسٹر برگ کے پاس جاتا۔"

"میں کہتی ہوں...."

"بہتر ہے کہ کچھ نہ کہو۔ اس وقت میں کچھ بھی نہیں سننا چاہتا۔"

پولین شوہر کے اس غیر معمولی رویئے پر حیرت زدہ رہ گئی۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ چپ چاپ باورچی خانے میں لوٹ گئی۔ پین نے کپڑے بدلے۔ جیب ٹٹول کر دیکھی وہاں ۲۰۵ ڈالر اور ریوالور اب بھی محفوظ تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پردے کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگا۔ دفعتہً اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

"پولین۔ پولین۔ یہاں آؤ۔ دیکھو وہ آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟"

پولین دوڑی ہوئی آئی اور جس طرف شوہر نے اشارہ کیا تھا۔ دیکھنے لگی۔

"اس آدمی کو دیکھو جو اس عمارت کے چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے۔"

"پین! تم بھی خوب آدمی ہو۔ یہاں تو ہر روز درجنوں آدمی چوکیدار سے ملنے آتے ہیں۔ ممکن ہے کسی کا پتا پوچھ رہا ہو۔"

"کس کا پتا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ پین! آخر آج تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"دیکھو جی۔ مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ یہ میری درخواست ہے۔ سمجھیں اور اگر تم مجھ سے واقعی محبت کرتی ہو تو آج میں تم سے جو کچھ بھی کہوں کوئی سوال یا وضاحت چاہے بغیر تم اس کی تعمیل کرتی رہو۔ میری طبیعت آج کچھ خراب ہے۔"

پین نے پولین کو زبردستی خوابگاہ میں بھیج دیا۔ خود کمرے کے دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ اور بڑبڑایا "آخری گولی تک مقابلہ کروں گا۔"

چند لمحے بعد دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ پین نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

"کون؟"

"میں ہوں مسٹر پین" یہ چوکیدار کی آواز تھی۔

"کیا کام ہے؟"

"ایک شخص آپ کا فلیٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عنقریب یہاں سے جا رہے ہیں۔ آپ کے بعد وہ یہ فلیٹ لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو....."

"نہیں ہرگز نہیں۔ میں اجازت نہیں دے سکتا۔"

"آپ کی مرضی جناب۔" چوکیدار کے قدموں کی واپس جاتی ہوئی چاپ دور ہوتی چلی گئی۔ پین نے دروازے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی۔ اطمینان اور سکون کی سانس۔ ذرا دیر بعد اس نے پولین کو خوابگاہ سے باہر نکلنے کی اجازت دے دی۔ پولین کو اپنے شوہر کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا تھا۔

"آخر ہم یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ چوکیدار کو تقاضا جات ادا کر دو۔ یہ مکان اتنا..."

"میں اب یہاں بالکل نہیں رہنا چاہتا۔" پین نے بیوی کی بات کاٹ دی۔

"آخر تمہارا مقصد کیا ہے۔ میں حیران ہوں...."

"پولین میری تم سے یہ درخواست ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تم بے چون چرا تسلیم کر لو۔"

پین دوبارہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور پردے کی آڑ سے، چھپ کر، باہر جھانکنے لگا۔ پولین کو شوہر کی ذہنی حالت درست نظر نہیں آ رہی تھی وہ خاصی متردد ہو گئی تھی اس کی ذہنی الجھن آنکھوں سے صاف جھانک رہی تھی۔

"پین! میں جاننا چاہتی ہوں کہ آخر ہم جائیں گے کہاں پر؟"

"کہیں بھی۔"

"پھر بھی؟"

پین بگڑ گیا۔ "میں پہلے ہی تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں جو کچھ تم سے کہوں تم کوئی سوال یا وضاحت چاہے بغیر اس کی تعمیل کرو۔ آج کا دن میرے لیے ایک غیر معمولی دن ہے میں پھر یہی کہتا ہوں۔ بلکہ درخواست کرتا ہوں کہ میں جو کچھ کہوں تم چپ چاپ اسے مانتی جاؤ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص مجھ سے ملنے آئے۔ اور میں اس سے نہ ملنا چاہوں لیکن اس سے پہلے کہ وہ آئے، ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے.... اور یہ بھی طے ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں جائیں گے۔ الگ الگ روانہ ہوں گے۔"

"کیوں؟"

"تمہیں نہیں معلوم کہ باہر ایک ایسا شخص میرا منتظر ہے۔ جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گا —— اور میں تم سے جدا نہیں ہونا چاہتا مجھے تم سے شدید محبت ہے۔"

"باہر کون شخص تمہارا منتظر ہے؟" پولین نے پریشان ہو کر سوال کیا

"باہر دیکھو۔ اس طرف سڑک کے کنارے۔ ٹھیک ہمارے فلیٹ کے مقابل وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔" پولین نے اس طرف دیکھا اور کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

"ممکن ہے وہ کسی اور کا انتظار کر رہا ہو۔"

"نہیں وہ کسی اور کا نہیں، میرا منتظر ہے میری زندگی۔ تم یقین کرو۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ تم اکیلی روانہ ہو۔"

پولین نے سرکشی اختیار کی "میں تمہارے بغیر کہیں نہ جاؤں گی میں تمہارے ساتھ رہوں گی پین؟"

"ضد نہ کرو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بعد میں آ کے تم سے آ ملوں گا۔"

"میں کہاں جاؤں؟" پولین نے معصومیت سے سوال کیا۔

"ریلوے اسٹیشن پر تم مانٹریال کے دو ٹکٹ لے لینا۔ ٹرین رات کو ۸ بج کر بیس منٹ پر روانہ ہوتی ہے۔ میں اگلے اسٹیشن سے بیٹھوں گا میرے لیے تم ایک سیٹ رکھ چھوڑنا۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا کہ آخر یہ سارا چکر کیا ہے؟"

"تم مت گھبراؤ۔ میں راستے میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔ مگر اب ذرا جلدی کرو۔ اور ہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھو کہ رات سے پہلے پہلے تمہیں شہر میں بے مقصد ادھر ادھر چکر بھی لگانا ہے۔ تاکہ کوئی تمہارا تعاقب کر رہا ہو تو پریشان ہو کر بیٹھ جائے۔"

"آخر تمہیں، یہ ہو کیا گیا ہے۔" پولین سے پھر ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بے اختیار چلائی "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟"

"نہیں پولین! تم مجھ پر اعتبار کرو ہم پھر مل جائیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے!"

"نہیں، میں نہیں مانتی تم یقیناً مجھ سے بیزار ہو چکے ہو۔ اور اس طرح مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔" پولین آنسو بہانے لگی۔

"ایسا نہ کہو میری روح۔ آہ۔ کاش میں تمہیں سب کچھ اسی وقت بتا سکتا۔ ذرا صبر سے کام لو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں زمین و آسمان ایک کر کے تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

"اچھا قسم کھاؤ کہ مجھے اکیلا نہ چھوڑ دو گے۔"

"قسم کھاتا ہوں۔ میری روح۔ میری زندگی۔ میں تمہیں اکیلا ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ بس اب جلدی کر ڈالو۔ ساتھ کچھ لے جانے کی ضرورت نہیں درامل میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہ سمجھے کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہے ہیں بس اپنا پرس لے جاؤ تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ تم شاپنگ کے لیے جا رہی ہو۔"

ذرا دیر بعد پولین عمارت سے نکلی۔ پین کھڑکی سے لگا اسے باہر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پولین بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ یک بیک پین کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ آدمی جو بہت دیر سے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ پولین کی سمت حرکت کر رہا تھا۔

"مار ڈالوں گا بدمعاش اگر تو نے پولین پر ہاتھ ڈالا تو جان سے مار دوں گا۔" وہ وحشی درندے کے مانند غرایا پین نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور ٹٹولا اور تیزی سے نیچے اتر آیا۔ وہ خود بھی بس اسٹاپ کی طرف بڑھا لیکن اس نے دور سے دیکھا کہ پولین بس پر سوار ہو گئی ہے اور بس چل پڑی ہے۔ لیکن وہ آدمی بس پر سوار نہیں ہوا۔ وہیں کھڑا رہا۔ پین نے خود کو ایک شکستہ سی دیوار کی آڑ میں کر لیا تاکہ اس پر اس آدمی کی نظر نہ پڑ سکے۔ اسی لمحے ایک نوجوان اور خوبصورت عورت ایک ٹوکری لیے ہوئے نمودار ہوئی۔ مرد اسے دیکھتے ہی غصے میں برس پڑا۔

"کہاں رہ گئی تھیں۔ گھنٹے بھر سے کھڑا سوکھ رہا ہوں۔"

پین نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ بڑا خوش تھا کہ اس آدمی کو قتل کرنے سے بچ گیا۔ واپسی میں اس کی مڈبھیڑ عمارت کے چوکیدار سے ہو گئی۔

"مسٹر پین۔ کیا آپ باہر گئے ہوئے تھے۔ ایک شخص آپ کو پوچھ رہا تھا۔"

"کسی کو بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔" اس نے منہ بنا کر بے رخی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ دل ہی دل میں وہ سخت پریشان تھا۔ اُس نے سوچا کہ وہ آدمی یقیناً پولس کا ہو گا۔ اپنے کمرے تک جانے کے لیے اس نے لفٹ کے بجائے زینے کو ترجیح دی۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں کمرہ خالی چھوڑ کر نیچے گیا۔ وہ آدمی یقیناً اس کی گرفتاری کے لیے یہیں آس پاس کہیں چھپا ہو گا۔

پین نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور ٹٹولا۔ مگر باہر نہیں نکالا وہ مقابلے کے لیے خود کو اچھی طرح تیار کر لینا چاہتا تھا۔ پھولی ہوئی بے ترتیب سانسوں کے ساتھ جب وہ اوپر پہنچا تو اسے ایک شدید ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ کمرے کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ خطرے کے احساس سے اس کا دل بڑی طرح دھڑکنے لگا وہ دبے پاؤں دروازے تک گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا پین نے فائر کر دیا۔ گولی سیدھی اس کے قلب میں پیوست ہو گئی۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر کرسی سے نیچے آ رہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ اس نے سوچا یہ ضرور اس کا وارنٹ ہو گا۔ اس نے لفافہ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا یہ لفافہ اُسی کے نام تھا۔ اس نے کھول کر دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لفافے میں ٹائپ کیا ہوا ایک کاغذ رکھا تھا۔ یہ انشورنس کمپنی کی طرف سے آیا تھا جس میں اسے یاد دلایا گیا تھا کہ اس کی قسط ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ وہ اپنی پہلی فرصت میں قسط ادا کر دے۔ اس نے انشورنس ایجنٹ کو مار دیا تھا

پین نے تأسف سے سر ہلایا اور کہا۔ یہ اس کی خود اپنی غلطی تھی۔ اسے آج ہی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر بلا اجازت میرے کمرے میں کیوں داخل ہوا؟"
فائر کی آواز پوری عمارت میں پھیل گئی تھی۔ فلیٹ کے مکینوں میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پین نے جلدی سے لاش کو گھسیٹا اور غسل خانے میں چھوڑ آیا۔ وہ واپس آیا تو دیکھا کچھ لوگ کمرے میں جھانک رہے ہیں اسے بڑا غصہ آیا۔
"کیا ہوا مسٹر پین؟" ایک شخص نے سوال کیا۔
"کچھ نہیں طشتری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔"
"کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہو؟" مجمع میں سے کسی دوسرے شخص کی آواز اُبھری۔
پین کا خون کھول گیا۔ ان بدبختوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں اپنی بیوی سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔ اس نے لوگوں کے چہرے اور آنکھوں کے تجسس سے اندازہ کر لیا تھا کہ انہیں اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا اس نے جھپٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت وہ بڑی پریشانی میں تھا۔ اس کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ ۲۴ گھنٹے سے کم مدت میں اس نے یہ تیسرا قتل کیا تھا۔ اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ فلیٹ کے مکینوں نے پولس کو فون کر دیا ہوگا۔ وہ کھڑکی کے قریب آیا اور باہر جھانکنے لگا۔ اس کا خون خشک ہو گیا۔ چوکیدار ایک سپاہی کو لیے ہوئے عمارت میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ باورچی خانے سے ایک پلیٹ لایا اور فرش پر گرا کر توڑ دیا۔ وہ پولس کے ہاتھ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ اس نے آٹھ بج کر بیس منٹ پر پولین سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ہر حال میں پولین سے ملے گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ خواہ دو قتل اور کرنے پڑیں۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔ لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا لفٹ کی طرف بھاگا۔ مگر نہیں۔ لفٹ سے جانا بے کار تھا۔ اس سے تو سپاہی آ رہا ہوگا۔ وہ پلٹا اور زینے پر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ پانچویں منزل پر پہنچ کر وہ بے دم سا ہو گیا۔ اسے آس پاس کے مکانوں کی چھتوں کے ذریعے راہ فرار اختیار کرنی چاہیے۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سے اُسکے پڑوسیوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔
"وہ اوپر بھاگا ہے۔ اوپر۔"
وہ مزید زینے طے کرنے لگا۔ اب وہ آٹھویں منزل پر تھا۔ یہ آخری منزل تھی۔ تھکن سے اس کی بری حالت تھی۔ سینے میں سانس نہیں سما رہی تھی۔ اچانک نیچے سے آواز آئی۔
"خبردار۔ دونوں ہاتھ اوپر کر لو اور جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔"
پین نے جھک کر دیکھا۔ سپاہی چھٹی منزل کی گیلری میں کھڑا اس کا نشانہ لے رہا تھا۔ پین نے ریوالور نکالا اور فائر کر دیا۔ مگر سپاہی بھی فائر کر چکا تھا۔ پین کی گولی کام کر گئی تھی۔ سپاہی ذرا اُنز چھا ہوا۔ لڑکھڑایا۔ اور لڑھکتا ہوا چھٹی منزل سے بہت نیچے سڑک پر جا پڑا۔
"چارا" پین دانت پیس کر بولا۔
وہ پلٹ کر قریبی مکان کی چھت پر اُتر گیا تھا۔ اس کی بائیں ران میں سوزش ہو رہی تھی۔ سپاہی کی گولی نے گوشت پھاڑ دیا تھا جس سے خون نکل نکل کر پتلون بھگو رہا تھا۔ وہ بھاگتا رہا بھاگتا رہا۔ ایک چھت سے دوسری چھت پر دوسری چھت سے تیسری چھت پر۔ بالآخر وہ بُری طرح تھک گیا۔ اسے نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ خون بہت بہہ گیا تھا۔ اب بھی آہستہ آہستہ رس رہا تھا۔ بے تحاشا بھاگنے کی وجہ سے رگوں سے خون بہت تیزی سے خارج ہوا تھا۔ پتلون ٹانگ سے چپک گئی تھی۔ بہت سارا خون جوتوں میں بھر گیا تھا جس سے اب دوڑنے میں بھی رکاوٹ ہو رہی تھی۔ مگر وہ رُک نہ سکتا تھا — اُسے ہر صورت میں پولین تک پہنچنا تھا اس نے سوچا کہ — مرنا ہی ہے تو پولین کی گود میں مرے گا۔
بہت دور نکل آنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا اُسے خوشی ہوئی کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ سپاہی کا حشر دیکھ لینے کے بعد بھلا کون اس کا تعاقب کر سکتا تھا۔ وہ ایک مکان کی چھت سے نیچے اُتر آیا۔ اور لفٹ کے ذریعے نیچے جانے لگا۔ خوش قسمتی سے اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ بس ڈر یہ تھا کہ لفٹ میں کسی سے مدبھیڑ نہ ہو جائے۔ اس نے زخم پر انگلی رکھ لی تھی تاکہ خون کا رِسنا بند ہو جائے۔ اسے معلوم تھا کہ اسی عمارت کے ایک گوشے میں چھوٹا سا اسٹور روم ہے۔ جہاں کاٹھ کباڑ بھرا رہتا ہے اور کوئی اُدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ وہ جگہ نسبتہً تاریک اور محفوظ تھی۔ وہ خود کو گھسیٹتا ہوا اسٹور روم تک لے گیا اور بے سُدھ ہو کر گر پڑا۔
بہت سارا خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ بچے گا نہیں۔ مگر وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ پولین سے ملنا بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا اور قمیص سے ایک دھجی پھاڑ

کر مضبوطی سے زخم پر باندھ لی جس سے خون کسی حد تک بہنا بند ہو گیا وہ رات کا انتظار کر رہا تھا۔ جب ہر طرف تاریکی چھا جائے گی تب وہ نکلے گا۔ اس طرح پہچان لیے جانے کے امکانات کم سے کم تر ہو جاتے تھے۔ پین نے خون میں انگلی ڈبوئی اور فرش پر لکھ دیا "پولین! میں تم سے محبت کرتا ہوں" اگر اس تہہ خانے میں مرنا ہی پڑا تو کم از کم پولین کو اس کی وفاداری کا یقین تو ہو ہی جائے گا۔

رات سر پر آ گئی۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے اٹھایا اور گھسٹتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ عمارت سے نکل کر وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں پہنچا۔ اب وہ کسی ٹیکسی کی جستجو میں تھا۔ ذرا دیر بعد ایک ٹیکسی اسے مل گئی۔

"کہاں جایئے گا صاحب" ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"کیا وقت ہوا ہے" پین نے الٹا ایک سوال جڑ دیا۔

"چھ بجنے والے ہیں"

پین کے پاس کافی وقت تھا۔ چنانچہ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو شہر سے دور مضافات میں چلنے کو کہا۔ وہ اس اسٹیشن کے نزدیک رہنا چاہتا تھا جہاں سے اسے ٹرین پر سوار ہونا تھا۔ ٹیکسی حرکت میں آ گئی۔ گولی پین کی ران میں اندر تک دھنس گئی تھی اور بار بار کچوکے دے رہی تھی۔ پین کو کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ تکلیف سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہ بھی نکل جاتی تھی۔ جب ٹیکسی شہر سے بہت دور نکل آئی تو ڈرائیور نے اس سے سوال کیا۔

"کہاں اتریئے گا جناب؟"

"فی الحال اترنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تم اسے ایک طرف کھڑی کر لو۔ اور ہاں جب آٹھ بجیں تو مجھے بتا دینا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک مناسب جگہ پر ٹیکسی روک دی۔ وہ اپنے اس عجیب و غریب مسافر کے متعلق سوچنے لگا۔۔ اس نے اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے میں پین کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درد اور کرب کے آثار موجود تھے۔

"کیا آپ زخمی تو نہیں ہیں جناب؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا

پین سٹپٹا گیا "نن۔۔ نہیں تو"

"کوئی اور پریشانی؟"

"میں عارضۂ قلب کا مریض ہوں"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کو کسی ڈاکٹر تک لے چلوں"

"نہیں نہیں میں یونہی ٹھیک ہو جاؤں گا" پین گھبرا کر بولا۔

"بس اتنی مہربانی کرنا کہ جب آٹھ بج جائیں تو مجھے مطلع کر دینا"

ٹیکسی ڈرائیور خاموش ہو گیا اور ٹیکسی ادھر ادھر گھمانے لگا اور مسلسل آئینے میں پین کے چہرے کو بھی گھورتا رہا۔ آخر کار آٹھ بج گئے، اس نے گاڑی کھڑی کر دی اور وقت بتانے کے لیے پیچھے پلٹا! اچانک اس کی نگاہ خون میں لت پت سیٹ پر پڑ گئی۔ خون پوری سیٹ پر پھیل گیا تھا اور اب لکیر کی صورت میں بہہ بہہ کر نیچے آ رہا تھا۔ پین کی پتلون بھی خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور بری طرح بوکھلا گیا۔

"جناب آپ تو زخمی ہیں۔!"

"کوئی پروا نہیں بس تم چلتے رہو"

"آپ کو علاج کی ضرورت ہے۔ میں ہسپتال لیے چلتا ہوں"

"نہیں ہرگز نہیں" پین ہذیانی انداز میں چیخا۔

ڈرائیور گاڑی سے نیچے اُتر آیا اور اس پاگل مسافر کو دیکھنے لگا۔ اسے پین کی حالت پر بہت ترس آرہا تھا۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے دروازہ کھولا اور آدھا دھڑ اندر داخل کر دیا۔ اس وقت پین کے ریوالور سے گولی چلی اور ڈرائیور کا بھیجا پاش پاش ہو گیا۔ وہ منہ کے بل پین پر آرہا۔ اس کا آدھا دھڑ ٹیکسی سے باہر تھا۔

پین بمشکل تمام ٹیکسی سے باہر نکلا۔ کھینچ کھانچ کر ڈرائیور کو اندر ڈال دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ خود آکر بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ سوا آٹھ بج چکے تھے۔ اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ ۱۰ منٹ کے اندر اندر اُسے اسٹیشن تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بہت تیز رفتاری اور گاڑی پر حیرتناک کنٹرول کا مظاہرہ کیا۔ اس نے دُور ٹرین کی سیٹی کی آواز سُنی۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ٹرین اسٹیشن پر صرف دس منٹ کے لیے رُکتی ہے۔ چنانچہ اس نے رفتار اور بڑھا دی۔ اسپیڈ میٹر پر سوئی ۹۰ اور ۱۰۰ کے درمیان تھر کنے لگی۔ اس نے اصل راستہ چھوڑ دیا اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ گاڑی دوڑانے لگا۔ کئی بار گاڑی اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ جس وقت وہ آخری ڈبّے کے قریب پہنچا۔ انجن روانگی کے لیے آخری سیٹی دے رہا تھا۔ پین نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی۔ اُترا اور لڑکھڑاتا ہوا بھاگ کر ڈبّے کے ہینڈل سے لٹک گیا۔ اسی لمحے ٹرین چل پڑی۔

حواس بحال ہوئے تو وہ ڈبّے کے اندر داخل ہوا۔ پولین اس ڈبّے میں نہیں تھی۔ وہ دوسرے ڈبّے میں داخل ہوا۔ پولین یہاں بھی نہیں تھی۔ اب پین کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈر رہی تھی۔ مگر وہ پولین کی تلاش میں مسلسل اپنے آپ کو گھسیٹے جا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا تیسرے ڈبّے میں داخل ہو گیا۔ اب اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ دماغ سُن ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پولین کو تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جھول کر نیچے آرہا۔ اچانک کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے پین یہ تم ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے؟"

پین کا ڈوبتا ہوا ذہن ایک لمحے کے لیے بیدار ہو گیا۔ اس نے پولین کی آواز سُنی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پولین اس پر جھکی ہوئی تھی۔

"یہاں اور کون کون ہے پولین"۔ اس نے نقاہت سے پوچھا

"اتفاق سے میرے سوا کوئی بھی نہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟"

"روشنی بہت زیادہ ہے۔ میری آنکھیں چوندھیا رہی ہیں"۔

"روشنی؟" پولین حیرت سے بولی "نہیں تو روشنی بڑی معقول اور مناسب ہے"۔

"میں بہت تھک گیا ہوں پولین۔ حد سے زیادہ"۔ وہ درد سے کراہا۔

"آؤ میرے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے بہت پریشان تھی پین"۔

"تم نے دیکھا میں اپنے قول کا کتنا سچا ہوں۔ بالآخر تم تک پہنچ گیا"۔ پین پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"ذرا آرام کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے"۔ پولین محبت سے بولی۔

پولین پہلو بدل کر ٹھیک سے بیٹھنے لگی تاکہ شوہر کو آرام سے لٹا سکے۔ اس کا ہینڈ بیگ سیٹ سے نیچے گر کر کھُل گیا۔ اس میں سے بہت سارے نوٹ نکل کر ہوا میں اُڑنے لگے۔

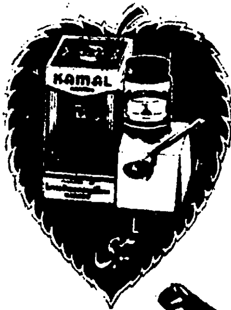
"یہ۔ یہ نوٹ تم نے کہاں سے حاصل کیے پولین"۔ پین اپنی جیب پر ہاتھ مارتا ہوا حیرت سے بولا۔

"میں آج صبح تمہیں اس کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ مگر تم نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ ہر بار میری بات کاٹ دی۔ میں کل شام مسٹر برگ کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے ہماری بقایا رقم ۲۵۰ ڈالر مجھے دے دی تھی۔ پین یہ مسٹر برگ بہت نیک اور مہربان آدمی ہیں۔ جیسے ہی انہوں نے ہماری تکلیف سُنی فوراً پیسے نکال کر دے دیے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہے تھے۔ ان سے الگ ہونے کے بعد تم اُن سے ایک بار بھی نہیں ملے!"

مگر اب پین کے کانوں میں پولین کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔

مقویات کے استعمال سے قبل دواساز ادارہ کی
کارکردگی اور مقبولیت کو ہمیشہ مدنظر رکھئے۔
مرکب کے اجزا سے آپ کا اور آپ کے معالج کا واقف
ہونا ضروری ہے، کمال کے بکس پر اجزا درج ہیں۔

Restores vigour
and vitality



کمال
اعادۂ شباب کی لاثانی دوا



کمال جسم کے اہم غدودوں کو (گلینڈز) تحریک دے کر
کیمیاوی سیال و رطوبات غریزی کی تراوش بڑھا کر ہارمونس
کا اضافہ کرتی ہے جو حرارت غریزی (وٹیل پاور) کی معاون ہے
کمال بدرجہ اعلیٰ مقوی اعصاب (نروائن ٹانک) ہے۔
قوئ جسمانی کو بھرپور طاقت و توانائی حاصل ہوتی ہے
جس سے تمام خوابیدہ قوتیں از سر نو عود کر آتی ہیں۔
منشی اور زہریلی دواؤں سے بالکل پاک ہے۔
آزمائشی کورس ۱۲ روز ——— مکمل کورس ۲۴ روز

تیار کردہ:
طبی دواخانہ کراچی
نیپئر روڈ کراچی ——— ناظم آباد ۲ کراچی ——— بلچیت روڈ حیدرآباد

خوش نصیب

★★★

اُن کی شادی شدید محبت کا نتیجہ تھی۔ تیس (۳۰) سال تک شاندار ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد وہ بتدریج ایک دوسرے سے دُور ہٹتے گئے اور پھر باہمی رضامندی اور افہام و تفہیم سے بڑے قابلِ عزت طریقے پر جدا ہو گئے۔

وہ وزارتِ داخلہ میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ دولتمند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت فیاض اور نرم دل واقع ہوا تھا۔ دوستوں کی مدد کرنے پر ہر وقت تیار رہتا، اور خوشی محسوس کرتا لیکن اسے ایسے لوگوں سے قطعی ہمدردی نہ تھی جو دولت اور شہرت کی خاطر خطرات مول لیتے اور نتیجتاً برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ دو گھنٹے کے لئے کلب جاتا، برج کھیلتا، سنیچر اور اتوار کو وہ گولف میں مشغول رہتا۔ چھٹیاں گزارنے وہ ہمیشہ باہر جاتا، اور اونچے ہوٹل میں قیام کرتا۔ گرجا گھر، آرٹ گیلریز اور عجائب گھروں کی سیر کا وہ شائق تھا۔ وہ کافی خوش خوراک، خوش پوشاک اور خوش مذاق تھا۔ اس کے تقریباً سب ہی دوست اسے پسند کرتے تھے۔ اس کی گفتگو شیریں معلومات سے پُر اور دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوبرو نہ تھا مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی اور وقار تھا وجاہت اور دبدبہ۔ وہ دُبلا پتلا دراز قد تھا۔ سر کے بال قدرے جھڑنے لگے تھے کیونکہ اب وہ پچاس (۵۰) کی سرحدوں کو چھُو رہا تھا۔ لیکن اس کی بھوری آنکھوں میں ہر وقت مسکراہٹ رقص کرتی رہتی۔ اس کی جسمانی بناوٹ کافی اچھی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنی صحت کا خیال رکھتا تھا۔ دُنیا میں کوئی حصہ ایسا نہ تھا کہ وہ وہاں خوش نہ رہتا ہو۔ یار باش، زندہ دل اور لطیف مزاج کا حامل یہ شخص رچرڈ ہاورڈ بہت مقبول شخص تھا۔

بیوی سے علیحدگی کے بعد اس نے اپنا پرانا مکان فروخت کر کے ایک خوبصورت علاقے میں فلیٹ خرید لیا۔ ایک کمرے میں اس نے اپنی کتابیں سجا دیں۔ ڈرائینگ رُوم میں اپنا فرنیچر جما دیا اور ایک خوبصورت سی خوابگاہ بنالی۔

باورچی خانے سے دُور دو کمرے ملازمین کے لئے بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی پرانی باورچن کو بھی ساتھ ہی لیتا آیا تھا۔ باقی سب ملازموں کو علیحدہ کر کے اس نے دفترِ روزگار میں ایک ملازمہ کے لئے درخواست دی۔ اسے کس قسم کی ملازمہ درکار تھی اس کے بارے میں اس نے دفترِ روزگار کے منتظم کو تفصیلات بتا دی تھیں۔ وہ ایک ایسی ملازمہ کا خواہشمند تھا جو زیادہ نوجوان نہ ہو کیونکہ اس قسم کی ملازمائیں اُڑ جاتی ہیں اور حالانکہ اب وہ ایک معمر آدمی تھا مگر پھر بھی لوگوں کو باتیں بنانے سے کون روک سکتا ہے۔ اسے اپنی شہرت اور نیک نامی بہت عزیز تھی۔ اسے تو ایک ایسی ملازمہ کی ضرورت تھی جو اس کے چاندی کے برتنوں کو اچھی طرح صاف کر سکے اور چمکا سکے جو اس کے خاندانی ورثہ تھے اور اسے بہت عزیز تھے۔ اپنی مہمان نواز طبیعت کی وجہ سے ہفتے میں ایک بار وہ اپنے دوستوں کو ڈنر پر مدعو کرنے کا عادی تھا۔ جس میں آٹھ سے زیادہ آدمی کبھی نہ رہے تھے۔ اسے اپنی باورچن پر اس بات کا پورا بھروسا تھا کہ وہ ہر مہمان کے مزاج کے مطابق ہر کھانا تیار کر سکتی ہے۔ اس کے ہاں واقعی ایک ایسی ملازمہ کی کمی تھی جو کھانے کے دوران مہمانوں کی تواضع کر سکے۔ صفائی اور ستھرائی اوّلین شرط تھی۔

وہ عمدہ لباس کا بھی بڑا شوقین تھا اور ایسے لباس کا شوقین تھا جو اس کے مزاج اور عمر کی مناسبت سے ہو۔ اب اس کی مطلوبہ ملازمہ میں یہ خصوصیت بھی ہونا لازمی تھی کہ وہ اس کے لباس اور ٹائیوں کو اچھی طرح پریس کر سکے اور خاص طور پر اس کے جوتوں کو روزانہ اس قدر چمکائے کہ لوگ اس میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ سکیں۔

اس سلسلے میں اس کی خواہش تھی کہ صرف ایسی ہی خواتین درخواست دیں جن کے ساتھ کوئی دم چھلاّ نہ ہو۔ وہ سنجیدہ، ایماندار، قابلِ اعتماد اور دلکش نظر آنے والی ہو۔ اس کے بدلے وہ ان کو بہترین معاوضہ، مناسب آزادی اور


سمرسٹ ماھم
کی ایک دلچسپ کہانی
راجپوت اقبال احمد

وقتاً فوقتاً رخصت دینے پر تیار تھا۔

روزگار کے دفتر کے افسر نے اس کی تمام شرائط آنکھ جھپکائے بغیر سُنیں پھر اس نے اسے ملازمت کی خواہشمند خواتین کی ایسی فہرست دکھائی جس میں اسے یقین تھا کہ ایک خاتون ضرور اس کی پیش کردہ شرائط پر پوری اُتر سکے گی۔

اس نے ذاتی طور پر تمام امیدوار خواتین کو دیکھا۔ ان میں سے بعض بالکل ناکارہ نظر آتی تھیں۔ کچھ اس کی شرائط پر پوری نہ اترتی تھیں۔ غرض یہ کہ ان میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جسے وہ آزمائشی طور پر بھی رکھ سکتا۔ وہ بڑا مہربان آدمی تھا چنانچہ اس نے مسکراہٹ اور افسوس کے ساتھ ان سب کو لوٹا دیا۔ اس طویل جدوجہد کے بعد وہ اب بھی کسی بھی عورت کا اپنی ملازمہ کی حیثیت سے انٹرویو لینے کے لئے تیار تھا لیکن اس کی یہ خواہش کہ وہ ایک مثالی ملازمہ چاہتا ہے، ظاہر ہے خاصی احمقانہ تھی۔ ایک مکمل ملازمہ جس میں اس کی مطلوبہ خوبیاں موجود ہوں اس زمانے میں ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

"جناب میں نے سنا ہے کہ آپ کو ایک ملازمہ کی تلاش ہے۔" ایک دن اس کے پورٹر نے کہا۔ "میری نظر میں ایک ایسی خاتون ہے جسے ملازمت کی تلاش ہے۔"

"کیا تم ذاتی طور پر اس کی سفارش کرتے ہو؟" رچرڈ نے کہا۔ "اس کا خیال تھا کہ کسی ملازمہ کے لئے دوسرے ملازم کی سفارش مالک کی رائے سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

"میں اس کے باعزت ہونے کی قسم کھا سکتا ہوں جناب وہ کسی زمانے میں اچھے حالات دیکھ چکی ہے۔"

"اچھا۔ میں تقریباً سات بجے لوٹوں گا اور اگر وہ اس وقت بھی آئے تو مجھے اس سے مل کر خوشی ہوگی۔"

"بہتر جناب عالی، میں کوشش کروں گا کہ اس تک اطلاع پہنچا سکوں۔"

اس کی واپسی کے پانچ منٹ بعد ہی پورٹر نے اطلاعی گھنٹی سن کر دروازہ کھول دیا اور پھر پورٹر نے اسے بتایا کہ خاتون آچکی ہے۔

"اسے اندر لے آؤ۔" وہ بولا۔

اس نے روشنی تیز کر دی تاکہ آنے والی خاتون کا بغور جائزہ لے سکے۔ اور پھر آتش دان کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت اندر آئی اور دروازے کے سامنے ہی کھڑی ہو گئی۔

"شام بخیر۔" وہ بولا۔ "تمہارا نام؟"

"مسز ایلیس جناب عالی۔" اس نے مختصر مگر شیریں آواز میں جواب دیا۔

"تمہاری عمر کیا ہوگی؟"

"پینتیس (۳۵) سال جناب۔"

"مناسب عمر ہے۔" اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ خاتون کا قد تقریباً اس کے ہی برابر تھا لیکن اس نے دیکھ لیا کہ وہ ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے ہے۔ اس کا سیاہ لباس اس پر خوب سج رہا تھا۔ وہ بڑی نفاست پسند اور دلکش لگ رہی تھی۔ "اپنا ہیٹ اتار دو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بال زردی مائل بھورے تھے جو بالکل صاف اور اچھی طرح سنوارے گئے تھے۔ وہ مضبوط اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔ نہ ہی وہ موٹی تھی اور نہ ہی دبلی۔ ایک اچھی یونیفارم میں وہ جاذب نظر لگ سکتی تھی حالانکہ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ تاہم اپنے متناسب جسم اور لباس پہننے کے سلیقے کی وجہ سے خاصی پُرکشش لگتی تھی۔ اس نے اس سے کئی سوالات کئے۔ جن میں سے ہر ایک کا اسے تسلی بخش جواب ملا۔ اس کی پچھلی ملازمت چھوڑنے کا سبب قطعی مناسب تھا۔ وہ ایک تربیت یافتہ بٹلر تھی اور اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک ایسے آدمی کے پاس ملازم تھی جس نے اس کو ایک بٹلر کے پاس کپڑوں پر پریس کرنے کی تربیت پر بھیجا تھا۔ وہ کچھ شرمیلی تھی لیکن نہ ہی بزدل تھی اور نہ ہی چھوٹی موٹی قسم کی عورت۔ اس کے جوابات سے وہ بڑا متاثر ہوا۔

"اب اِدھر دیکھو۔" وہ بولا "میرا خیال ہے کہ اب میں تمہیں رکھ ہی لوں مجھے بھاگ جانے والیوں سے نفرت ہے۔ میری باورچن میرے پاس بارہ سال سے ملازم ہے۔ اگر تم مجھے پسند آئیں اور یہ جگہ تم اپنے لئے موزوں سمجھو تو میرا خیال ہے کہ تم رُک جاؤ گی میرا مطلب ہے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میرے پاس آؤ اور کہو کہ تم شادی کر رہی ہو اور ملازمت چھوڑ رہی ہو۔ ایسی باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔"

"اس بات کا کوئی اندیشہ نہ کیجئے جناب۔ میں بیوہ ہوں اور اب کوئی ایسا نظر نہیں آتا کہ جو مجھ سے اس حالت میں شادی کرنے پر رضامند ہو، میرے شوہر نے شادی کے بعد مرنے تک کوئی کام نہیں کیا۔ میں ہی اس کا خرچہ چلاتی رہی۔ اب مجھے صرف جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک اچھا گھر ہے اچھا گھر۔ اچھا ماحول۔ اچھے لوگ۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "شادی اچھی چیز ہے لیکن اسے

عادت بنا لینا بڑی غلط بات ہے۔" اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن وہ اس کے فیصلے کی منتظر تھی۔ اس نے اسے تنخواہ بتائی جو اس کے لئے بالکل مناسب تھی۔ پھر وہ اسے اپنے اور مکان کے بارے میں کچھ بتانے لگا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ پہلے ہی سے اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے ایسا لگتا تھا جیسے اس نے درخواست دینے سے پہلے ہی ساری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس سے اس کی فرض شناسی اور بہتر کارکردگی کا اظہار ہوتا تھا۔

اگر میں تمہیں ملازم رکھ لوں تو کب سے آسکو گی؟ میرے پاس اس وقت کوئی آدمی کام کرنے والا نہیں ہے۔ باورچن اپنے مقدور بھر کام کرتی ہے۔ لیکن میں جتنی جلد ہو سکے تمہیں یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بہتر جناب۔ میں پچھلی ملازمت سے ایک ہفتے کی چھٹی پر ہوں۔ میں کل تک آپ کے پاس آسکوں گی۔"

رچرڈ کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی چھٹیاں برباد کرو۔ تم ایک ہفتے بعد آسکتی ہو۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنا کام چلا لوں گا۔ اب جاؤ جب تمہاری چھٹیاں پوری ہو جائیں تو آجانا۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔ کیا میں دوسرے ہفتے تک آجاؤں؟"

"بالکل ٹھیک۔" جب وہ چلی گئی تو رچرڈ نے محسوس کیا کہ اس نے دن کا کام بہتر طریقے سے کیا ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے اس کی مطلوبہ چیز مل گئی ہو۔ اس نے باورچن کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی اور اسے بتا دیا کہ اس نے آخر کار ملازمہ رکھ لی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے معیار پر پوری اترے گی جناب۔" وہ بولی۔ "وہ دوپہر میرے پاس آئی تھی اور اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتی ہے۔ وہ ان بھاگ جانے والیوں میں سے نہیں لگتی۔"

"دیکھ لیتے ہیں مسز جیڈی، میرا خیال ہے کہ یہ انتخاب بہت مناسب ہے۔"

"جی ہاں جناب میرے خیال میں یہ خاتون آپ کے لئے ہر طرح موزوں رہے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"وہ کہتی تھی کہ مجھے بھی ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے جو کام کی قدر جانتا ہو۔ ایسے آدمی کا کام کرنے میں کوئی مزا نہیں آتا جسے کام کی قدر نہ ہو۔

مجھے امید ہے کہ آپ اسکے کام سے یقیناً خوش ہوں گے۔ آپ فخر محسوس کریں گے۔"

"میں واقعی یہی چاہتا ہوں۔"

"وہ اپنے کام میں اتنی ہوشیار ہے جناب کہ وہ تو آپ کے لئے کسی نعمت سے کم نہ ہو گی۔"

اور مسز ایلسی اس کے لئے ایسی ہی ثابت ہوئی۔ آج تک کسی آدمی کی اس طرح سے خدمت نہیں کی گئی ہو گی۔ اس نے ایسے شاندار طریقے سے جوتے چمکائے کہ جب وہ اس صبح اپنے آفس میں گیا تو اس کے قدم زیادہ باوقار انداز میں پڑ رہے تھے۔ کوئی بھی شخص اس کے جوتوں میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اس کے کپڑوں کو کچھ ایسے انداز میں سنوارا کہ وہ جلد ہی اپنے دوستوں میں خوش لباس آدمیوں کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ ایک دن جب وہ وقت سے پہلے گھر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باتھ روم میں اس کی جرابیں اور رومالوں کی قطار خشک ہونے کے لئے لٹکی ہوئی ہے۔ اس نے ایلسی کو بلایا۔

"مسز ایلسی کیا تم نے خود میرے رومال اور جرابیں دھوئی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں۔"

"لانڈری میں یہ تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں جناب۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض

نہ ہو تو انہیں گھر پر ہی دھو لیا کروں۔"
وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے کس موقع پر کیا پہننا ہے اور وہ بغیر اس سے پوچھے جانتی تھی کہ وہ شام کو ڈنر جیکٹ اور سیاہ ٹائی پہنے گا یا کوٹ اور سفید ٹائی۔ جب اسے کسی پارٹی میں جانا ہوتا جہاں اسے اپنی حیثیت کا اظہار کرنا ہوتا تو اسے اپنے کوٹ پر خوب چمکدار تمغے لگے ہوئے ملتے۔ اب اس نے صبح کے وقت لباس کا انتخاب کرنا ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ اسے ہر بار مناسب ترین لباس مل جاتا تھا۔ ایلسی کا ذوق مکمل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے خطوط پڑھتی ہے کیونکہ وہ اس کے تقریباً ہر پروگرام سے واقف ہوتی تھی اگر کبھی وہ اپنا کوئی پروگرام بھول بھی جاتا تو اسے ڈائری دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کیونکہ ایلسی اسے بتا دیا کرتی تھی۔ وہ اس بات سے پوری طرح واقف تھی کہ ٹیلیفون پر کس شخص سے کس لہجے میں بات کرنی چاہیئے۔ وہ اپنی نشست گاہ میں بیٹھا اس کی گفتگو سنتا رہتا جو ٹیلیفون پر بڑے خلوص سے مخاطب کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے اور پھر وہ اندر آکر اسے بتاتی کہ فلاں فلاں نے فون کیا تھا جس کے لئے اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ وقت ضائع کیا جائے۔

"بالکل ٹھیک۔" رچرڈ مسکرا کر کہتا۔
اب اس کے تمام دوست ایلسی ہی کے ذریعے اس سے ملاقات کا وقت مقرر کرتے اور وہ اس کی واپسی پر اسے شام کا پروگرام بنا دیتی۔
"مسز سومر نے فون کیا تھا جناب اور پوچھا تھا کہ کیا آپ ان کے ساتھ جمعرات کو لنچ لینا پسند کریں گے۔ جس کے لئے میں نے معذرت کر دی لیکن آپ کو لیڈی ورسنٹر کے ساتھ لنچ لینا ہے۔ مسٹر اوکلے نے فون کیا تھا اور کہہ رہے تھے کہ کیا آپ اگلے منگل کو کوکٹیل پارٹی میں شرکت کریں گے۔ میں نے جواباً کہہ دیا کہ اگر ممکن ہو سکا تو۔ لیکن آپ کو اس وقت ڈینسٹ کے ہاں جانا ہے۔"
"درست ہے۔"
وہ فلیٹ کو جھاڑ پونچھ کر بالکل نیا بنائے رکھتی۔ ایک مرتبہ جب وہ نئی نئی تھی، رچرڈ نے چھٹی سے واپس آکر شیلف میں سے کتاب نکالی، اس پر سے گرد جھاڑی گئی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی۔
"میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا تھا کہ مجھے کسی بھی حالت میں دوسروں کو اپنی کتابیں چھونا پسند نہیں۔ جب کبھی کتابیں صفائی کے لئے نکالی جاتی ہیں تو انہیں ان کی مقررہ جگہ پر نہیں رکھا جاتا۔ کتابیں صاف نہ ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن مجھے اس بات سے چڑ ہے کہ انہیں تلاش کرنے میں وقت لگے۔"
"میں بے حد شرمندہ ہوں۔" ایلسی نے کہا۔ "یقیناً کچھ لوگ اپنی کتابوں کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں، لیکن میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ ہر کتاب اپنی مقررہ جگہ پر رکھی رہے۔"
رچرڈ نے اپنی کتابوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہر کتاب اپنی جگہ موجود تھی۔
"میں معذرت چاہتا ہوں مسز ایلسی۔" اس نے کہا اور مسکرا دیا۔
"کتابوں پر بہت گرد جمی ہوئی تھی، اگر آپ انہیں اٹھاتے تو یقیناً آپ کے ہاتھ گرد آلود ہو جاتے۔"
اس نے رچرڈ کے چاندی کے برتنوں کو بھی پہلے سے کہیں زیادہ چمکا کر رکھا ہوا تھا۔ اس نے تعریفی کلمات کہنے ضروری سمجھے۔ "ان میں سے بہت ساری چیزیں ملکہ این اور جارج اول کی ہیں۔" اس نے بتایا۔
"جی ہاں میں جانتی ہوں۔ مجھے آپ کی ان قیمتی اشیا کی حفاظت کر کے بڑی خوشی ہوتی ہے۔"
"تم نے واقعی بڑی توجہ صرف کی ہے، اس سے پہلے کسی بھی بٹلر نے ان پر اتنی محنت نہیں کی۔"

"مردوں میں عورتوں کی نسبت صبر کا مادہ کم ہوتا ہے"۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔

جیسے ہی اس نے یہ سمجھا کہ مسز ایلیسی اس کے ہاں مستقل رہ پڑی ہے تو پھر اس نے اپنے دوستوں کی ہفتہ وار ضیافتوں کا سلسلہ شروع کر دیا وہ خوب جانتا تھا کہ ایلیسی ضیافت کی میز پر بڑے اچھے انداز میں کام کر سکتی ہے اور یہ دیکھ کر تو وہ حیران رہ گیا کہ مسز ایلیسی پارٹی کے بندوبست کرنے کا بڑا اچھا ذوق رکھتی ہے۔ وہ بڑی چست، خاموش اور ہوشیار تھی۔ وہ میز پر اتنی متوجہ تھی کہ کسی بھی مہمان کو کچھ طلب کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جیسے ہی مہمان کو کسی چیز کی طلب ہوتی تو اس کے کہنے سے پہلے ہی اسے وہ چیز مہیا کر دی جاتی۔ وہ جلد ہی رچرڈ کے گھرے دوستوں کے مزاج سے واقف ہو گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ کون وسکی کے ساتھ سوڈا اور کون پانی پسند کرتا ہے۔ وہ بخوبی جانتی تھی ہاک (ایک قسم کی شراب) کو کس حد تک سرد کیا جائے کہ اس کا ذائقہ نہ بدلے یا کلاریٹ (سرخ شراب) کو کتنی دیر تک کمرے میں رکھا جائے اور اس کی خوشبو کمرے کی فضا میں کتنی دیر میں رچے گی۔ اسے بوتل میں سے شراب کو اس طرح انڈیلتے دیکھ کر کہ ایک قطرہ بھی فرش پر نہ گرے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایک بار اس نے رچرڈ کو اس کی مطلوبہ شراب پیش نہیں کی۔ اس نے اس غلطی کا بڑی سختی سے احساس دلایا۔

"میں نے جب بوتل کھولی جناب تو اس کا کارک ڈھیلا پڑا تھا۔ اسی لئے میں نے آپ کو چیمبر ٹیمن پیش کی کہ وہ زیادہ محفوظ تھی"۔

"بالکل ٹھیک ایلیسی"۔ اس نے ان دعوتوں کا انتظام مکمل طور پر اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے مہمانوں کو بہترین اور ان کی پسندیدہ شراب پیش کرتی اور بعض ایسے لوگوں کو رچرڈ کے اسٹور میں رکھی ہوئی پرانی برانڈی پیش کرتی جن کے بارے میں اسے یقین ہوتا کہ وہ اسے پینے کا ذوق رکھتے ہیں۔ اسے عورتوں کے ذوق پر کوئی اعتماد نہ تھا۔ جب کبھی وہ پارٹی میں شریک ہوتیں تو مسز ایلیسی دعوت ختم ہونے سے پہلے انہیں شیمپین پیش کرتی۔ وہ انگریز خادموں کی طرح سماجی تفریق کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کی دولت اور مرتبے سے متاثر ہو کر انہیں شریف آدمی کا درجہ نہیں دیتی تھی بلکہ رچرڈ کے دوستوں کو اپنے معیار پر پرکھتی۔ انہیں ان کی پسند کے مطابق بوتلوں میں سے شراب پیش کرتی رچرڈ اس بات سے بڑا محظوظ ہوتا۔

"تم نے مسز ایلیسی کو خوب سمجھا ہے"۔ کوئی اس سے کہتا۔ "وہ شراب ہر کسی کو پیش نہیں کرتی جسے پینا آتا ہے اسے دیتی ہے"۔

جلد ہی وہ مکمل اور بہترین خادمہ کی حیثیت سے مشہور ہو گئی۔ لوگ رچرڈ ہاوجر سے اس کی خاطر حسد کرنے لگے۔ ایلیسی بلاشبہ سونے میں تولنے کے قابل تھی۔ وہ موتیوں سے زیادہ قیمتی تھی۔ جب لوگ اس کی تعریف کرتے تو رچرڈ خود کو آگے کرنے کی کوشش کرتا۔

"اچھے مالک ہی اچھے ملازم بناتے ہیں"۔ وہ خوش دلی سے کہتا۔

ایک شام جب وہ پورٹ پیتے ہوئے اس کی تعریف کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ "اگر یہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تو صدمہ تو بہت ہوگا"۔

"یہ مجھے چھوڑ کر جائے گی ہی کیوں۔ ایک دو دوستوں نے اس سے کہا بھی تھا مگر اس نے سب سے انکار کر دیا۔ وہ جانتی ہے کہ کہاں وہ اچھی طرح سے رہ سکتی ہے"۔

"وہ کسی سے شادی کر کے بھی جا سکتی ہے"۔

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قسم کی ہوگی"۔

"کیوں۔ وہ بڑی خوبصورت دکھائی دیتی ہے وہ تو بڑی دلکش ہے"۔

ہاں یہ بات تو ہے۔ وہ خوبصورت تو ضرور دکھائی دیتی ہے"۔

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ وہ بڑی حسین عورت ہے۔ اگر وہ دوسری قسم کی ہوتی تو لوگوں میں اس کے حسن کے چرچے ہوتے اور اس کے فوٹو ہر اخبار میں شائع ہوتے۔"

اسی لمحے مسز ایلیسی کافی لئے اندر آئی۔ رچرڈ ہاوبجر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے روزانہ ہی دیکھا کرتا تھا۔ چار سال کے عرصے سے وقت کیسے پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ اسے تو احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیسی دکھائی دیتی ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی ہو۔ جب رچرڈ نے اسے پہلی بار دیکھا تھا وہ آج بھی ویسی ہی دلکش تھی۔ اس کا متناسب جسم آج بھی بڑی کشش کا حامل تھا۔ سیاہ لباس اس پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

"وہ بلاشبہ قابلِ رشک حسن کی حامل ہے۔ کیا خوب اس کے انداز ہیں۔"

"مجھے تسلیم ہے کہ وہ حسین ہے۔" ہاوبجر نے کہا۔ "وہ مکمل طور پر ایک دلکش عورت ہے۔ میں اس کے بغیر بالکل بے کار ہو جاؤں گا۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

"کیوں نہیں کرتے؟"

"میرا خیال ہے وہ کچھ بور سی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا وہ گفتگو نہیں کرتی۔ میں نے اکثر اس سے بات کرنے کی کوشش کی وہ صرف میری بات کا جواب دیتی ہے اور بس۔ چار سال کے عرصے میں اس نے خود سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے بارے میں قطعی نہیں جانتا۔ خدا جانے وہ مجھے پسند کرتی ہے یا مجھ سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ تو بس ایک مشین کی طرح ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں اسے قابلِ تعریف سمجھتا ہوں۔ اس پر بھروسا کرتا ہوں۔ اس میں دُنیا کی تمام صفات موجود ہیں اور مجھے تعجب ہے کہ میں اس سے آج تک غافل کیوں رہا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کے جذبات سرد ہو چکے ہوں۔"

پھر وہ لوگ چلے گئے۔

دو یا تین دن بعد ایلیسی کی رات کو چھٹی تھی۔ رچرڈ اس رات فرصت میں تھا۔ اس نے تنہا اپنے کلب میں کھانا کھایا۔ ایک ملازم لڑکا اس کے پاس آیا اور کہا کہ اس کے فلیٹ سے ٹیلیفون پر بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی چابیاں چھوڑ آیا ہے، تو کیا وہ چابیاں بھجوا دی جائیں۔ اس نے جلدی سے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ واقعی وہ کپڑے بدلتے وقت چابیاں رکھنا بھول گیا تھا

اس کا ارادہ برج کھیلنے کا تھا لیکن رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے اس نے سوچا کہ فلم دیکھنے کا اچھا موقع ہے۔ اس نے پیغام بھجوا دیا کہ وہ آدھے گھنٹے میں خود ہی چابیاں لینے آ رہا ہے۔ اس نے اپنے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ ایلیسی نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں چابیاں لٹک رہی تھیں۔

"کیا بات ہے مسز ایلیسی تم یہاں کیسے؟"

"جی ہاں جناب۔ میں نے باہر جانا غیر ضروری سمجھا اور مسز جیڈی کو اپنے بجائے بھیج دیا۔"

"جب تمہیں موقع ملا تھا تو باہر گھوم آنا چاہئے تھا۔" وہ اپنے مخصوص متفکرانہ لہجے میں بولا۔ "ہر وقت یہاں پڑے رہنے سے تمہاری صحت یقیناً متاثر ہو گی۔"

"میں کبھی کبھار باہر نکل جاتی ہوں مگر پچھلے ایک ماہ سے شام کو کہیں نہیں نکلی۔"

"کیوں؟ یہ کیا بات ہوئی؟"

"اکیلے جانے میں کچھ لطف نہیں آتا اور یہاں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے ساتھ میں جانا پسند کروں۔"

"کبھی کبھار تفریح کے لئے نکل جایا کرو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

"اب میں نے یہ عادت ترک ہی کر دی ہے جناب۔"

"دیکھو میں ابھی سینما میں جا رہا ہوں تم میرے ساتھ کیوں نہ چلو؟"

اس کا لہجہ بڑا ہمدردانہ تھا۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ کچھ خوفزدہ سا ہو رہا تھا۔

"جی ہاں جناب یہ تو بڑی خوب بات ہے۔" وہ بولی۔

"جاؤ، پھر جلدی سے اپنا ہیٹ لے آؤ۔"

"ایک منٹ میں آئی جناب۔"

وہ اندر چلی گئی۔ رچرڈ نے نشست گاہ میں آ کر اپنا سگریٹ سلگایا اسے اپنی حرکت پر کچھ لطف سا آ رہا تھا اس خیال ہی سے اسے مسرت ہو رہی تھی کہ ذرا سی تکلیف سے وہ کسی کو خوش کرنے کا باعث بن گیا تھا۔ یہ ایلیسی کی خصوصیت تھی کہ وہ ایسے جذباتی مواقع پر نہ تو گھبراتی تھی اور نہ ہچکچاتی تھی۔ اس نے رچرڈ کو صرف پانچ ہی منٹ تک منتظر رکھا۔

جب وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا کہ وہ لباس تبدیل کر کے آئی ہے۔ وہ مصنوعی سلک کا نیلا فراک پہنے ہوئے تھی۔ نیلا بروچ لگا کر سیاہ [illegible] سا ہیٹ سر پر تھا اور سنہرا پٹا گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ ایلیسی بہت جچ رہی تھی۔ اس کے لباس میں سادگی کے ساتھ

ایک وقار بھی تھا۔ انہیں ساتھ دیکھ کر شاید ہی کوئی سوچ سکتا کہ یہ وزارت داخلہ کا ایک اعلیٰ عہدیدار ہے جو اپنی ملازمہ کے ساتھ تفریح کر رہا ہے۔"

"میں انتظار کی زحمت دینے کی معافی چاہتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ باوقار انداز میں بولا۔

اس نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور ایلیسی اس کے ساتھ اس کے پیچھے نکل آئی۔ رچرڈ کے فلیٹ سے سینما کچھ زیادہ دُور نہیں تھا چنانچہ وہ پیدل ہی چل پڑے۔ راستے میں وہ اس سے موسم، سڑکوں کی خستہ حالی اور ایڈولف ہٹلر کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ ایلیسی بڑے مناسب جوابات دے رہی تھی۔ وہ سینما شو شروع ہونے سے ایک لمحے پہلے ہی پہنچ گئے۔ فلم بڑی اچھی تھی مزاحیہ قسم کی۔ چار سال کی طویل مدت میں رچرڈ نے ایلیسی کو شاید ہی مسکراتے دیکھا ہوگا اور اب یہاں وہ اس کے مترنم قہقہے مسلسل سن رہا تھا۔ رچرڈ اسے اس طرح مسکراتا دیکھ کر بڑا محظوظ ہوتا اور پھر اسکرین کی طرف نظریں گھما لیتا۔ یہ ایک شاندار فلم تھی اور دونوں ہی اسے بڑے پُرلطف انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس نے ایک سگریٹ نکالی اور لاشعوری طور پر کیس ایلیسی کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ جناب۔" وہ ایک سگریٹ نکالتی ہوئی بولی۔

اس نے دونوں سگریٹوں کو شعلہ دکھایا۔ اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور وہ رچرڈ کی حرکات سے بیگانہ سی تھی۔ فلم ختم ہونے کے بعد وہ باہر گلی میں نکل آئے اور پھر فلیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

"کیسی خوبصورت تاروں بھری رات ہے؟"

"کیا تمہیں یہ فلم پسند آئی؟"

"بہت خوب جناب۔ یہ تو ایک دلچسپ فلم تھی۔"

اچانک رچرڈ کے ذہن میں ایک خیال آیا "کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"نہیں جناب وقت نہیں ملا تھا۔"

"کیا بھوک محسوس ہو رہی ہے؟"

"تھوڑی سی روٹی اور پنیر رکھا ہے۔ میں جا کر ایک کپ کوکو بھی بنالوں گی۔" وہ گمبھیر سے لہجے میں بولی۔

ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ لوگ چہلیں کرتے۔ ہنستے مسکراتے ان کے قریب سے گزر رہے تھے جیسے ہر طرف کسی نے خوشیاں بکھیر دی ہوں۔

"کیوں نہ کسی ریستوران میں کھانا کھائیں۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"آجاؤ۔"

اس نے ایک ٹیکسی روکی۔ اس کے فیاضانہ جذبات نکھر آئے تھے جو اس کے لئے ایک اندرونی خوشی کے باعث تھے۔ اس نے ڈرائیور کو آکسفورڈ

اسٹریٹ کے ایک شاندار ریستوران کا پتا بتایا۔ اسے امید تھی کہ اس ریستوران میں اس کے کسی جاننے والے سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ لوگ محو رقص تھے۔ ایلیسی کے چہرے پر خوشیاں بکھر گئیں ان کے ایک میز پر بیٹھتے ہی ویٹر آگیا۔

"یہاں ایک مخصوص کھانا ملتا ہے۔" وہ بولا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی اسے پسند کرے گی۔ "میرا خیال ہے کہ ہم بھی وہی منگالیں اور ہاں تم کیا پینا پسند کرو گی۔ تھوڑی سی سفید وائن۔ کیوں؟"

"میرے خیال میں میرے لئے جنجر بیئر کا ایک گلاس مناسب رہے گا۔" وہ بولی۔

رچرڈ نے اپنے لئے وسکی اور سوڈے کا آرڈر دیا۔ ایلیسی نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ حالانکہ رچرڈ کو کچھ ایسی بھوک نہ تھی۔ مگر اس کی خاطر وہ بھی آہستہ آہستہ اس کا ساتھ دیتا رہا۔ فلم نے جو وہ ابھی دیکھ کر آئے تھے ان کے لئے موضوع گفتگو مہیا کر دیا تھا۔

رچرڈ نے کل رات کی صحبت میں اپنے دوستوں سے جو باتیں کی تھیں وہ سچ معلوم ہو رہی تھیں۔ ایلیسی کچھ اچھی لگ رہی تھی۔ لوگ انہیں دیکھ کر کچھ بھی محسوس نہ کر سکے تھے۔

جب وہ اپنے دوستوں کو بتائے گا کہ وہ اپنی بے مثال ملازمہ ایلیسی کو سینما لے گیا اور پھر ساتھ کھانا کھایا تھا تو وہ اس داستان سے لازماً لطف اندوز ہوں گے۔

ایلیسی رقص کرتے جوڑوں کو بڑی مسحور کن نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

"کیا تمہیں رقص کرنا پسند ہے؟" رچرڈ نے پوچھا۔

"ہاں جب میں لڑکی تھی تو بہترین رقاصہ تھی۔ شادی کے بعد سے میں نے ناچنا چھوڑ دیا۔ میرا شوہر قد میں مجھ سے چھوٹا تھا اور میرے خیال میں رقاص کے ساتھ مرد کو عورت سے لمبا ہونا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس کام کے لئے بہت جلد بوڑھی ہو گئی ہوں۔"

رچرڈ یقیناً اپنی ملازمہ سے لمبا تھا۔ وہ دونوں کافی اچھے نظر آسکتے تھے۔ وہ رقص کا کافی شوقین تھا اور خود بھی بڑا اچھا ناچ لیتا تھا لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔ وہ رقص کے لئے دریافت کرکے ایلیسی سے بغل گیر نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اتنا آگے بڑھنا شاید اچھا نہ تھا۔ لیکن اس میں مضائقہ بھی کیا تھا۔ وہ کچھ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتی آرہی تھی اگر اس کے دریافت کرنے پر کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی تو وہ فوراً ہی معذرت کر سکتا تھا۔

"کیا تم بھی ایک راؤنڈ لینا پسند کرو گی ایلیسی؟" وہ بولا۔ بینڈ دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔

"لیکن مجھے چھوڑے بہت عرصہ ہو چکا ہے جناب۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اگر آپ کوئی خیال نہ کریں تو۔" وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

وہ ذرا بھی نہیں شرمائی تھی۔ وہ تو صرف اس بات سے خوفزدہ تھی کہ کہیں اس کے قدم ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ وہ فرش پر پھسل آئے۔ رچرڈ نے دیکھا کہ وہ کافی اچھا ناچ رہی تھی۔

"ارے تم تو بہت خوب رقص کرتی ہو ایلیسی۔"

"ہاں کچھ کچھ یاد آتا جا رہا ہے۔"

حالانکہ وہ ایک دراز قد عورت تھی مگر اس کے قدم بڑے ہلکے تھے۔ موسیقی کے سُروں سے اسے فطری رجحان معلوم ہوتا تھا۔ وہ رقص کرنے میں بڑی مسرور نظر آرہی تھی۔ رچرڈ نے دیوار پر بڑے آئینے میں ایک نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ وہ کافی اچھے لگ رہے تھے۔

ان کی نظریں آئینے میں ٹکرائیں اور اسے ایسا لگا جیسے وہ بھی یہی سوچ رہی ہے۔ انہوں نے دو راؤنڈ اور لیے پھر رچرڈ نے واپسی کی تجویز پیش کی۔ اس نے بل ادا کیا اور پھر باہر نکل آئے۔ رچرڈ نے اندازہ لگایا کہ جیسے وہ لاشعوری طور پر اس کا ساتھ دے رہا ہو۔ پھر انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور دس منٹ بعد اب وہ گھر میں تھے۔

"میں پچھلے راستے سے اوپر آؤں گی جناب۔" اس نے کہا

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ لفٹ میں آجاؤ۔"

اس نے اسے لفٹ میں سوار ہونے میں مدد دی اور رات کے لفٹ مین کی طرف مسرور نظروں سے دیکھا تاکہ وہ رات کو اتنی دیر سے اپنی ملازمہ کے ساتھ آنے پر کوئی شک نہ کرے۔ پھر اس نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر آگئے۔

"اچھا شب بخیر جناب۔" وہ بولی۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اس نوازش کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔"

"شکریہ ایلسی۔ اگر میں تنہا ہوتا تو میری یہ شام بالکل بیکار سی گزرتی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم بھی کافی لطف اندوز ہوئی ہوگی۔"

"بلاشبہ جناب، میں بیان نہیں کر سکتی۔"

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ رچرڈ اپنے آپ سے مطمئن ہوگیا۔ یہ اس نے بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے لئے یہ احساس کہ اس نے کسی کو حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کیا ہے بڑا جاں فزا تھا۔ اس کی نیک فطرت نے ایک لمحے کے لئے اسے گرم کر دیا اور اس کا دل تمام انسانوں کی محبت سے لبریز ہوگیا۔

"شب بخیر ایلسی۔" وہ بولا، اور چونکہ وہ اپنے اس فعل پر بہت خوشی محسوس کر رہا تھا اس لئے اس نے ایلسی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دیئے۔

اس کے ہونٹ بڑے نرم تھے وہ اس کے ہونٹوں سے چپک گئے۔ جواباً ایلسی نے بھی بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ یہ ایک صحتمند اور خوبصورت عورت کا زندگی سے بھرپور جواب تھا۔ رچرڈ کو یہ سب کچھ بڑا لذت آمیز لگا۔ اس نے اپنے بازوؤں کا حصار کچھ اور تنگ کر لیا۔ ایلسی نے اس کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔

عام حالات میں وہ اسی وقت جاگتا تھا جس وقت ایلسی اس کی ڈاک لے کر آتی۔ مگر دوسری صبح وہ ساڑھے سات بجے اٹھ گیا۔ اس کے ذہن پر اجنبی سے احساسات چھائے ہوئے تھے وہ اپنے سرہانے دو تکیے رکھ کر سونے کا عادی تھا۔ مگر اسے احساس ہوا کہ اب صرف وہاں ایک تکیہ ہے، پھر اسے یاد آگیا، اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ دوسرا تکیہ اس کے برابر ہی رکھا تھا۔

شکر خدا کا، اس تکیے پر کوئی دوسرا سر نہیں رکھا تھا مگر یہ بات ظاہر تھی کہ کوئی سر اس پر تھا ضرور۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا بدن ٹھنڈے پسینے میں نہا گیا۔

"میرے خدا، میں نے کیا احمقانہ حرکت کی ہے؟" وہ زور سے چلاّ پڑا۔

اس نے ایسے پاگل پن کی بات کیسے کرلی۔ اسے کیا ہوگیا تھا؟ وہ اپنی ملازم عورت کے جسم کے ساتھ کھیلا؟ کیسی ذلیل حرکت کی تھی اس نے؟ اس عمر میں وہ اس مرتبے کا شخص ہوتے ہوئے۔ اسے ایلیسی کے جانے کا احساس بھی نہ ہوا۔ وہ شاید اس وقت گہری نیند سو رہا ہوگا۔

ایسی کوئی بات تو نہ تھی کہ وہ اسے بہت زیادہ پسند کرتا تھا اور وہ اس قسم کی عورت بھی نہیں تھی۔ اس نے پچھلی رات کے بارے میں سوچا۔ اس نے اسے کسی قدر تر بور ہی کیا تھا۔

ابھی تک وہ اس کے لئے صرف ایلیسی ہی تھی۔ یہ کیا پاگل پن ہو گیا۔ اب کیا ہوگا؟ حالات سدھرنا ناممکن ہیں۔ اب تو ظاہر ہے کہ وہ اسے نہیں رکھ سکتا۔ اور اس غلطی کی وجہ سے جس میں وہ برابر کی شریک تھی اسے جانا پڑا۔ دہلا دینے والا واقعہ تھا۔ ایسی اچھی ملازمہ کو صرف ایک گھنٹے کی لذت کی خاطر کھو دینا کیسی بیوقوفی کی بات تھی۔ یہ سب کچھ میرے اس ذلیل ہمدرد دل کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ بڑبڑایا۔

اب شاید اسے کوئی بھی ملازمہ اتنی ہوشیار نہ ملے۔ کون اس کے کپڑوں پر اتنی توجہ دے گا؟ کون اس کے خاندانی ظروف کی صفائی کرے گا وہ تو اس کے تمام دوستوں کے فون نمبر بھی جانتی تھی اور شراب بنانے میں تو وہ ماہر تھی لیکن اب تو یقیناً وہ چلی جائے گی۔ وہ ضرور محسوس کرے گی کہ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد حالات بدلنا لازمی امر ہے۔ وہ اسے بہترین تحفہ دے گا، اور ایک شاندار سرٹیفکیٹ بھی۔

اب کسی بھی لمحے وہ اندر آنے والی ہے۔ کیا وہ بھنائی ہوئی ہوگی مشتعل۔ کیا وہ اس کی عادی رہی ہوگی؟ اور اب تو شاید وہ اس کی ڈاک لے کر بھی نہ آئے۔ اب اگر وہ گھنٹی بجائے اور مسز جیڈی آکر کہے کہ ایلیسی پچھلی رات سے ابھی تک نہیں اٹھی ہے، تو یہ کتنی احمقانہ، کسقدر۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کا جسم لرز کر رہ گیا۔

جیسے ہی ایلیسی اندر آئی دیوار پر گیر کلاک بج اٹھا۔ وہ حسب معمول پھول دار قمیص پہنے ہوئی تھی۔

"صبح بخیر جناب" وہ بولی

"صبح بخیر"

اس نے پردے کھینچے اور اس کے ہاتھ میں ڈاک اور کاغذات تھما دیئے۔ اس کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ بالکل ایسی ہی نظر آ رہی تھی جیسے ہمیشہ نظر آیا کرتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات بھی بالکل معمول کے مطابق تھیں نہ ہی اس نے رچرڈ کی نظروں سے بچنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس سے نظریں ملانے کی کوشش کی۔

"کیا آپ خاکی لباس پہننا پسند فرمائیں گے جناب؟ وہ کل ٹیلر کے ہاں سے آگیا ہے۔"

"ہاں۔"

اس نے خطوط پڑھنے کا بہانہ بنایا لیکن دزدیدہ نظروں سے وہ اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ ایلیسی کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ اس کا لباس تہہ کرکے دراز میں رکھ رہی تھی۔ اس نے اس کے کالر میں سے کل کی مرجھائی ہوئی کلی نکالی اور تازہ لگانے لگی۔ پھر اس نے دراز میں سے صاف جرابیں نکال کر کرسی کے قریب اسٹول پر رکھ دیں۔ پھر اس نے اس کا خاکی سوٹ نکالا اور اسے درست کرنے لگی۔ اس نے پھر دوسری الماری کھولی اور ایک میچ کرتی ہوئی ٹائی نکال لائی۔ پھر اس نے کپڑے اور ٹائی بازو پر ڈال کر جوتے اٹھائے۔

"آپ پہلے ناشتہ کریں گے یا غسل کریں گے جناب۔"

"میں اب ناشتہ ہی کروں گا۔"

"بہتر جناب۔"

وہ بڑے سکون سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے چہرے کے نقوش ہمیشہ کی طرح سنجیدہ اور باوقار تھے۔ شاید جو کچھ ہوا تھا وہ ایک خواب تھا۔ ایلیسی کے کسی بھی انداز سے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے رات کی بات ذرا بھی یاد ہو۔ رچرڈ کے منہ سے اطمینان کی ایک سانس نکل گئی۔ تو سب کچھ ٹھیک ہے، اسے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایلیسی مکمل خادمہ ہے اس کے کسی بھی لفظ یا کسی انداز سے اس بات کا اظہار نہیں ہوا تھا کہ ان کے تعلقات خادمہ اور مالک سے زیادہ رہے ہیں۔"

اور رچرڈ اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا۔





بنگلہ کہانی

زب ؛ فریدی

ایک جرنیل کے عشق کی داستان

زخمی جرنیل نے طویل نیند کے بعد آنکھیں کھول دیں معاً اس کی نگاہ سامنے کھڑی ہوئی نرس پر پڑی۔ سانولا سلونا حسن لمبی زلفیں، شرمگیں آنکھیں، خمدار پلکیں، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور اعضا میں بے مثال تناسب' یہ ساری خوبیاں ایسی تھیں جو یکجا ہو کر پتھر کے دل کو بھی متاثر کرسکتی تھیں' جرنیل تو پھر بھی انسان تھا۔ ایک رنگین مزاج جرنیل۔ نرس کو دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں حسبِ معمول تیز ہوگئیں۔ جنگ میں زخمی ہوکر وہ اسپتال میں اس لئے داخل ہُوا تھا کہ یہاں اس کے زخموں کا علاج ہوگا لیکن ہوش میں آتے ہی وہ اس پُراسرار سنجیدہ سی لڑکی کے تیرِ نظر کا گھائل ہوگیا۔ وُہ کئی دن اسپتال میں داخل رہا اس عرصے میں اس کے جسم کے گھاؤ تو آہستہ آہستہ بھرتے گئے لیکن دل کا گھاؤ روز بروز گہرا ہوتا رہا اُدھر نرس کا یہ عالم تھا کہ وُہ نت نئے کاموں کے سلسلے میں گھڑی گھڑی جنرل کے کمرے میں آتی رہی۔ جرنیل کے دل کی عجیب حالت تھی' وُہ حوصلہ مند انسان جو میدانِ جنگ میں اپنے لاتعداد دشمنوں کی صفوں کو درآنہ چیرتا ہُوا اور محاذوں کو توڑتا آگے بڑھ جایا کرتا تھا۔ آج اس نرس، ایک عورت کے رُوبرو اتنا بے بس اور بزدل ہوچکا تھا کہ کئی بار کچھ کہنے کے لئے اُس نے زبان کھولنا چاہی لیکن قوتِ گویائی جواب دے گئی۔ ہونٹ کھُلتے اور کپکپا کر رہ جاتے۔ یہاں تک کہ اسی پس وپیش میں وُہ دن بھی آگیا جب اُسے اسپتال سے محاذ پر واپس لوٹ جانا تھا۔ وُہ اپنے بستر پر چپ چاپ بیٹھا مسلسل باہر تک رہا تھا کہ نرس کمرے میں داخل ہُوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانا تھا۔ اس کی نظریں نرس کے حسین چہرے پر جم گئیں۔ جُدائی کے احساس سے وہ ملول ہوگیا۔ بظاہر نرس اس کی ذہنی الجھنوں سے بے خبر تھی۔ جرنیل نے رُک رُک کر کہا "کل میں محاذ پر واپس جا رہا ہوں۔"

اس نے دیکھا کہ نرس کی تذبھری آنکھوں میں درد کی لہریں سی اٹھیں اس نے مایوسی سے جرنیل کو دیکھا اور اپنے اندرُونی کرب کو چھپانے کے لئے مسکرادی لیکن اس ہنسی میں جتنا دُکھ تھا، اُسے جرنیل نے بھی محسوس کرلیا۔ نرس نے آزردگی سے جواب دیا "کل آپ واپس جا رہے ہیں، میں جانتی ہوں۔"

"تم کیا جانتی ہو؟" جرنیل نے دل کی بات کو کریدنا چاہا۔ "کیا تم میرے دل کی اصل حالت سے واقف ہو؟"

اُس نے اپنی جھکی ہوئی نگاہیں اُٹھا کر ایک بار اس کی طرف دیکھا پھر اپنے روایتی انہماک سے کافی میں دودھ ملانے لگی۔

"کیا تم میری عدم موجودگی میں مجھے یاد کیا کرو گی؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جرنیل نے دوسرا سوال کیا۔

"اگر یہ بات صحیح ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو یہ بات آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔" یہ کہہ کر نرس نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی اور تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

"ٹھہرو!" جرنیل کی بھاری آواز گونجی۔

نرس ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی۔

جرنیل نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا اور اپنے جذبۂ آوارہ کی بات کہہ ہی دی "کیا تم میرے ہمراہ چل سکتی ہو؟"

"کہاں؟"

"کیمپ میں۔"

"کس لئے؟" نرس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور گہری ہو گئی اور ہونٹ لرزنے لگے۔

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں۔ چلو، اگر زیادہ عرصے کے لئے نہیں تو صرف ایک ہی رات کے لئے سہی۔"

نرس نے مذبذب لہجے میں جواب دیا ــــــ "لیکن یہ ہسپتال یہاں کی مصروفیات، یہ سب مجھے کس طرح چھوڑ دیں گے؟"

جرنیل نے التجا آمیز لہجے میں سوال کیا۔ "کیا تم چھٹی نہیں لے سکتیں؟"

نرس نے تردد سے جواب دیا۔ "لیکن جرنیل سوچیے تو سہی بھلا ایک نرس چھٹی لے کر بھی آخر کس طرح ایک جرنیل کے کیمپ میں پہنچ سکے گی؟"

جرنیل نے اس طرح جواب دیا گویا وہ اس سوال سے پہلے ہی آگاہ تھا۔ اُس نے کہا۔ "کسی بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں ایک سپاہی کی وردی مہیا کر دوں گا میرے پاس تک پہنچنے کے لئے بس یہ وردی کافی رہے گی۔"

نرس چپ ہوگئی۔ جرنیل کو اس کی خاموشی شاق گزری۔

نرس کچھ سوچ رہی تھی۔ جرنیل نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ کسی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔

"چھٹی کیسے ملے گی؟" اس نے رُک رُک کر سوال کیا۔

جرنیل کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا، نرس رضامند ہو چکی تھی، جرنیل نے اپنی بے پایاں خوشی کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔"

دو طویل دن گزر گئے۔ جرنیل کے کیمپ میں ہر طرف خاموشی اور گہری تاریکی کا راج تھا۔ جرنیل کی نظریں کیمپ کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بے چینی سے کسی کا منتظر تھا۔ پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور مردانہ لباس میں ملبوس نرس کیمپ کے اندر داخل ہوگئی۔ جرنیل غیر ارادی طور پر نرس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا اور اس کی پیشوائی کو چند قدم آگے بڑھا۔ اس نے نرس کے شانے پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

بیٹھتے ہوئے نرس نے ہنس کر اُسے دیکھا۔ اُس کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ کیمپ میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ گہرے سکوت میں بس دونوں کی سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی۔ دونوں کی معنی خیز نظریں ایک دوسرے کو برانگیختہ کرتی رہیں۔ دفعتاً جرنل نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں اُسے مخاطب کیا "چلو وہاں اس طرف چلیں۔"

اندھیرے میں نرس کے ہنسنے کی مدھم سی آواز گونجی مگر وہ اٹھی نہیں بدستور اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

"اٹھو" جرنیل نے جسارت سے کام لیا، اُسے بازو سے پکڑ لیا اور پوچھا "آخر تم چلتی کیوں نہیں۔ آخر چاہتی کیا ہو؟"

نرس نے اچانک سوال کیا۔ "اگر میں آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہوں تو کیا آپ اس کا صحیح صحیح جواب دیں گے؟"

"ضرور" جرنیل نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں پختہ عزم جھلک رہا تھا۔

نرس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی۔

جرنیل نے کچھ تامل کے بعد دریافت کیا "تم کیا جاننا چاہتی ہو؟ کہو جو کہنا ہے کہو۔ تم سے گفتگو کر کے تو لطف آتا ہے۔"

نرس نے ہنسی ہنسی میں ایک نہایت گرانمایہ سوال کر دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ اتنی عظیم جنگوں میں فتحیابی کس طرح حاصل کرتے ہیں جبکہ ہر نئی جنگ پچھلی جنگ سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر جنگ کا طریقہ بھی جُدا ہوتا ہے۔ میں نے آپ سے یہ سوال کر تو دیا ہے لیکن سوچتی ہوں کہ ان مختصر لمحات میں، میں اپنے ان تفصیل طلب سوالات کے جوابات کس طرح حاصل کر سکوں گی۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ اپنے دشمن پر ایک بہت بڑا حملہ کرنے والے ہیں، میں اس سلسلے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔"

جرنیل کے چہرے کی خوشی کافور ہوگئی۔ اس کی جگہ طنز اور زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ نے لے لی۔ "خوب۔ تو یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم مجھ سے میرے اگلے جنگی منصوبے کا راز اگلوانا چاہتی ہو۔"

نرس نے سادگی اور بھولے پن سے جواب دیا "جی ہاں اگر کوئی حرج نہ ہو تو" نرس کی بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ اس نے بغور جرنیل کو دیکھا جو کسی گہری سوچ سے بیدار ہوا تو مختصر سا سوال کیا "مگر اس منصوبے سے آخر تمہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

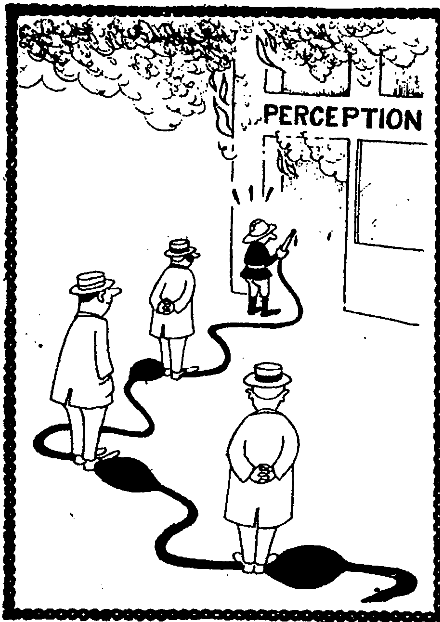
"کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ بس یونہی ذرا اشتیاق تھا"

جرنیل نے گھمبیر آواز میں کہا "جانتی ہو کہ کسی فوجی جنگی منصوبے کے بارے میں کسی کو کچھ بتانا کتنا بڑا جرم ہوتا ہے؟"

نرس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے پہلی بار اپنی ذہانت کا اظہار کیا "میرا اس طرح سپاہی کی وردی میں اپنی خوابگاہ میں بلانا کس حد تک غیر مجرمانہ فعل ہے ذرا اس سلسلے میں بھی کچھ اظہارِ خیال فرمادیں۔"

جرنیل کا چہرہ سکڑ کر اور سخت ہوگیا۔ اس نے نہایت ضبط اور تحمّل سے کام لیا۔ اُس کی مٹھیاں شدّتِ جبر سے بھنچ گئیں۔ تاہم اس نے نرم لہجے میں کہا "صاف صاف بات کی جائے۔ میں پوچھتا ہوں اگر میں تمہیں اپنے آئندہ کے جنگی منصوبے کی بابت کچھ نہ بتاؤں تو کیا تم وہاں میرے بستر تک نہیں چلو گی؟"

نرس نے فوراً اپنے مردانہ کپڑے اُتار دیئے اور انہیں ایک طرف ٹانگتی ہوئی فیصلہ کُن لہجے میں بولی "نہیں! کبھی نہیں۔"



جرنیل کی ہوس آمیز نظروں نے نرس کے گدرائے ہوئے جسم کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ نیم برہنہ ہوچکی تھی۔ اور اس کا شباب قیامت خیز تھا۔

جرنیل نے تحکمانہ کہا "اور اگر میں تشدّد پر اتر آؤں سختی کروں تو"

نرس نے فاتحانہ انداز میں کہا "جانتے ہیں پھر کیا ہوگا؟ اگر آپ نے جبر اور زبردستی سے کام لیا تو میں شور کردوں گی اور اس کیمپ کے آس پاس جو لوگ بھی ہوں گے سب کو اندر بلالوں گی۔" پھر طنزیہ لہجے میں دریافت کیا "اور یہ ہنگامہ آرائی اور اپنی رُسوائی غالباً آپ کسی صورت میں بھی پسند نہ کریں گے؟ کیا خیال ہے؟" وہ ہنسنے لگی "میرا خیال ہے آپ خاصے زیرک اور دُور اندیش جرنیل ہیں۔"

جرنیل کا چہرہ غصّے سے کچھ اور سخت ہوگیا۔ وہ تلملا اٹھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ چالاک اور ہوشیار نرس نے شکاری مکڑی کی طرح اُسے پوری طرح اپنے قابو میں لے لیا ہے۔ دماغ پر ذرا سا زور دیا تو ایک ترکیب اُس کی سمجھ میں آگئی۔ نئے جنگی محاذ کا نقشہ اس کے حوالے کرو اور اپنی ہوس کی آگ بجھا کر اسے ٹھکانے لگادو۔" جرنیل

کا چہرہ کچھ اور تن گیا۔ وُہ غصّے میں کھٹ کھٹ کرتا ہُوا الماری کے پاس پہنچا اور اس میں سے نقشہ نکال کر پھر نرس کے پاس واپس آگیا۔
اس نے اس نقشے کو نرس کی طرف اُچھال دیا۔
نرس پُرشوق نظروں سے نقشہ دیکھنے لگی۔
جرنیل نے کسی کاروباری کی طرح جو سودے کی قیمت ادا کر چکا ہو، سوال کیا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"
نرس نے نرمی سے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "میں ذرا سی دیر کے لئے باتھ روم میں جانا چاہتی ہوں۔"
جرنیل نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "بشوق جاؤ، اجازت ہے۔"
نرس باتھ رُوم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وُہ باتھ روم سے نکلی تو منتظر جرنیل اسے اپنے بستر کی طرف لے کر چلا گیا۔
یہ سارے معاملات پنتالیس پچاس منٹ میں طے پا گئے۔
جب وُہ دونوں خواب گاہ سے باہر آئے تو جرنیل نرس سے آگے آگے تھا اور اس کا سینہ فتحمندی کے احساس سے پھولا ہُوا تھا۔

برخلاف اس کے نرس کا حلیہ کچھ اور ہی تھا، اُس کا زیریں لباس تار تار ہو چکا تھا اور بال بے ترتیبی سے بکھرے ہُوئے تھے۔
جرنیل کے چہرے پر ظلم اور سختی کے آثار پیدا ہو چکے تھے، نرس کے چہرے پر معصومیت اور مظلومیت پائی جاتی تھی۔ اس نے جرنیل سے کچھ کہنا چاہا، اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے ابھی ہلے ہی تھے کہ جرنیل کا ریوالور حرکت میں آگیا؛ ریوالور کے شور کے ساتھ ہی خون میں لت پت نرس زمین پر گر گئی، ریوالور کی کئی گولیاں نرس کے دماغ کو چیرتی ہُوئی آرپار ہو چکی تھیں۔
جرنیل اس کی لاش پر جُھک گیا اور اُس کے چہرے کو اپنے سامنے کرتا ہُوا بولا۔ "بدکار، ذلیل، فاحشہ تو جاسوسی کرنے آئی تھی!"
پھر وُہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر میز پر جُھک گیا، سامنے میز پر ایک چھوٹا سا پرزہ پڑا ہُوا تھا، جرنیل نے فوراً اُسے اُٹھا لیا۔ اس میں لکھا تھا۔
ڈیئر جرنیل!
مجھے یقین ہے کہ آپ میری بابت سب کچھ جان چکے ہیں۔ اور میرے حق میں آپ کی جو سب سے بڑی سزا ہو سکتی ہے وُہ سزائے موت ہے، مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے ہاتھوں ہلاک کی جاؤں گی، موت ایک اٹل حقیقت ہے، میں موت سے نہیں ڈرتی،
اسی لئے میں نے یہ خط پہلے لکھ لیا تھا مجھے اپنا انجام معلوم تھا لیکن آپ سے میری ایک درخواست ہے، میری یہ درخواست دشمن جرنیل سے نہیں ایک ایسے دوست جرنیل سے ہے جس سے میں نے محبّت کی ہے جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پرلطف لمحات گزارے ہیں، جرنیل! تم یقین کرو یہ محبت جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، میری زندگی کی پہلی اور آخری محبّت تھی۔ اس واسطے سے میں تم سے درخواست کرتی ہُوں کہ میری لاش کو کسی طرح میرے وطن روانہ کر دیا جائے، آپ جرنیل ہیں ایک بااختیار اور فولادی عزم کے انسان، آپ کے لئے یہ ایک نہایت معمولی سی بات ہے کہ آپ میری لاش کو میرے وطن کے لوگوں تک پہنچا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری خواہش ضرور پوری کر دیں گے۔"
آپ کے چند لمحوں کی ایک مظلوم ساتھی۔

اور واقعی نرس کی یہ خواہش اتنی معمولی تھی کہ جرنیل کو اس کی تکمیل میں کیا تامّل ہو سکتا تھا۔ اس کے حکم پر نرس کی لاش اس کے ملک میں بھیج دی گئی۔ مرنے سے پہلے ہی نرس اپنے وطن کو ایک پیغام بھیج چکی تھی۔ نہایت اہم اور قیمتی پیغام، اس کا پیغام تھا
"دشمن کے سپاہی اگر میرا مردہ جسم لے کر تمہارے پاس آئیں تو اس کا پوسٹ مارٹم ضرور کرنا۔"
اور پوسٹ مارٹم کے دوران خفیہ تحریر کے ایک چھوٹے سے کاغذ کو برآمد کر لیا گیا جسکو نرس نے جرنیل کے جنگی نقشے کو دیکھ کر بڑی ہوشیاری اور مہارت سے باتھ رُوم میں اتارا اور نگل لیا تھا۔





مامتا مر گئی

ضروری نہیں کہ اس تاثر انگیز کہانی کو آپ ایک ہی بار پڑھیں۔

نسیم سحر

بچہ اپنے پنگوڑے میں لیٹا ہوا اپنے ہاتھوں سے کھیل رہا تھا۔ اُس کی روشن آنکھیں بڑی تیزی سے ایک نئی دُنیا کی نئی نویلی اشیا کو دیکھ رہی تھیں، وہ تھوڑی دیر بعد اپنے بے معنی کھیلوں کو بھول کر پنگوڑے میں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا ۔۔۔ حالانکہ یہ اقدام اس کے امکان میں نہیں تھا۔

وہ اُس بچے کی طرف حیران سی نظروں سے دیکھ رہی تھی اُس کا سر ایک عجیب و غریب زاویے پر خم کھا کر بچے کی دل چسپ حرکات کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ وہ مسکرا تو نہیں سکتی تھی لیکن شاید وہ اپنے اندر ایک ہلچل سی محسوس کرتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ مامتا کا جذبہ بھی کتنا بے پناہ ہوتا ہے۔ بہت تیزی سے اس پر ایک بے چینی کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ پیدائش کا لمحہ قریب آتا جا رہا تھا یہ چیزیں وہ الفاظ میں تو بیان نہیں کر سکتی تھی، بلکہ شاید تکلیف اور مسرت کے ملے جلے جذبات اسے گھیرے ہوئے تھے، اُن کے بارے میں وہ خیالات کو بھی کسی ترتیب سے دماغ میں نہ لا سکتی تھی۔ تاہم وہ محسوس ضرور کر رہی تھی کہ اب اس کی کوکھ سے نئی زندگی باہر آنے کو بیتاب ہے، اس نے ایک مرتبہ پھر اس کلکاریاں مارتے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کے پیٹ میں ایک مرتبہ پھر درد کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اُف ۔۔۔ وہ ایک تشنجی کیفیت کا شکار تھی مگر وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی تھی۔ ایک دم اس کے سارے خیالات جیسے کرچیوں کی طرح بکھر گئے، وہ نہ تو کسی ترتیب سے سوچ سکتی تھی اور نہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اُسے بیان کر سکتی تھی۔



پنگوڑے میں لیٹے ہوئے بچے نے لڑھکنی کھائی اور اُسے کوئی چیز چبھنے لگی تو اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ فوراً ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور بچے کی ماں کمرے میں داخل ہوتی اس نے تپائی سے بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا "اوہ میرا پیارا مُنا۔ اس قدر کیوں رو رہا ہے میرا لاڈلا ۔۔۔ میری زندگی ۔۔۔ میرا پاگل مُنا۔ ارے تو اکیلا تھوڑا ہی تھا کہ یوں رو رہا تھا۔ دیکھ تیرے پاس میں کسے چھوڑ کر گئی تھی ۔۔۔" بچے کی ماں نے اُس کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ اور وہ بچے اور اس کی ماں کا پیار دیکھ دیکھ کر عجیب سے احساسات میں مبتلا تھی مگر وہ بیان نہ کر سکتی تھی اور خود اُسے بھی اب زیادہ تکلیف محسوس ہو رہی تھی ۔۔۔ وہ بھی تو ماں بن رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تو اس کی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور پھر پیدائش کی گھڑی بھی آ پہنچی۔ ماتا کے جذبات بھی کیا عجیب چیز ہوتے ہیں، وہ بیان نہیں کئے جا سکتے۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ایک قدرتی عمل کے ذریعے ماتا کے بے پناہ جذبات ماں میں سمٹ آتے ہیں، اور جس طرح بچوں کی پیدائش ماں کے لئے محبت اور خوشی کے جذبے لے آتی ہے، اُسی طرح منفی، مثلاً غصے اور نفرت کے جذبات بھی ماں پر طاری ہو جانے لازمی ہیں اگر وہ نئی زندگیاں اس سے چھین لی جائیں اُس سے دُور کر دی جائیں، وہ اُن سے محروم کر دی جائے .... تو...!!

اور یہ واقعہ دوسرے دن پیش آیا اور گزشتہ رات وہ رات بھر بین کرتی رہی۔

وہ اپنے اُس وقت کو یاد کر رہی تھی جب وہ شدید درد زہ میں مبتلا تھی اور پھر اُسے ایک عجیب سی لذت کے احساس کے ساتھ اس درد سے نجات مل گئی تھی کچھ دیر بعد پنگوڑے میں لیٹے ہوئے بچے کی ماں دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے بچے کو شفقت سے تھپکیاں دیں اور اس سے دیر تک محبت کا اظہار کرتی رہی تھی اور پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔ بچے کی ماں کو اس بات کا کوئی احساس نہ تھا کہ ماں بننے کے بعد خالی کوکھ رہ جانے پر کسی ماں کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

اس وقت بچے کی ماں کمرے سے باہر تھی اور وہ اس کے بچے کے پاس بیٹھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کے دماغ میں بے نام خیالات کا ایک بے ترتیب طوفان موجزن تھا۔ وہ وقت جب وہ درد زہ سے تڑپ رہی تھی۔ اور پھر اسے نئی زندگی کی آوازیں آئی تھیں اور پھر..... پھر نہ جانے کیوں ایک دم وہ مسرت کے لمحات اس سے چھن گئے تھے، وہ موت کے بارے میں قطعاً کوئی معلومات نہ رکھتی تھی۔ اس کی زندگی، اس کی اولاد کو نہ جانے کون کہاں لے گیا تھا.. یہ کل ہی کی تو بات تھی، شاید اگر وہ اس بچے کی ماں سے کوئی سوال کرتی تو اُسے جواب مل سکتا تھا مگر آخر وہ سوال کرتی کیسے ؟۔

لیکن وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود اس جذبے سے بخوبی آشنا ہو چکی تھی جس کا نام حسد ہے۔ بچہ اب پھر کھیل رہا تھا اور خوب اُچھل کود کر رہا تھا۔ وہ بچے کو دیکھ دیکھ کر بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ بچہ بھی اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور پھر بچے نے اپنی محبت بھری نگاہیں اُس پر سے ہٹا کر جھنجھنے پر مرکوز کر دیں۔

نہ جانے کیوں اُس کے دل میں بچے کے خلاف نفرت عود کر آئی۔ اسے یہ ہنستا کھیلتا بچہ بہت بُرا لگنے لگا۔ اور شاید اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے دروازے کی طرف کان لگا کر سُنا۔ کوئی آواز اُدھر سے نہیں آ رہی تھی، وہ بچے کی جانب متوجہ ہوئی جو اب پنگوڑے سے باہر نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری، شاید آنے والے وقت کے احساس سے وہ خود بھی گھبرا رہی تھی مگر اب وہ ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اب اس کی تکمیل لازمی تھی۔ وہ بچے کے بالکل قریب پہنچ گئی نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ وہ اُسے دیکھتے ہی خوفناک انداز سے رونے لگا۔ مگر ابھی بچے کی طویل چیخ بلند ہی ہوئی تھی کہ وہ دیوانہ وار اس پر جھپٹ پڑی اور وحشیانہ انداز میں ناخنوں اور پنجوں سے اُسے نوچنے لگی بچہ شدید تکلیف کے عالم میں گھٹی گھٹی آواز میں رو اور چلا رہا تھا مگر رحم کا کوئی جذبہ اب اس کے ہاں موجود نہیں تھا وہ دُنیا بھر سے اپنی نفرت کا اظہار اس بچے کو یوں چیر پھاڑ کر کرنا چاہتی تھی اور بچہ اب خاموش ہو چکا تھا۔

بچے کی ماں بچے کی چیخیں سُن کر اندر کی طرف دوڑی، اپنے بچے کا یہ انجام دیکھ کر وہ ـــ وحشیانہ انداز میں اس پر جھپٹی۔ اس نے اس عورت سے بھی مقابلہ کرنا چاہا مگر چند لمحوں بعد وہ عورت اس کی گردن مروڑ چکی تھی،

اور یہ عورت۔ اس بچے کی ماں۔ یہی وہ ظالم عورت تھی جس نے اس سے پہلے اس کی کوکھ خالی کر دی تھی اور اسے اپنے سات نومولود بچوں سے محروم کر دیا تھا۔ (انگریزی سے ماخوذ) ✸

قارئین۔ آپ نے یہ کہانی پڑھی؟ میرا خیال ہے اسے آپ دوبارہ پڑھیں کوئی بات اب ایسی بھی نہیں رہ گئی ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ یہ دو ماؤں کی کہانی ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون ماں انسان تھی اور کون جانور۔

جذبے تو سبھی رکھتے ہیں! (مدیر)

سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ

رام دیال سے میری دوستی زیادہ پُرانی نہ تھی لیکن وہ اور اس کی ماں پردیس میں میرا بہت خیال رکھتے تھے البتہ رام دیال کی ماں مجھے کچھ عجیب اور ناقابلِ فہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کا آئے دن برت رکھنا، آدھی رات کو مرگھٹ جانا اور پجاری پنڈتوں سے گھنٹوں بیٹھ کر سرگوشیاں کرنا۔ اس کے یہ تمام مشاغل میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ایک روز رام دیال کی ماں نے اپنی شفیق آواز میں کہا کہ اگر میں اس کے بتائے ہوئے منتر پڑھ ڈالوں تو میری دنیا بدل سکتی ہے، میں انکا کو اپنے قبضے میں کر کے تمام عمر عیش کر سکتا ہوں۔ مجھے ان لغویات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے رام دیال کی ماں کی بات پر کان نہ دھرے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد رام دیال کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ رات کو میں اس کے کریا کرم میں شرکت کرنے مرگھٹ گیا میری واپسی رات گئے ہوئی، صبح جب میں دفتر جا رہا تھا تو اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی ہلکی پھلکی چیز میرے بالوں پر آن گری ہو۔ میں نے سر کو بار بار جھٹکا، انگلیوں سے بالوں میں کنگھی بھی کی لیکن بے سود، کوئی پُراسرار شے میرے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ میں اپنے سر میں باریک باریک پنجوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا، اس پُراسرار وجود نے، جسے میرے ذہن نے ایک خوبصورت اور نازک اندام لڑکی کی شکل دے رکھی تھی، مجھے اپنا نام "انکا" بتایا اور کہا کہ اگر میں اس کے اشارے پر چلتا رہا تو بہت جلد بڑا آدمی بن جاؤں گا۔ انکا نے اپنی نوازشوں کے عوض میں مجھ سے اپنے احکام کی تعمیل کا عہد بھی لے لیا تھا۔

تقریباً بیس روز ہوئے تھے کہ میں انکا کی حیرت انگیز قوتوں سے خاصا آسودہ حال بن گیا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ ایک روز کا ذکر ہے، میں حسبِ معمول شام کو پارک میں بیٹھا اپنی محبوبہ نرگس اصفہانی کو پُرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ جمشید نامی ایک شخص اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ انکا نے جب یہ بتایا کہ جمشید نرگس کا منگیتر ہے تو رقابت کا ایک شدید جذبہ میں نے اپنے اندر محسوس کیا۔ پھر جب انکا نے مجھے حکم دیا کہ میں جمشید کو قتل کر ڈالوں تو میں انکار نہ کر سکا۔ مجھے مجبوراً انکا کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اسے انسانی خون فراہم کرنا پڑا۔ مگر دوسرے دن جب جمشید کی لاش کی تفصیل اخبارات میں چھپی تو میں گرفتاری کے خوف اور نرگس کے مشورے پر بمبئی بھاگ گیا۔ بمبئی میں انکا کی پُراسرار قوت نے مجھے لاکھوں روپے کا مالک بنا دیا۔ گاڑی، بنگلا، نوکروں کی فوج، میں دن میں رس کھیلتا رات کو میری خوابگاہ کسی حسین دوشیزہ کی خوشبو سے معطر ہوتی۔ شراب و شباب کی سرمستیوں میں، میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ انکا مجھ سے ایک خطرناک عہد لے چکی ہے، بہرحال ایک روز دوسری بار انکا کے کہنے پر مجھے طوعاً و کرہاً کملا نامی ایک خوبصورت لڑکی کو قتل کرنا پڑا۔ انکا نے اس بدنصیب لڑکی کا سارا خون بھی اپنے وجود کو تقویت دینے کی خاطر پی ڈالا۔ کملا کی موت کی خبر چھپی نہ رہ سکی، میں نے پولیس کو ڈیڑھ لاکھ روپے کی خطیر رقم دے کر کسی نہ کسی طرح گلو خلاصی حاصل کر لی مگر عدالتوں اور تھانوں کے چکر نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ میں

ممکن ہے ایسا واقعہ آپ نے پہلے نہ پڑھا ہو




گزشتہ قسطوں
کے مکمل خلاصے
کے ساتھ
۱۶

انکا سے درخواست کی کہ وہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے کوئی اور ذریعہ تلاش کرلے تو وہ مجھ سے خفا ہو گئی لیکن میرے سر سے چپکی رہی۔ اس عرصے میں نرگس اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر بمبئی آگئی۔ میں نے اس سے شادی کرلی اور بُری عادتوں کو چھوڑ کر نرگس میں گم ہو جانا چاہا، انکا نے اپنی ناراضگی کا انتقام یوں لیا کہ میرے برطرف شدہ ملازم کو ایک بدنام شخص کلن خاں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور کلن خاں سے عدالت میں یہ بیان دلوا دیا کہ اس نے ایک لمبی رقم کے عوض میرے ایما پر قتل کیا ہے میں نے ہر چند اپنی بے گناہی کا یقین دلایا اور عدالت کو بتایا کہ ایک پُراسرار عورت میرے سر پر سوار ہو گئی ہے۔ جس کے حکم کا میں تابع ہوں اور جو کچھ میں نے کیا ہے اسی کے اشارے پر کیا ہے۔ لیکن کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ کملا اور رحمت علی کے قتل کے جرم میں مجھے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

قید خانے میں جب میں خوفناک مجرموں جیسی دی جانے والی سزائیں بھگت رہا تھا تو کچھ دنوں بعد میں نے انکا کو ایک بار پھر اپنے سر پر محسوس کیا، انکا نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ہر ماہ کے بجائے چار ماہ میں بھی اس کے لئے انسانی خون فراہم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں تو وہ اپنی پُراسرار قوت کے ذریعے مجھے چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ میں نے نرگس کی پریشانیوں کی خاطر اس کی بات مان لی اور اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے جیلر نے بتایا کہ کلن خاں اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو گیا ہے۔ تحریری طور پر اس نے میرے ملازم بلکہ کملا کے قتل کا بھی اقرار کر لیا ہے اور میری بیوی نے عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی ہے۔ کلن خاں کے منحرف بیان اور نرگس کی اپیل کے بعد مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا، میری گرفتاری اور رہائی کا یہ سارا کھیل انکا کی پراسرار قوت کا کرشمہ تھا۔ مگر میں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اپنے سر پر قابض اس خطرناک وجود سے چھٹکارا پانے کی پوری کوشش کروں گا چاہے اس کا انجام کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔ مگر میں اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا، میں نے انکا سے فرار حاصل کرنا چاہا لیکن انکا میرے سر پر مسلط رہی، وہ نرگس سے بھی ناراض ہو گئی کیونکہ اس نے مجھے انکا سے نجات دلانے کے لئے شوالہ پور میں کسی بزرگ کی درگاہ کا رُخ کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نہ جانے کتنے معصوم انسانوں کو انکا کے ایما پر موت کے گھاٹ اتارنا پڑا، کتنے لوگ مر گئے ــــ میں جب انکا سے ناراض ہوا تو اس نے بھیانک انتقام لیا، ہماری ہر ترکیب ہر کوشش ناکام ہو گئی، انکا کو دیر سے سہی مگر ہر بات کا پتا چل جاتا۔ جیل کا ظالم سنتری شہباز قتل ہوا، کلن خاں بھی انکا کا شکار ہو گیا، میرے منیجر کو اس نے نرگس کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا۔ اس نے ہر بار مجھے عبرتناک سزا دی اور مجھے اپنے ننھے وجود کی پُراسراریت سے ڈرایا دھمکایا وہ مجھے کسی نہ کسی جرم میں پھنساتی اور رہا کراتی رہی، میری زندگی تلخ ہو چکی تھی، دولت مجھے اب بے کار معلوم ہوتی۔ نرگس نے میرے ساتھ سکھ کا کوئی دن نہیں گزارا تھا، کوئی صورت ایسی نہیں بنتی تھی کہ انکا میرے سر سے ہٹ جائے۔ کبھی کبھی وہ میرے سر سے چلی جاتی جب اسے میرے خلاف یا میرے حق میں دوسرے کسی شخص سے کوئی کام کرانا ہوتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ہی میں اور نرگس پروگرام بناتے مگر اسے سب معلوم ہو جاتا تھا اور آتے ہی وہ کسی نئی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دیتی۔ میں چونکہ بمبئی میں مشکوک ہو چکا تھا لہٰذا چند دنوں کے لئے دلی آ گیا، یہاں نرگس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری دینے اور انکا کے چنگل سے میری نجات کی دعا مانگنے کی کوشش کی مگر راستے ہی میں انکا میرے سر پر سوار ہو گئی اور اس نے ہماری اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ نرگس کو اسکی اس جرأت پر ایک ناقابل بیان صورتحال سے دوچار کر دیا۔ نرگس مجھے اچانک چھوڑ کر چلی گئی۔ اور میری آنکھوں نے اسے شارع عام پر ایک اجنبی شخص کے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھا۔ نرگس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً میں نے پھر انکا سے مفاہمت کا رویہ اختیار کیا، اس سے معافی مانگی۔ انکا نے میری التجا پر نرگس کو واپس کرنے کا وعدہ کر لیا۔ رات کو بارہ بجے اس نے مجھے ایڈورڈ پارک بھیجا جہاں سناٹے میں ایک شخص نرگس سے دست درازی میں مصروف تھا اور نرگس آہ و زاری کر رہی تھی۔ میں یہ منظر دیکھ کر اپنے آپے میں نہ رہ سکا۔ میں نے اسے مار دیا اور نرگس کو ساتھ لے آیا ایک اور قتل ہو چکا تھا۔ انکا نے میری غیرت کے جھنجھوڑے بکھیر کر مجھ سے ہولناک انتقام لیا تھا۔ وہ جو چاہتی کر سکتی تھی۔

بہت دیر میں نرگس کے اوسان بحال ہوئے۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ وہ اس عرصے میں کہاں اور کس کے ساتھ رہی۔ اب یہی مناسب تھا کہ میں دلی چھوڑ کر بمبئی کا رُخ کروں جہاں میرا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ اس عرصے میں انکا میرے سر سے غائب رہی۔ بمبئی میں جب میں اپنے مقتول منیجر کے گھر والوں کو تسلی تشفی دے کر واپس آ رہا تھا کہ انکا میرے سر پر سوار ہو گئی اور مجھے پھر تاؤ آ گیا، غصے کی شدت نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا۔ میں انکا سے لڑ پڑا، اس نے نرگس کے ساتھ بہت دل سوز مذاق کیا تھا۔ میں نے اسے دھمکیاں بھی دیں۔ انکا نے مجھے حسب معمول تنبیہ کی کہ اس بار وہ مجھے پہلے سے زیادہ ہولناک مصائب سے دوچار کر دے گی۔ مگر میں نرگس کی بے عزتی یاد کر کے اور بپھر گیا، میں اسے بُرا بھلا کہتا رہا، اس کے پنجوں کی چبھن میرے سر پر تیز ہو گئی، اسٹیرنگ پر میرے ہاتھ کانپنے لگے اور فضا میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔

مجھ سے ایک خطرناک ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا جس میں چار آدمی ہلاک ہو چکے تھے اور میرا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ میں اپاہج ہو گیا۔ نرگس اگر نہ ہوتی تو میں خودکشی کر لیتا۔ جب میری طبیعت سنبھلی تو مجھے چار آدمیوں کو ہلاک کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا، لیکن یہاں بھی انکا نے ایک اور تماشا کیا۔ وہ تفتیش کرنے والے انسپکٹر کے سر پر چڑھ گئی اور اس نے عدالت میں اس کی زبانی ایسے ناقابلِ یقین بیانات دلوائے کہ پورے کیس کی نوعیت ہی بدل گئی۔ ڈی۔ ایس۔ پی منوہر لال کو اپنی پوزیشن کا ناجائز استعمال، اور عدالت کو دھوکا دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ انکا نے ناممکن کو ممکن بنا کر مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس قسم کی پُراسرار عورت ہے۔ اس کے بعد انکا حسب معمول میرے سر پر آ گئی اور میں نے حسب معمول اس سے تلخ رویہ اختیار کیا مگر اس بار انکا اداس تھی۔ کچھ بجھی بجھی سی۔ اس عرصے میں ہوا یہ کہ نرگس کے والد اصفہانی صاحب ہمیں اپنے گھر لے گئے انکا میرے سر پر تھی اور اب وہ بہت خاموش خاموش رہا کرتی تھی۔ اس سے ناراضگی اور نفرت کے باوجود مجھ سے اس کی اُداسی نہ دیکھی گئی ــ آخر اس سے میری وابستگی پرانی تھی۔ میں نے اس سے اس کی اداسی کا سبب پوچھا تو اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا، ”دنیا کی تمام قوتیں بھی اگر مل کر مجھے پریشان کریں تو میں تنہا ان کا مقابلہ کر سکتی ہوں لیکن ایک طاقت ایسی ہے جس پر میرا زور نہیں“۔ انکا نے بتایا کہ اسے قابو میں کرنے کے لئے کٹھن جاپ کرنا پڑتا ہے، یہ جاپ ایک شخص نے اسی شہر میں شروع کر دیا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو انکا اس کی غلام بن جائے گی اور اس کی مرضی کی تابع ہو گی۔ اگر اس کے جاپ میں ذرا بھی چوک ہو گئی تو وہ انکا کی غذا بن جائے گا۔ انکا سے یہ خبر وحشت اثر سن کر میں پریشان ہو گیا۔ گویا انکا مجھ سے چھن جائے گی۔ کچھ بھی ہو وہ میری مونس و غمگسار رہی تھی۔ میں نے پچھلی تمام باتیں بھلا دیں اور انکا سے کہا کہ ”اگر تمہیں انسانی خون کی ضرورت ہے تو میں تمہیں فراہم کروں گا۔ اگر تمہیں اس پنڈت سے ڈر ہے تو میں اسے جہنم رسید کر دوں گا۔ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں۔“ انکا میری بات سن کر مسکرائی اور کہنے لگی ”کاش ہم دونوں زندگی بھر ایک ساتھ رہ سکتے“۔ پنڈت کا جاپ مکمل ہونے میں اٹھارہ بیس روز باقی رہ گئے تھے۔ انکا نے مجھے بتایا کہ جب تک وہ منڈل میں ہے کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس عرصے میں انکا کی افسردگی دور کرنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ میرے خسر اصفہانی صاحب کو ایک ٹھیکیدار نے پریشان کر رکھا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے انکا سے کہا اور دوسرے دن بڑی خاموشی سے میں نے انکا کی مدد سے اسے ختم کر دیا، انکا کو اس کی غذا مل گئی اور اصفہانی صاحب کی راہ کی رکاوٹ دور ہو گئی۔ اس واردات کے دوران ایک حسین و جمیل عورت نازلی سامنے آئی۔ انکا نے مجھے بتایا کہ نازلی میرے خسر کی داشتہ ہے جسے انہوں نے ایک مجسٹریٹ کو دھوکا دے کر حاصل کیا ہے۔ میں اصفہانی صاحب کو بہت پارسا شخص سمجھتا تھا۔ بہرحال جب اس نازنین اور پری پیکر لڑکی کو میں نے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں اس سے ملا اور میں نے اس کے قدموں پر دولت نچھاور کر دی اس کے عوض مجھے اس کی گداز قربت ملی۔

مگر پھر وہی بات کہ پنڈت کے جاپ کے دن پورے ہو رہے تھے، وہ اپنے جاپ میں اب تک کامیاب تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو انکا میرے ہاتھ سے نکل جائے گی میں انکا کے مشورے سے ایک ملنگ کے پاس گیا مگر اس نے الٹی سیدھی باتیں کیں۔ چار و ناچار کچھ سوچے سمجھے بغیر یوں کہئے کہ جذبات کی رَو میں بہہ کر میں سیدھا مرگھٹ کی طرف چل پڑا جہاں وہ منحوس پنڈت اپنے جاپ میں معروف تھا۔

انکا نے مجھے بہت منع کیا کہ میں اپنے اس ارادے سے باز رہوں مگر میں منڈل کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں برگد کے ایک تناور درخت کے نیچے ایک پنڈت آلتی پالتی مارے اپنے

جاپ میں مصروف تھا۔ اگر میں اس کے گیان دھیان میں خلل ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تو پنڈت اپنے جاپ میں ناکام ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے اسے اشتعال دلانے کی ہر طرح کوشش کی اسے بُرا بھلا کہا۔ اس پر پتھر پھینکے مگر منڈل کے اندر داخل ہوتے ہی پتھر موم کی طرح پگھل گئے۔ میں نے آخر کار منڈل میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ ابھی میں منڈل میں پاؤں رکھ ہی پایا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے بجلی کا جھٹکا سا لگا ہو۔ انکا میرے سر پر نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر قدم پیچھے ہٹا لیا۔ دوسرے لمحے انکا میرے سر پر آگئی۔ اب یہ بات طے ہو گئی تھی کہ اس منحوس پنڈت کو اس کے خطرناک ارادے سے باز رکھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس مایوسی اور بد دلی میں انکا نے مجھے ایک پنڈت بھگوان پرشاد کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ بھگوان پرشاد کو راضی کرنا بھی آسان کام نہ تھا اور وہ کیوں راضی ہوتا؟ مگر جب اس نے میرے سر پر انکا کو دیکھا تو ششدر رہ گیا اور اس نے مرعوب ہو کر وعدہ کر لیا کہ وہ ایک ہفتے بعد تربینی کے جاپ کو توڑنے کا کوئی نہ کوئی اُپائے ڈھونڈ لے گا۔ یہ ایک ہفتہ بڑی مایوسی اور کرب میں گزرا۔ نرگس کو میں نے پوری صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ادھر صابر علی مجسٹریٹ نے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے نازلی کو اسمگلنگ کے ایک چکر میں پھنسوا دیا۔ اس خبر کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں تو انکا کی جدائی سے ہراساں تھا۔ آٹھ دن بعد بھگوان پرشاد نے حسب وعدہ مجھے مٹی کی ایک کوری ہانڈی دی جس کا ڈھکنا سوکھے آٹے سے بند تھا۔ پنڈت بھگوان پرشاد نے مجھے ہدایت کی کہ میں "کالی مائی" کا شبھ نام لے کر اُسے منڈل کے اندر پھینک دوں۔ اسے یقین تھا کہ تربینی اپنا جاپ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ یا بصورت دیگر ہم دونوں پر تباہی آ جائے گی۔" منڈل کے قریب پہنچ کر میں نے تربینی کو اُکسایا اور ہانڈی اس کی طرف اُچھال دی۔ ہانڈی تربینی کے قریب پہنچ کر اس سے ٹکرانے کے بجائے فضا میں معلق ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے لاتعداد شیطانی آوازوں کا شور اُبھرنے لگا۔ گرد منڈلانے لگے تھے، اچانک میں نے دیکھا کہ بھگوان پرشاد چیختا ہوا منڈل کے قریب پہنچا اور کالی مائی سے گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ لیکن بھگوان پرشاد کے اوپر ہانڈی واپس آ کر گری۔ اسے چھوٹے چھوٹے ناگوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں یہ منظر دیکھتے ہی وہاں سے بھاگا۔ اس حادثے کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں ایک دن بے ہوش رہا۔ اب ہر ترکیب ناکام ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے سر کی طرف دیکھا انکا اداس اور لُوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ میری انکا۔ میری زندگی انکا۔ پھر وہ وقت آگیا جب اس نے مجھ سے رقت بھرے لہجے میں کہا۔ "جمیل۔ میں اب تم سے جدا ہو رہی ہوں، ہمارا ساتھ چھوٹنے والا ہے۔"

اور وہ لمحہ بھی آگیا۔ انکا واقعی مجھ سے جدا ہو گئی۔ تربینی اپنے جاپ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں انکا کے جانے کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ پھر تو میری دنیا ہی پلٹ گئی۔ میرا جی اپنے سسر کے گھر میں نہ لگا۔ میں نے نرگس سے واپس بمبئی چلنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر اس عرصے میں ایک واقعہ ایسا ہو گیا کہ جس نے مجھ سے میری نرگس کو چھڑا دیا۔ نازلی نہ جانے کہاں سے وارد ہو گئی۔ اور اسے میرے سسر نے میرے ساتھ شرمناک حالت میں دیکھ کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں تنہا بمبئی آیا تو ذہنی انتشار نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے شراب اور عیاشی میں اپنے غم بھلانے چاہے۔ میں تباہ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ سب ختم ہو گیا۔ مکان، کاروبار، عزت اور نرگس بھی۔ نرگس کو میں نے طلاق نامہ لکھ کر بھجوا دیا۔ میرے پاس سے ہر چیز چھن گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں ایک سستے قسم کے ہوٹل میں مقیم ہو گیا۔ وہاں میرے پاس میری پرانی شناسا شکنتلا آئی اور اس نے مجھ سے پُونا چلنے کے لئے اصرار کیا۔ میں اسے برقع میں ملبوس ایک ٹیکسی میں بٹھا کر پُونا لے گیا۔ وہاں ہم دونوں پکڑے گئے۔ شکنتلا گھر سے بھاگ کر آئی تھی اور پونا پولیس کو اس کی تلاش تھی۔ اس نے تھانے میں میرے خلاف بیان دیا کہ میں اسے بمبئی سے بھگا کر لایا ہوں۔ چار ماہ تک جیل میں رہا جب مجھے رہائی ملی تو میری جیب میں کوئی پیسہ نہیں تھا۔ میری ڈاڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ میں ایک سڑک پر کھڑا اپنی بے بسیوں پر آنسو بہا رہا تھا کہ کسی نے میرے آگے بھیک ڈال دی میں نے بھوک سے مجبور ہو کر انہیں اٹھا لیا۔ یوں میں بھکاری بن گیا۔ ایک روز میں ریس کورس کے فقیروں کے ساتھ کھڑا تھا کہ میں نے تربینی کو دیکھا۔ وہی تربینی جس نے انکا کو مجھ سے چھین لیا تھا وہ ایک خوبصورت عورت کے ساتھ تھا۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور ایک دس کا نوٹ میرے ہاتھ میں تھما کر چل دیا۔ تربینی کا میں خون پینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے دیئے ہوئے نوٹ کے پرزے پرزے کر دیئے اور اس انتظار میں کھڑا ہو گیا کہ کب ریس ختم ہو، کب وہ باہر نکلے اور کب میں اس کا کام تمام کروں۔

جب تربینی ریس کے اختتام پر باہر نکلا تو میں نے ایک پتھر کھینچ مارا۔ مجھے تعجب تھا کہ میرا نشانہ حیرت انگیز طور پر خطا ہو گیا، پتھر ایک پارسی کے سر سے ٹکرایا اور ایک بار پھر میں پولیس کے چنگل میں پھنس گیا۔ لوگوں نے مجھے بہت مارا اس قدر کہ میرے اوسان جاتے رہے۔ پھر اچانک ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ خود تربینی میری رہائی کے لئے آیا، اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور گھر آ گیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ اس طرح میں تربینی سے قریب رہ سکوں گا اس کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

میں وہاں رہ تو رہا تھا مگر میری حیثیت تربینی کے زرخرید غلام کی سی تھی، مجھ سے توہین آمیز برتاؤ کیا جاتا تھا۔ تربینی کی زندگی کا ہر لمحہ "انکا" کے سبب عیش و نشاط میں گزر رہا تھا ایک رات اس نے مجھے ایک لڑکی کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب پستول میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے لڑکی کے بجائے تربینی پر گولی چلا دی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، ناچار مجھے لڑکی کو مارنا پڑا۔ دوسری صبح مجھ پر سخت مظالم توڑے گئے۔ بیس روز تک میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر میں نے تربینی سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ اس قسم کی حرکت نہیں کروں گا۔ ایک رات جب میں نے اپنی سابق محبوبہ شکنتلا کو تربینی کے ساتھ بدمست پایا تو تربینی پر پھر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ لیکن عین اس وقت جب میں اسے پیچھے سے مارنا چاہتا تھا انکا میرے سر پر وارد ہو گئی اور اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر آئندہ میں نے اس کے آقا پر حملہ کیا تو وہ مجھے عبرتناک حالات سے دوچار کر دے گی۔ انکا کا رویہ عجیب تھا، وہ مجھ سے ایک اجنبی کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ اب تربینی کو مارنے کی کوئی صورت نہ تھی مگر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ ہی گئی، میں نے سوچا کہ جس وقت انکا خون پینے میں معروف ہو اور تربینی کا سر خالی ہو عین اس وقت میں اس پر حملہ کر دوں تو کامیاب ہو سکتا ہوں۔ خوش قسمتی سے ایسا موقع ہاتھ آ گیا۔ جب انکا اپنے شکار کا خون پینے میں معروف تھی میں بھاگا ہوا ڈرائیور کے پاس آیا اور اسے کوٹھی کی طرف چلنے کی ہدایت کی۔

میرے پاس تین گھنٹے کی مہلت تھی مگر عین وقت پر ڈرائیور نے جانے سے انکار کر دیا۔ چار و ناچار مجھے اپنا واحد ہاتھ اس کی گردن پر تنگ کرنا پڑا۔ اسے پچھلی نشست پر ڈال کر میں نے اسٹیرنگ کو کسی نہ کسی طرح قابو میں کیا۔ تربینی کے پاس پہنچ کر ڈرائیور کی گرفتاری کا من گھڑت قصہ سنایا۔ گفتگو کے دوران مجھے ایسا موقع مل گیا کہ میں تربینی پر وار کر سکوں، میں نے بھرپور وار کیا قریب تھا کہ تربینی کا کام تمام ہو جاتا کہ اسی وقت انکا میرے سر پر آ گئی اور اس نے اپنے آقا پر ہاتھ اٹھانے کے جرم میں میری ایک آنکھ کی بینائی چھین لی میں اس حادثے کی تاب نہ لا سکا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اسپتال میں پڑا پایا۔ معلوم ہوا کہ تربینی نے مجھے اسپتال میں داخل کرایا ہے۔ میں نے اپنے غموں سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہی لیکن زہر بھی انکا نے مجھے پینے نہ دیا۔ میں مر بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسری صبح میں اسپتال کے بجائے گھر پر تھا۔ تربینی میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب میں اس کا غلام تھا اور میں نے خود کو حالات پر چھوڑ دیا تھا۔ اٹھائیس روز گزر گئے پھر ایک دن تربینی نے مجھے اپنے عشرت کدے میں بلوایا۔ وہاں نازلی تھی۔ نازلی نے میری شکل دیکھ کر نفرت کا اظہار کیا۔ میں اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ جب تربینی نے حسب معمول مجھے اسے لے جانے اور مارنے کا حکم دیا تو مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی۔ میں نے ویرانے میں جا کر نازلی کے جسم پر سفاکانہ طریقے سے پے در پے ضربیں لگائیں۔ پُونا تک ہونے والی قتل کی ان وارداتوں نے پولیس کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ مگر جب تک انکا موجود تھی تو کون ہمارے اوپر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ایک روز شوبھا آئی۔ شوبھا کا خون انکا کو فراہم کرتے وقت وہ میرے سر پر اچانک آئی اور اس نے اشارتاً کہا کہ تربینی اسی مصیبت میں گرفتار ہے جس میں ایک بار میں تھا، انکا نے کوئی تشریح نہ کی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ مگر ایک دن تربینی نے خود آ کر مجھ سے کہا کہ "ایک پنڈت شیو چرن نامی نے انکا کے حصول کے لئے جاپ شروع کر دیا ہے۔ اگر میں اسے مار دوں تو میرے دن پھر سکتے ہیں۔ میرا کیا تھا؟ میں نے آمادگی ظاہر کر دی اور اپنے دل میں طے کر لیا کہ کسی طرح اسوقت شیو چرن کو مارنے میں کامیاب ہو جاؤں، جب تربینی کے قبضے سے نکل کر اس کے پاس انکا جا رہی ہو۔ تو کایا پلٹ جائے چنانچہ میں فوراً سورت روانہ ہو گیا۔۔۔

میں، جو ظلم وستم برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا، اب ایک عرصے بعد کھلی فضا میں آزادی کا سانس لے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نربدا کے کنارے پہنچا اور راستہ بھٹک گیا۔ اس وقت انکا نے اچانک میرے سر پر آکر میری رہنمائی کی۔ انکا نے وہی بے نیازی کی باتیں کیں جو وہ تربینی کی تابع ہو کر کرسکتی تھی۔ جب میں نے اس سے اپنی بے چینیوں کا رونا رویا تو اس نے کوئی توجہ نہ کی اور میرے سر سے چلی گئی۔ چار و ناچار میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر آگے بڑھتا رہا۔ میں نے اب ارادہ بدل دیا تھا اس لئے کہ تربینی کے سر سے جانے اور شیوچرن کے سر پر چڑھنے کی درمیانی مدّت کا تعین کرنا ممکن نہیں تھا۔ بہتر تھا کہ انکا شیوچرن کے پاس جانے کے بجائے تربینی کے پاس ہی رہے۔ چنانچہ میں نے شیوچرن کے منڈل کے قریب پہنچ کر اس کا جاپ توڑنے کی ناکام کوشش کی میں نے پتھر شیوچرن کی طرف اچھالے لیکن وہ واپس آکر میرے اوپر ہی گرے اور میں زخمی ہو کر بے ہوش ہوگیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک پنڈت بدری نرائن کی کٹیا میں تھا۔ اس کی مشفقانہ باتوں سے مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ بڑا گیانی دھیانی پنڈت ہے۔ بہرحال اس نے میری بڑی مدد کی اس نے کالی دیوی کو رام کیا اور قصّہ مختصر یہ کہ بہت سخت مراحل کے بعد کسی نہ کسی طرح میں شیوچرن کو مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ جب میں کامیاب و کامران تربینی کے پاس واپس آیا تو اس نے وعدے کے مطابق میری بڑی پزیرائی کی، مجھے برابر کا درجہ دیا۔ میرے دن پھر گئے۔ پھر وہی عیش و نشاط کا بازار گرم ہوا ہر روز روزِ عید۔ ہر شب شبِ برات۔ مجھ اس نے بنگلہ گاڑی، نوکر چاکر دیئے۔ میری ہر شب کسی نوخیز دوشیزہ کے ساتھ بسر ہوتی۔ اور ایک رات ایسا ہوا کہ ایک نوجوان لڑکی جو نرگس کی ہم شکل تھی مجھے میرا ماضی یاد دلا گئی۔ نرگس مجھے کچھ اس طرح یاد آئی کہ میں کہیں کا نہ رہا۔ میں نے تربینی سے درخواست کی کہ وہ انکا کو دو چار روز کے لئے میرے حوالے کردے مگر اس نے بہت صاف لہجے میں انکار کر دیا۔ انکا کے بغیر میں نرگس کی بازیابی میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ تربینی کے انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اب ہر وقت نرگس کا مجھے خیال رہتا تھا۔ اس لئے میں نے ایک دن یہ طے کر لیا کہ مجھے نرگس کے شہر جا کر اسے منانے کی کوشش تو کرنا چاہیئے۔ میں نے تربینی سے اجازت لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ جب میں نرگس کے مکان کے قریب پہنچا تو میرے قدم لرزنے لگے اور میں عجیب قلبی کیفیات سے دوچار ہوگیا۔۔۔۔

جب میں نے کوٹھی کے اندر لان پر نگاہ ڈالی تو وہاں نرگس تنہا موجود تھی۔ وہ کچھ لُٹی لُٹی نظر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ [illegible] جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر وہ بڑی حیران ہوئی میں نے اس سے اپنے قلبِ مضطرب کا احوال کہا تو وہ رونے لگی۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ [illegible] صاحب اچانک آگئے۔ انھوں نے مجھے نرگس کے ساتھ کھڑا دیکھ کر میری توہین کی، مجھے طمانچہ مارا۔ ان کے ڈرائیور نے گریبان پکڑ کر مجھے زدوکوب کیا۔ اس ذلت کے بعد میں وہاں سے بھاگ آیا اور اپنے ہوٹل پر پہنچ کر دم لیا۔ ہوٹل سے میں نے نرگس کو کئی فون کئے، کوئی جواب نہ ملا۔ بالآخر اس کی ایک سہیلی مجھ سے ملنے آئی اور اس نے بتایا کہ میرے اصفہانی صاحب کے یہاں سے جانے کے بعد انھوں نے نرگس پر پابندیاں عائد کردیں اور جب میرا طلاق نامہ مل گیا تو انھوں نے اس کی شادی کردی لیکن یہ شادی نرگس کو راس نہیں آئی۔ روزِ اوّل ہی سے نرگس اور اسکے شوہر کے درمیان اَن بن ہوئی اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ نشاط سے نرگس کی داستانِ غم سُننے کے بعد میرا بُرا حال ہوا۔ نشاط نے مجھ سے کہا کہ دو چار روز میں وہ کسی نہ کسی طرح مجھے نرگس سے ملا دے گی۔ سات دن انتظار کے بعد مجھے ایک پیغام ملا کہ نرگس مجھے بلا رہی ہے۔ میں ایک بچے کے ساتھ جو پیغام لے کر آیا تھا نرگس سے ملنے گیا، وہاں نرگس نہ تھی اصفہانی صاحب اور ان کے کرایے کے غنڈے تھے جنھوں نے مجھے اس قدر مارا کہ میں مرتے مرتے بچا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو ایک متعفن جگہ پڑا ہوا پایا۔ اس شکستہ اور درماندہ حالت میں مجھے اپنا دوست رام دیال یاد آیا میں اس کے پاس پہنچا، اس نے بڑی خاطر تواضع کی۔ اس عرصے میں، میں کئی پجاریوں سے ملا کہ نرگس کے سلسلے میں کسی جادو ٹونے سے مدد لوں اور انکا کو حاصل کرنے کا جاپ سیکھوں۔ بڑی مشکل سے مجھے پنڈت بدری نرائن مل گیا۔ وہی پنڈت جس نے شیوچرن کو ٹھکانے لگانے میں میری مدد کی تھی اُس نے میرے اصرار اور خوشامد پر میری مدد کا وعدہ کیا۔ اس نے رامپور میں مجھے برکاتی شاہ سے ملنے کو کہا۔ میں رام دیال سے سفر خرچ لے کر برکاتی شاہ کی تلاش میں روانہ ہوا۔ وہ ایک مجذوب تھا جو مجھے رامپور کی سڑکوں پر بہت غلیظ حالت میں خاصی تگ و دو اور مایوسیوں کے بعد کہیں مل سکا، وہ بے تحاشا گالیاں بکتا تھا اور انتہائی گندی حالت میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے کئی بار دھتکار دیا مگر میں اُس کے پیچھے لگا رہا اور اُس کی خدمت میں مصروف رہا۔ میری حالت بھی اُسی جیسی ہوگئی، لوگ ہمیں دیوانہ سمجھتے۔ آخر تین ماہ کی مشقت، خدمت اور ریاضت کے بعد برکاتی شاہ کو میرے اوپر ترس آیا اور اُس نے مجھے ایک وظیفہ بتایا جو مجھے کسی ویران قبرستان میں چالیس روز تک پڑھنا تھا۔ وظیفہ بتاتے بتاتے وہ اچانک نظروں سے اوجھل ہوگیا اور میں نے دریائے کوسی کے قریب وظیفے کا وِرد تمام تر آرزوؤں کے ساتھ شروع کر دیا۔

میں نے برکاتی شاہ کی ہدایت پر دریائے کوسی کے قریب ایک پُرانے قبرستان میں جو آبادی سے دُور اور ویران حالت میں تھا، ایک پُرسکون گوشہ تلاش کیا اور اس وظیفے کا وِرد شروع کر دیا جو برکاتی شاہ جیسے صاحب کرامت بزرگ نے بتایا تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ میں اس عمل کو پورا کرنے کے بعد ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی مُسرّتیں کو حاصل کر سکوں گا۔ میرا ذہن آنے والے سنہری دنوں کے تصوّرات سے سرشار تھا۔ مجھے اعتماد تھا کہ وظیفہ پورا ہو جانے کے بعد میری زندگی میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوگا۔ مجھے انکا مِل جائے گی اور پھر میری نرگس میرے قریب آجائے گی۔ سب کچھ بدل جائے گا، دولت عزّت نرگس انکا۔ میں ایک نئی زندگی کے خیال میں مست شب و روز وظیفے میں منہمک رہا۔

ایک دُور دُور تک قبرستان کی ویرانی اور پُر اسرار ماحول نے میری محویت میں خلل ڈالا۔ آپ ذرا تصوّر کیجئے کہ شکستہ قبروں کے درمیان میں تن تنہا بیٹھا ہوں۔ دن تو کسی طرح گزر جاتا ہے لیکن رات آتی ہے اندھیری رات۔ دُور دُور تک کسی آدم زاد کا نام و نشان نہیں۔ سردی کا موسم ہے مگر کچھ ایسی زیادہ سردی نہیں۔ نہ میرے پاس کھانے کو کچھ ہے نہ پہننے کو۔ صرف ایک اعتقاد ہے کہ برکاتی شاہ کے ساتھ میں کتنے دن گزار چکا تھا اور اس کے بعض

حیرت انگیز واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اس وظیفے میں اپنی نجات نظر آتی تھی۔ جو شخص میری طرح اتنے بُرے دن گزار چکا ہو۔ اتنے نشیب و فراز دیکھ چکا ہو۔ زندگی نے اس کے ساتھ ہولناک مذاق کئے ہوں اس کے لئے یہ پُر ہیبت جگہ کیا حیثیت رکھتی ہے۔ شروع شروع میں تو میرے قدم ڈگمگائے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے بے شمار بدروحوں نے میرے اوپر یلغار کر دی ہو کبھی یوں لگتا کہ ابھی کوئی مُردہ ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں اپنی منہدم قبر سے باہر نکل کر مجھے دبوچ لے گا۔ دن بھر میرا ذہن ان پراگندہ خیالات سے آزاد رہتا لیکن اندھیرا پھیلتے ہی قبرستان کا ماحول بہت خوفناک اور پُراسرار ہو جاتا۔ اگر کوئی پتا بھی کھڑکتا تو کسی بدروح کا تصور میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا اور اس وقت میں آنکھیں بند کر کے اپنے وظیفے میں اور مستغرق ہو جاتا لیکن میری یہ کیفیت محض ایک دو دن ہی رہی اس کے بعد میں جیسے اس ویرانی اور ہیبت کا جزو بن گیا۔ میری محویت کا یہ عالم ہو گیا کہ مجھے شب و روز کی کوئی فکر نہ رہی۔ میرے اندر غیر معمولی قوت مدافعت پیدا ہو گئی تھی۔ میں دن اور رات میں چند بار ہی اپنی اس محویت کو ختم کرتا۔ دریائے کوسی پر وضو کرتا۔ مجھے نہیں معلوم کس طرح تیسرے دن ایک شخص قبرستان میں آیا۔ اس نے ایک قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مجھے دیکھا اور میرے انہماک کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ میں اس سے کچھ نہیں بولا تو وہ وہاں سے چلا گیا اور شام کو پھر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک سینی تھی جس میں معمولی کھانا تھا۔ وہ میرے قریب رکھ کر چلا گیا۔ میں نے ۲ دن بعد بہت معمولی سا کچھ کھایا اور کوسی کا پانی پی کر پھر وظیفے میں غرق ہو گیا۔ پھر اس شخص کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر دوسرے تیسرے روز شام کو اسی طرح کھانا رکھ جاتا اور چلا جاتا۔ میری اس سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ شکل و صورت سے دیہات کا کوئی ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس نے میرے اوپر ترس کھا کر اپنا یہ معمول بنا لیا تھا۔ اصل میں بھوک پیاس کا مجھے خیال ہی نہیں آتا تھا۔ اگر وہ شخص مہربانی نہ کرتا تب بھی میں چالیس دن تک کسی نہ کسی طرح بھوکا رہ لیتا۔ برکاتی شاہ کے وظیفے میں ہی کوئی ایسی صلاحیت تھی کہ مادی دنیا کی ہر ضرورت سے بے نیازی خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔

شروع شروع میں تو دن مجھے یاد رہے لیکن بعد کو میں انہیں نہ گن سکا۔ میں اپنے وِرد میں اس قدر محو رہا کہ مجھے دن بھی یاد نہیں رہے مجھے ضرور احساس تھا کہ خاصے دن گزر چکے ہیں لیکن کتنے؟ اس کا کسے ہوش تھا پھر ایک دن دوپہر کے وقت مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میرے سامنے کوئی کھڑا ہے جیسے وہ برکاتی شاہ ہیں۔ اس پیر مرد کی موجودگی محسوس کر کے میری زبان آپ ہی آپ بند ہو گئی۔ میرے لبوں کی مسلسل حرکت ساکت ہو گئی۔ میرے کانوں میں عین اسی وقت ایک مدھم آواز گونجی۔

"تمہارا کام ختم ہوا۔ اب یہاں سے جاؤ"

جواب میں، مَیں نے۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے کچھ بولنا چاہا مگر میرے ہونٹوں کو جنبش کا یارا نہ ہوا۔ وہ سب مجھے ایک خواب سا محسوس ہوا۔ میں محو اسی کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر اسے وہم سمجھ کر میں نے دوبارہ وظیفہ شروع کر دیا۔ مگر ایک ثانیے بعد وہی آواز مجھے سنائی دی اور پھر مجھے محسوس ہوا جیسے برکاتی شاہ یہیں کہیں موجود ہیں جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

"اُٹھو۔ تمہارا کام ختم ہوا اپنی منزل تلاش کرو"

اس آواز کے ساتھ مجھے حق اللہ، حق اللہ کی صدائیں گونجتی نظر آئیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے برکاتی شاہ واپس جا رہے ہوں۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں لیکن وہاں میرے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ میں نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا مگر دُور دُور تک قبرستان کی خاموشی اور ٹوٹی پھوٹی قبروں کی ویرانی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

یہ کیسا اسرار تھا؟ یہ آواز کس کی تھی؟ کیا یہ میرا وہم تو نہیں؟ کیا میں نے چالیس دن مکمل کر لئے؟ خاصی دیر تک میں اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا غور کرتا رہا۔ پھر میرے جی میں کیا آئی کہ میں ایک عزم کے ساتھ اٹھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ برکاتی شاہ تھے جو میرے وظیفے کی مدت ختم ہونے کا اشارہ کر کے واپس چلے گئے گویا میرا وظیفہ ختم ہو گیا۔ گویا میں کامیاب ہو گیا۔ میں ایک عجیب لذت محسوس کر رہا تھا۔ چالیس روز تک ایک جگہ بیٹھے بیٹھے میری حالت بہت مضحکہ خیز ہو چکی تھی۔ جلد سردی کے سبب سے کچھ کھُردری ہو گئی تھی۔ داڑھی اور سر کے بال بہت بڑھ گئے تھے، میری جلد کی رنگت بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ لیکن

مجھے ان تبدیلیوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں اپنی دُھن میں مست آبادی کی طرف قدم اٹھا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا ہر اٹھتا ہوا قدم کامیابی کی طرف مجھے لے جائے گا۔ وہ نرگس کے قریب لے جائے گا۔ نرگس اُف۔ میری نرگس۔ اس کا خیال آیا تو نہ جانے کہاں سے بے تحاشا پیار اُمڈ آیا۔ میں جس کیفیت سے دوچار تھا اس کا اظہار الفاظ کی زبانی کرنا ممکن نہیں۔ ایسی باتیں، ایسی کیفیتیں تو صرف محسوس کی جا سکتی ہیں انہیں لکھا نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر اچانک میں ٹھٹک کر یوں رُک گیا جیسے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ گئی ہو۔ میں نے عالم تصور میں ڈرتے ڈرتے اپنے سر پر نظر ڈالی لیکن وہاں بڑھے ہوئے اُلجھے ہوئے بالوں کے سوا مجھے کچھ اور نظر نہیں آیا۔

"انکا"

میری رُوح سے ایک کربناک چیخ بلند ہو کر میرے پورے وجود پر چھا گئی۔ انکا نہیں آئی۔ میں نے کئی آوازیں دیں۔ "انکا — انکا — انکا — اب تم آ جاؤ۔ دیکھو میں نے وظیفہ مکمل کر لیا ہے، انکا"۔ مگر میرا سر خالی ہی رہا۔ میں نے جھنجلا کر اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ وحشت میں اپنے سر کو پیٹا۔ میں نے اپنے منہ پر بے تحاشا تھپڑ مارے۔ "انکا۔ انکا۔ تم آتی کیوں نہیں۔ کیا میرے بُرے دن ختم نہیں ہوئے۔ پھر انکا کس طرح آئے گی۔ میں نے تو وظیفہ بھی ختم کر لیا۔ میں نے تو برکاتی شاہ کے کہنے پر چالیس دن بھی گزار دیئے۔ پھر یہ کیا ہوا؟ کیا میرے ساتھ قسمت پھر کوئی مذاق کر رہی ہے؟" اتنی سرعت کے ساتھ متضاد خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے کہ میں پاگل ہونے کے قریب تھا۔ اب کیا ہو، میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ کیا میں اب تک سراب کے پیچھے بھاگتا رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگا جیسے دن دہاڑے کسی نے میری جیب کاٹ کر زندگی کی تمام جمع پونجی سے محروم کر دیا ہو۔ اس شخص کی حالت پر غور کیجیے جسے زندگی نے اس طرح تماشا بنایا ہو۔ بہت سے مرحلے آئے۔ بہت خطرناک بڑے جان لیوا مگر پہلی بار مجھے محسوس ہوا جیسے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ پہلی بار شدت سے مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ میں تھک ہار کر سڑک کے ایک کنارے بیٹھ گیا اور گھٹنوں میں منہ دے کر زار و قطار رونے لگا۔ کوئی شخص بھی میرے اس گریے اور آہ و بکا کا سبب پوچھنے نہیں آیا۔ جب میں بہت رو چکا تو نیم دلی کے ساتھ اٹھا — برکاتی شاہ — وہ بوڑھا شخص۔ اُسے شاید میرے حال پر رحم نہیں آیا۔ میں نے یہ وظیفہ خلوص دل اور تمام تر توجہ اور استغراق سے مکمل کیا تھا۔ وظیفے کے دوران میری نیت میں کوئی بھی کھوٹ نہیں تھی۔ پھر مجھے خیال آیا۔ ممکن ہے میں مدت سے پہلے اٹھ گیا ہوں، شاید وہ آواز جو میں نے قبرستان میں سُنی تھی کہ میں وظیفہ ختم کر دوں۔ فریب تھی۔ مجھے دوبارہ وظیفہ پڑھنا چاہیے اچانک میرے قدم قبرستان کی سمت اٹھ گئے — مگر میں دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ رُک گیا۔ اب کون یہ چالیس دن گزارے۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ دوبارہ وظیفے کے بعد قسمت بدل جائے۔ بربادی مقدر میں لکھی ہے تو یہی سہی۔ پر اب میں جاؤں کہاں۔ وظیفے کی کامیابی کی خوشی کے بعد اس مایوسی نے میرے ذہن کو جو دھچکا پہنچایا۔ اس نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیئے

اور ایک بار پھر — کئی بار کی طرح — مجھے خودکشی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں نظر آیا۔ یہ زندگی کس کام کی۔ اب اسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ نہ جانے کب تک میں بے یار و مددگار کھڑا سڑک پر آنسو بہاتا رہا۔ سسکتا رہا۔ سوتا رہا۔ وہ تنہائی جیسے اس دُنیا میں میرا کوئی نہیں۔ وہ ہولناک تنہائی مجھے پہلی بار شدت سے محسوس ہوئی۔ جی چاہتا تھا کہ برکاتی شاہ کو خوب بُرا بھلا کہوں۔ وہ کہیں مل جائے تو اس کا گریبان پکڑوں لیکن پھر میں خود کو سمجھاتا اس میں برکاتی شاہ کا کیا قصور ہے۔ انہوں نے تو مجھے ٹالنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ میں خود نہیں مانا اور ان سے اصرار کیے گیا۔ ٹالنے کے لئے انہوں نے مجھے یہ طریقہ بتلا دیا اور جب میں واقعی وظیفے میں منہمک ہو گیا تو انہوں نے آ کر مجھے اٹھا دیا۔

خودکشی — بس یہی آخری طریقہ نجات کا ہے۔ پھر معاً میرے ذہن میں دیوناتھ پجاری کا نام اُبھرا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میری مدد کر سکتا ہے لیکن کسی دیوی نے میرے خلاف فیصلہ دے کر اسے میری مدد سے روک دیا تھا۔ اس اندھیرے میں پنڈت بدری نرائن کا نام کسی ٹمٹماتے دیے کی طرح میرے ذہن میں روشن ہوا۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں ایک بار پھر پنڈت سے ملوں اور اس کے سامنے جھولی پھیلا کر مدد کی بھیک مانگوں۔ اس نے ہی تو برکاتی شاہ کے بارے میں بتایا تھا۔ میں اس سے جا کر پوچھوں گا کہ میں نے وظیفہ مکمل کر



لیا۔ پھر میرے دل کی مُراد کیوں بَر نہیں آئی۔

ہر چند کہ یہ خیال کچھ زیادہ دل خوش کن نہ تھا تاہم مجھے یہ خودکشی سے بہتر لگا۔ میں نے پنڈت بدری نرائن سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور گرتے پڑتے قدموں سے شہر کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اس لئے آبادی میں پہنچ کر مجھے بھیک مانگنی پڑی۔ لوگ میری حالت پر ترس کھا کر مجھے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے میں نے ان کی نگاہوں میں ہمیشہ اپنے لئے نفرت اور حقارت کا جذبہ ہی محسوس کیا۔ لیکن میں اب ہر ستم سہنے اور ہر جبر برداشت کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ رام پور کی سڑکوں بازاروں اور محلّوں میں ڈیڑھ دو ماہ تک میں اپنا ہاتھ دراز کیئے رہا۔ اور کوڑی کوڑی جمع کرتا رہا۔ جب میرے پاس پنڈت بدری نرائن کے پاس پہنچنے کا کرایہ اکٹھا ہو گیا تو ایک روز میں اسٹیشن جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سفر کے دوران میرے دل و دماغ پر [illegible] چھایا رہا۔ مجھے پنڈت سے کوئی بڑی امید نہیں تھی بس یونہی میں اس کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ڈیڑھ ماہ رام پور شہر میں جس بے بسی سے گزارا اس کی تفصیل سے میں نے گریز کیا ہے۔

نرگس کے شہر پہنچ کر میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھے اور میں نے بڑی مشکل سے انہیں رام دیال کے مکان کی طرف ڈالا۔ رام دیال نے حسب معمول میری خاطر مدارات کی۔ مجھے کپڑے دیئے۔ اس نے میری شکستہ حالت دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔

"جمیل احمد تمہیں کیا روگ لگ گیا ہے؟"

"میں مرنا چاہتا ہوں۔ پر مر نہیں سکتا۔ یہی میری زندگی کا غم ہے"۔ میں نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

رام دیال نے مجھے بڑے دلاسے دیئے۔ میری ہمت بندھائی میں اس کی بات خاموشی سے سنتا رہا اور پہلی فرصت میں پنڈت بدری نرائن کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس وقت میری کیفیت اس مجرم کی سی تھی جس پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہو اور وہ اپنا آخری فیصلہ سننے کے لئے مضطرب ہو۔ میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اتفّاق سے پنڈت گھر پر موجود تھا۔ ایک عرصے بعد مجھے اپنے دروازے پر اس طرح کھڑا دیکھ کر وہ کچھ حیرت زدہ سا ہوا پھر خاموشی سے میرا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا اور ایک تخت پر بٹھا دیا۔ میں امید و بیم کی کیفیت سے دوچار پنڈت کے بولنے کا منتظر تھا۔ پنڈت نے جب مجھے سکون سے بٹھا دیا تو بڑے اطمینان سے بولا۔

"کیا بات ہے میاں جمیل احمد۔ تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو"۔

"پنڈت جی"۔ میں رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "آپ کے پاس کوئی زہر ہے؟"

"کیا مطلب۔ مجھے بتاؤ کہ آخر تمہارے اوپر کیا بیتی"۔ پنڈت نے حیرت سے پوچھا۔

"جو بیتنا تھی بیت گئی اب اور کیا بیتے گی۔ اب صرف ایک اذیت اور سہنی ہے پنڈت جی۔ موت کی اذیت اور میں اس کے لئے تیار ہوں"۔ میں نے اُداسی سے کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔

> ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو منضبط کر کے ملک کی خدمت کر سکتا ہے۔ کیا ہماری عادات باقاعدہ ہیں؟ کیا ہم سڑک کے بائیں طرف رہتے ہیں؟ کیا ہم راستے میں کوڑا کرکٹ پھینکنے سے احتراز کرتے ہیں؟ کیا ہم اپنے کام میں دیانت دار اور مخلص ہیں؟ کیا ہم دوسرے انسانوں کی اتنی ہی مدد کرتے ہیں جتنی ممکن ہے؟ کیا ہم روادار ہیں؟ ممکن ہے آپ کو یہ باتیں چھوٹی چھوٹی معلوم ہوتی ہوں لیکن انہی میں نظم و ضبط کی روح پوشیدہ ہے۔
>
> قائداعظم۔ نومبر ۱۹۳۹ء

مجھے بتاؤ میرے بچے تمہیں کیا ہوا ہے؟"

پنڈت کے اس مشفقانہ رویے میں ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے میں رونے لگا۔

"پنڈت جی۔ اپنی جیسی ہر کوشش کرلی۔ لیکن قسمت خراب لے کر آیا ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہوگئی۔ اتنے نراش کیوں ہوتے ہو۔"

"پنڈت جی۔ اب بہت ہوگیا۔"

"کیا بہت ہوگیا۔ کچھ کہو تو سہی۔ منہ سے تو کچھ بولو۔" پنڈت بدری نرائن نے جھنجلا کر کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم کہاں سے آرہے ہو۔ کیا تمہیں برکاتی شاہ نہیں ملے؟"

"ملے تھے۔" میں نے مختصر جواب دیا

"پھر کیا ہوا؟"

"اس دیوانے نے پہلے تو میری کوئی بات نہیں سنی۔ مجھے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ سڑکوں پر غلاظت کے ڈھیر میں پڑا رہا۔"

"پھر کیا ہوا؟" پنڈت نے اشتیاق سے پوچھا

"اس کی گالیاں سہتا اور اس کی خدمت کرتا رہا مگر اس نے بھی دھوکا دیا۔"

"کیا بکتے ہو میاں جمیل احمد۔" پنڈت نے ناراضی سے کہا۔ "برکاتی شاہ ایک مہاپرش ہے۔ میں تمہیں اس بات کی آگیا نہیں دے سکتا کہ تم اس کے متعلق ایسی باتیں کرو۔"

میں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "مہاپرش۔ اس مہاپرش نے کئی مہینے کی خدمت کے بعد مجھے ایک وظیفہ بتایا جو میں نے ایک ویران قبرستان میں چالیس روز بیٹھ کر کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ جانتے ہو پنڈت جی؟"

"کیا ہوا؟" پنڈت نے تیزی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ کچھ نہیں ہوا۔"

"کیا تم نے کوئی بھول تو نہیں کی؟"

"اپنی دانست میں تو نہیں کی۔"

"تم نے دن پورے کرلئے تھے؟"

"میں یہی سمجھتا ہوں۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"پھر میں نے بڑی آرزوؤں، امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ انکا کو آواز دی۔"

"اور انکا نہیں آئی۔ بس بس جمیل احمد خاں میں سب سمجھ گیا۔" پنڈت نے اتنا کہہ کر کوئی اور سوال نہیں کیا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اسے بہت دیر سوچتے سوچتے ہوگئی تو میں نے روکھے انداز سے کہا۔

"کچھ بولو مہاراج۔ خاموش کیوں ہوگئے، کس سوچ میں پڑ گئے؟"

پنڈت ایک دم چونکا اور کہنے لگا۔ "مورکھ دھرماتما کبھی کسی منش کو دھوکا نہیں دیتے۔ برکاتی شاہ کو میں جانتا ہوں۔"

"ممکن ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو ٹھیک ہو لیکن میرے ساتھ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب بتائیے میں کیا کروں۔" میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "اب تو دنیا سے جی اکتا گیا ہے۔"

"آتم ہتیا پاپ ہے بالک۔" پنڈت نے میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے متاثر ہو کر کہا۔ "اتنی جلد تمہیں نراش نہیں ہونا چاہئے۔ لگن سچی ہو تو بھگوان منش کو سب کچھ دیدیتا ہے"

"میری لگن سچی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھ سے کچھ مت کہو۔ اب مجھے

"کچھ دیر سوچ لینے دو۔"

بدری نرائن خاموش کھڑا مجھے دیکھتا رہا، وہ میری آنکھوں میں نہ جانے کیا پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر اس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے اس عجیب وغریب تیور سے مجھے الجھن ہونے لگی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ وہ میرے چہرے کو اور میں اس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

"سنو میاں جمیل ——" اچانک پنڈت آنکھیں گھماتے ہوئے بولا "تم کامیاب ہو سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟ کیا اب بھی کوئی صورت ہے؟" میں نے خود پر قابو نہ پاتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے کوئی بھول ہو گئی ہے۔ تم نے برکاتی شاہ سے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ اس وظیفے کے بعد تمہیں کیا کرنا چاہئیے؟"

"اس کا موقع ہی کہاں ملا۔ برکاتی شاہ وظیفہ بتلا کر اچانک میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں تلاش کیا مگر وہ نظر نہیں آئے۔"

"ہونہہ" پنڈت نے گردن ہلائی "ٹھیک ہے۔ اب سنو میاں جی۔ تمہیں واپس تربینی کے پاس جانا ہوگا۔ وہیں کوئی صورت نکل پائے گی۔ اتنی بات یاد رکھو کہ وظیفہ اور جاپ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ انکا کے لئے جاپ کیا جا سکتا ہے اس کے لئے وظیفہ نہیں پڑھا جا سکتا۔"

"پھر برکاتی شاہ نے مجھے یہ کیوں بتلایا تھا؟"

"اس نے صحیح بتایا تھا وہ غلط نہیں کہتا۔ زیادہ مت سوچو تم ان باتوں کو نہیں جانتے۔ تم واپس پونا جاؤ۔" پنڈت بدری نرائن نے حکمیہ لہجے میں کہا۔

"کیا وہاں مجھے انکا مل جائے گی؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"سمے کا انتظار کرو اور مہاپرشوں پر شبہ کرنا چھوڑ دو۔" پنڈت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اگر تمہارا یہی حکم ہے تو میں تربینی کے پاس جانے کو تیار ہوں لیکن مجھے وہاں کیا کرنا ہے، مجھے کچھ بتلائیے تو۔"

"تمہارا وہاں جانا ضروری ہے اور کچھ میں نہیں بتا سکتا۔ وہیں میرا خیال ہے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ تم کامیاب ہو جاؤ میں برکاتی شاہ کو اچھی طرح جانتا ہوں بالکل اچھی طرح۔" پنڈت نے زور دے کر کہا۔ "سمے کا انتظار کرو۔"

"مہاراج ۔ مجھے ذرا سا دلاسہ دے دو کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مجھے میری نرگس مل جائے گی اب اور غم مجھے نہیں سہنے پڑیں گے۔"

"میرا آشیرواد تمہارے ساتھ ہے۔ تم وہاں جاؤ اور ہاں وہ بات یاد ہے؟"

"کونسی بات؟" مجھے کوئی بات یاد نہ تھی اس لئے میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں کاہے کو یاد رہے گی۔ میاں جی۔ یاد ہے تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم انکا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو جب میں چاہوں گا، عارضی طور پر تم انکا کو میرے حوالے کر دو گے۔"

"مجھے یاد ہے مہاراج ۔ مجھے یاد ہے" میں نے کھلے دل سے کہا

"تو جاؤ۔ ترنت یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔"

پنڈت سے رخصت ہو کر اور ایک بار پھر پُر امید ہو کر میں بھاگا بھاگا رام دیال کے پاس آیا۔ میں نے اس سے دو سو روپے مانگے جو اس نے مجھے فوراً دے دیئے۔ بازار جا کر میں نے اپنے کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدے۔ ایک اٹیچی اور ایک بستر بند تیار کر کے میں رام دیال اور اس کی بیوی سے اسی دن اجازت لے کر پونا کے لئے روانہ ہو گیا۔ اسٹیشن کے راستے میں غیر اختیاری طور پر میں نے ٹیکسی کا رُخ نرگس کے مکان کی طرف کر دیا۔ میری کوشش ناکام ہوئی۔ نرگس مجھے نظر نہیں آئی اور چار و ناچار میں اسٹیشن پہنچ کر پونا کے لئے روانہ ہو گیا ———————— یہ سفر بہت اضطراری حالت میں گزرا۔ میں جلد سے جلد پونا پہنچنا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے راستے میں گاڑی چار گھنٹے لیٹ ہو گئی۔ میری کیفیت عجیب تھی۔ گو پنڈت نے انکا کے حصول کے لئے مجھے کوئی فارمولا یا طریقہ کار نہیں بتایا تا ہم اس کے انداز سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں خاصا پُر امید ہے۔ غیر یقینی حالات اب بھی تھے، بہر حال میں یہ ارادہ کر کے کہ ایک

کوشش اور کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔ پہلے کی طرح مایوس اور اُداس نہیں تھا۔ پونا اسٹیشن سے تربینی کا بنگلا کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ ٹرین کو پونا سات بجے پہنچنا تھا۔ چار گھنٹے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے رات کو گیارہ بجے گاڑی وہاں پہنچی۔ میں اسی وقت تربینی سے ملنا چاہتا تھا تربینی کے بنگلے پر پہنچا تو ایک نئے ملازم نے مجھے اندر جانے سے منع کر دیا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس وقت سو رہا ہے میں نے اسے تربینی سے اپنے تعلقاتِ خاص کے کئی حوالے دیئے مگر وہ نہیں مانا۔ آخر میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے علم تھا کہ یہ وقت تربینی کے سونے کا نہیں، وہ یقیناً اپنی خواب گاہ میں کسی لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہوگا۔ اس کے معمولات سے میں واقف نہ ہوتا تو اور کون ہوتا میں خاموشی سے اس وقت واپس آ گیا۔ وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ پونا سے روانگی کے وقت مجھے تربینی نے ہدایت کی تھی کہ میں اسے اپنی خیر خبر سے مطلع کرتا رہوں۔ مجھے اس کی مہلت ہی نہ ملی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ مجھے خدشہ تھا کہ تربینی کے رویّے میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو۔ تمام رات میں خیالات میں اُلجھا رہا۔ دیوی انکا، نرگس، بدری نرائن، برکاتی شاہ، تربینی کے خیالات۔ میں انکا ذکر بار بار نہیں کروں گا میں رات بھر نہیں سو سکا۔ ایسے عالم میں کون ہو سکتا تھا۔ مجھ پر تو ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ میں کوئی فیصلہ چاہتا تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے کوئی طریقہ یا ذریعہ میرے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن خاصا نکل آیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوا۔ پھر تربینی کے بنگلے کی طرف چل دیا۔

اس بار مجھے اس کے پاس پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ تربینی نے اطلاع ملتے ہی مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تربینی کے سامنے گیا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی اس نے میرا استقبال اس انداز سے نہیں کیا جس کی توقع میں کر سکتا تھا۔ جن نظروں سے اس نے مجھے دیکھا ان میں دوستی کا کوئی جذبہ موجود نہ تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے شدید طور پر ناراض ہے۔ میں خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو تربینی نے پہل کرتے ہوئے خشک لہجے میں پوچھا۔

"کب آئے؟"

میں نے مفاہمت کے انداز میں جواب دیا۔ "کل رات۔ مگر تمہارے ملازم نے کل رات مجھے اندر داخل ہونے نہیں دیا۔"

"اتنے دن کہاں رہے؟" اس نے میرے مفاہمت کے رویے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"یونہی ذرا گھومنے میں لگا ہوا تھا۔" میں نے سرسری طور پر کہا۔

"کہاں کہاں گھومے۔ کس کس جگہ ٹھہرے؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"بس ایسے ہی اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا۔"

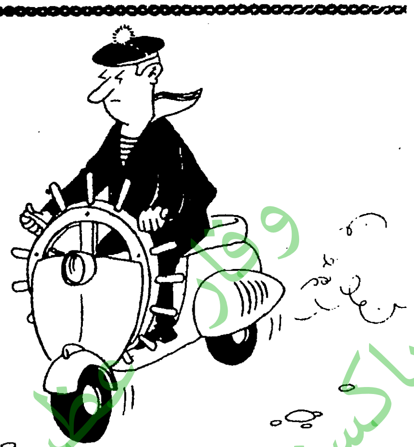
"تم نے اپنے مِتّر کو خیر خبر سے بھی مطلع نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے تاکید کی تھی۔" تربینی نے خشک لہجے میں کہا۔

"مصروفیات نے مہلت ہی نہ دی ورنہ۔۔۔!"

"جمیل احمد خان۔" اچانک تربینی میرا جملہ کاٹ کر بولا۔ "میں نے تمہیں اپنا مِتّر کہا تھا، پر تو ہو سکتا ہے مجھے اپنا یہ فیصلہ بدلنا پڑے۔"

"تربینی۔ میں جانتا ہوں، تم مجھ سے ناراض ہو لیکن اگر میں تم سے ناراض ہوتا تو دوبارہ تمہارے سامنے نہ آتا۔" میں نے نرمی اور یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ "لیکن یہ اتنی بڑی بات نہیں کہ میں نے تمہیں اپنی خیریت سے مطلع کیوں نہیں کیا۔ ویسے مجھے تسلیم ہے یہ میری غلطی تھی۔"

تربینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے کچھ ٹٹولنے والی نظروں



سے گھور رہے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ کسی شدید الجھن کا شکار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس تھا اور ماتھے پر شکنیں۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں کیں لیکن وہ بدستور میرا اسی تجسس آمیز انداز سے جائزہ لیتا رہا۔ میری نرم گفت گو نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر اس کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد وہ میرے قریب آیا اور ٹھوس آواز میں بولا "جمیل احمد خان میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اتنے عرصے کہاں رہے اور کیا کرتے رہے۔ تمہیں معلوم ہے میرے سامنے جھوٹ نہیں بولا جا سکتا۔ انکا مجھے سب کچھ صحیح صحیح بتا دے گی۔ وہ تمہارے بارے میں مجھے ایک ایک پل کی خبر دے سکتی ہے۔"

انکا کا نام سن کر میں سنبھلا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ انکا کی موجودگی میں دروغ گوئی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں تربینی کو کیا جواب دوں۔ کیا اسے صاف صاف سب کچھ بتا دوں۔ پھر اسے کیسے مطمئن کروں۔ اسی لمحے مجھے پنڈت بدری نرائن کا خیال آیا جس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی شکتی کے زور سے انکا کے حصول کے سلسلے میں میرے اور انکا کے درمیان پردہ رکھے گا۔ اس کام کے عوض اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر میں انکا کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میں بخوشی عارضی طور پر انکا کو اس کے پاس بھیج دیا کروں گا۔ میں کوئی مناسب جواب دینے والا تھا کہ تربینی کی خشک آواز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ "جمیل احمد خان تم نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "تربینی جب تم انکا کی لامحدود قوت کے ذریعے میرے بارے میں سب کچھ جان سکتے ہو تو اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہو۔ طویل سفر نے ویسے ہی مجھے بہت تھکا دیا ہے۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" تربینی نے اُکھڑی آواز میں کہا۔ اس کے تیور بتدریج خراب ہوتے جا رہے تھے۔

میں عجیب اُلجھن میں گرفتار تھا۔ اگر حالات نے مجھے مجبور نہ کیا ہوتا اور پنڈت بدری نرائن نے مجھے تربینی کے پاس واپس پہنچنے کو نہ کہا ہوتا تو میں اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ مجھے اس سے شدید نفرت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح ٹالوں۔ تربینی نے مجھے خاموش دیکھا تو ایک دم پھٹ پڑا۔

"جمیل احمد خان۔ تم بھول رہے ہو کہ اس سمے تم کس شکتی کے سامنے موجود ہو۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ میں کون ہوں؟"

"تربینی۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے ایک اور کوشش کی۔ "اگر تمہیں میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہے تو میں آج ہی چلا جاتا ہوں۔"

اس جملے کو ادا کرتے کے بعد میں جانے کے بہانے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے اس شکتی کی دھمکی دے رہا تھا جسے میں نے جان پہ کھیل کر اس کے لئے فراہم کیا تھا۔ اگر میں نے شیو چرن کو نہ مارا ہوتا تو تربینی در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوتا۔ میں نے اپنی ناگواری کا اظہار کرنے کے لئے باہر جانا چاہا۔ میں اٹھ کر چند قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ تربینی کسی زخمی شیر کی طرح میرے سامنے آ گیا۔ اور اپنی انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور کر کرخت لہجے میں بولا۔

"تم اپنی اوقات بھول رہے ہو۔ جمیل احمد خان۔ میں تمہیں دوبارہ پونا کی سڑکوں پر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کی روشنی بھی ختم ہو سکتی ہے۔"

"تربینی۔ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارے مجھ پر بڑے احسانات

ہیں۔ تم میرے دوست ہو۔ یہ بتاؤ کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم اس قدر بگڑ رہے ہو۔ مجھے میری خطا تو بتاؤ۔" میں نے بڑی نرمی سے کہا۔ "کیا دوست کہنے کے بعد تم مجھے بربادی اور رسوائی کے راستے پر ڈال دوگے۔"

"کون کس کا دوست ہے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ مورکھ۔ میرا سمے مت برباد کر۔ مجھے بتاؤ کہ اتنے دنوں تم کیا کرتے رہے ہو؟" اس کی آواز لحہ بہ لحہ مشتعل ہوتی جا رہی تھی۔ "اگر تم نے کچھ غلط کہا تو مجھے مجبوراً تمہیں راہ راست پر لانا پڑے گا۔"

"حیرت ہے بھئی۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "یعنی یہ کہ تم عجیب آدمی ہو۔ اپنے دوست پر شک کرتے ہو۔ میں بدنصیب کیا کر سکتا ہوں۔ کہا کہ گھوم پھر کر واپس آیا ہوں۔ تم مانتے نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی جلدی آنکھیں بدل لوگے۔ حیرت ہے افسوس ہے تربینی۔" میں نے اصل موضوع سے ہٹنے کی کوشش کی۔ "اگر میں شیوچرن کو مارنے میں اپنی جان کی بازی نہ لگاتا تو تم آج مجھے انکا کی قوت کی دھونس نہیں دے سکتے تھے۔ تم بدعہدی کر رہے ہو۔"

"ٹھنٹے۔" تربینی غضبناک آواز میں چلایا۔ "تو مجھے الّو بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتنا یاد رکھو کہ اگر میں نے کشٹ دینے کا ارادہ کیا تو دھرتی کی کوئی شکتی تجھے نہیں بچا سکتی۔"

"مجھے علم ہے کہ تم میری طرف سے بدگمان ہو گئے ہو۔" میں نے اس بار سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بدگمانی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں میری طویل غیر حاضری نے تمہیں خواہ مخواہ شبہات میں مبتلا کر دیا ہے۔ تم انکا سے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ میں نے ان دنوں کیا کیا ہے۔"

"کمینے۔ میں تجھ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تو بتا کہ تو کہاں تھا؟"

"میں نے تو بتا دیا اب تم انکا سے پوچھ لو۔" میں نے اُلجھ کر کہا۔

"کیا میری زبان سے کہلوانا چاہتا ہے۔ کم بخت بھول رہا ہے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ کیا تو اپنی پتنی سے ملنے نہیں گیا تھا وہ پتنی جو تجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اس کے باپ نے تجھے مارا پیٹا۔ تو اپنے دوست رام دیال کے ہاں رہا۔ تو نے نرگس کو حاصل کرنے کے لئے پجاریوں کی تلاش کی۔ پھر تو ایک پجاری سے ملا اور وہاں تو نے انکا کے سلسلے میں بات کی اور بتاؤں، اور سننا چاہتا ہے۔ مجھے ایک ایک پل کی خبر ہے۔"

تربینی نے نرگس کے شہر میں پیش آنے والا پورا واقعہ اس طرح سُنایا جیسے وہ میرے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ جیسے یہ سب کچھ اس پر گزرا تھا۔ اس نے رام دیال اور پجاریوں سے ملنے تک کی ایک ایک بات پوری تفصیل سے مجھے بتائی۔ میں اسے سن کر سہم گیا اور میرے قدم لرزنے لگے۔ تربینی کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی گردن نیچی کر لی جیسے میں اس کا مُجرم ہوں۔ خوف سے اس وقت میرا بُرا حال تھا۔ مجھے اپنی موت سامنے نظر آئی۔

"کیا مجھے نہیں معلوم۔ ٹھنٹے۔ کمینے۔ تو سمجھتا ہے میں بے خبر تھا۔ اب اس سے آگے تو بتا دے۔" تربینی نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

"اب میں کیا بتاؤں۔" میں نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

"نہیں آگے تو بتا۔ میں اس کے بعد کے حالات تیرے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" تربینی نے بدتمیزی سے کہا۔

"کیوں بات کو بڑھاتے ہو۔ جب تمہیں سب معلوم ہے تو یہ تماشا کیوں کرتے ہو۔" میں نے اس بار چڑ کر کہا۔

"میری بات سُن کم ظرف۔ پنڈت بدری نرائن تک میں نے تجھے بتا دیا۔ اس کے بعد کے حالات میں تیرے منہ سے سننا پسند کروں گا۔" تربینی نے زمین پر پیر مارتے ہوئے کہا۔

معًا اسی وقت میرے ذہن میں آیا کہ "تربینی کو شاید اس کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہیں۔ اس لئے وہ مجھ سے چالاکی سے اگلوا رہا ہے۔ مجھے پنڈت بدری نرائن کا وعدہ یاد آ گیا۔ اس نے انکا سے میری تمام جدوجہد کی پردہ پوشی رکھنے کو کہا تھا۔ میں لمحوں میں سمجھ گیا کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ تربینی کے سامنے وہ مدت نہیں جس میں پنڈت نے میرے اصرار پر پردہ پوشی کا کوئی منتر پڑھا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے اندر توانائی سمٹ آئی۔ یقیناً تربینی کو بعد کے حالات کا علم نہیں۔ اس لئے وہ کرید کرید کر پوچھ رہا ہے اور اس سلسلے میں متوحش ہے۔" اس خیال سے مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

میں نے اسے ٹالنا چاہا۔ اس نے بدستور مجھے دھمکیاں دیں۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔ نہ میں کچھ بتا سکا۔ نہ وہ مجھ سے کچھ اگلوا سکا۔ میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ تربینی کو اصل حالات سے آگاہ کر دیتا۔ میں نے ہر چند

کوشش کی کہ اسے ٹال سکوں لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔ تربینی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ میں بہرحال انسان تھا۔ پھر مسلسل ناکامیوں اور مایوسیوں نے مجھے چڑچڑا بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ جب تربینی نے مجھے نفرت اور حقارت سے دھتکارتے ہوئے بھرپور ہاتھ میرے گال پر مارا تو میں برداشت نہ کر سکا۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل چاہا کہ تربینی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی نیند سلا دوں لیکن اوّل تو میں اس ہٹے کٹے آدمی سے لڑ نہیں سکتا تھا دوسرے مجھے انکا کی پُراسرار قوتوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ تربینی کا ایک اشارہ انکا کو مجھے موت کے گھاٹ اتارنے پر اُکسا سکتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس وقت تک تربینی نے انکا سے باز پرس کیوں نہ کی۔ بغرضیکہ جب تربینی نے میرے گال پر تھپڑ مارا تو میں بھی تلملا گیا۔ جواب میں مَیں نے پلٹ کر اس پر حملہ کر دیا لیکن میرا مقصد اسے زدوکوب کرنے کے بجائے صرف اتنا تھا کہ میں اسے کچھ دیر غافل کر کے وہاں سے راہ فرار اختیار کر سکوں۔ تربینی کو جوابی حملہ کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکرایا۔ پھر کرسی سمیت فرش پر الٹ گیا۔ مجھے بس اتنی مہلت درکار تھی۔ تربینی کو نیچے گرتے دیکھ کر میں تیزی سے پلٹا اور بھاگتا ہوا اس کی عمارت سے باہر آ گیا۔ بیرونی پھاٹک پر کھڑے ہوئے ملازم نے مجھ سے اس طرح بھاگنے کی وجہ دریافت کرنا چاہی لیکن میں اس کی کہی ان سنی کر کے بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارے سے روکا۔ اور جلدی سے اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو میں نے ایک ایسے ہوٹل کا نام بتایا جو پونا کے ساحلی علاقے میں واقع تھا۔ ٹیکسی فوراً حرکت میں آ گئی۔ میں نے نظر گھما کر تربینی کے بنگلے کی سمت دیکھا تو لرز گیا۔ تربینی مجھے بڑی غضبناک اور شعلہ فشاں حالت میں احاطے کی روش پر کھڑا ہوا نظر آیا تھا۔

راستے بھر میری حالت خراب رہی۔ موت میرا پیچھا کر رہی تھی مجھے ہر لمحے یہ خطرہ لاحق تھا کہ اب انکا کی پُراسرار قوت میرے سر پر نازل ہو گی اور مجھے کسی حقیر کیچوے کے مانند کچل کر رکھ دے گی۔ اب تمام اُمیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ٹیکسی چل رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عمارتیں متحرک ہو گئی ہوں اور اب وہ ایک پل میں ٹیکسی پر گرنے والی ہوں۔ اس وقت مجھے نرگس کی یاد آئی۔ یہ بھیانک خیال بھی تھا کہ اب میں دوبارہ اس کی صورت نہ دیکھ سکوں گا مجھے اپنی حماقت پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ میں نے تربینی سے اُلجھ کر دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں بڑے سے بڑے حادثے کا منتظر تھا۔ اور اس سے فرار بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے اپنے لئے ایک کمرہ بک کرا لیا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں وہاں بھی محفوظ نہیں رہ سکوں گا۔ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں پہنچ جاؤں انکا مجھے ڈھونڈ نکالے گی۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک سرد آہ بھری۔ دروازوں کو اچھی طرح بند کیا۔ میری حماقت دیکھئے انکا کے لئے بند دروازے اور کھڑکیاں کیا اہمیت رکھتے تھے بستر پر لیٹتے ہی میں بگڑے ہوئے حالات پر غور کرنے لگا۔ باہر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو میں انکا کے خوفناک تصور سے کانپ کانپ جاتا۔

وقت جیسے جیسے گزرتا گیا میری پریشانیاں بڑھتی گئیں۔

دن بھر میں عجیب تذبذب میں مبتلا رہا۔ میرے اندر اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ میں کھانے کے لئے کمرے سے باہر نکل سکتا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ آخر اب تک تربینی کی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی کیوں نہ کی گئی۔ کیا تربینی نے محض مجھے دور رکھنے کی خاطر ڈرایا دھمکایا تھا۔ کیا وہ مجھ سے اپنا تعلق ختم کر دینا چاہتا تھا؟ لیکن ایک بات طے تھی کہ انکا پنڈت بدری نرائن کے کہنے کے مطابق میرے حالات سے ناواقف ہی رہی تھی۔ دوسری صورت میں اتنی آسانی سے نہ تو میں برکاتی شاہ تک پہنچ سکتا تھا اور نہ وظیفہ مکمل کر سکتا تھا۔ مگر یہ وظیفہ کیسا تھا جس میں مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں نے کیا حاصل کیا اور کیا نقصان اٹھایا۔ اس وظیفے کے اچھے اثرات مرتب ہوئے یا بُرے۔ اس کشمکش نے مجھے ہلکان کر دیا تھا۔

دن بھر مَیں خود سے اُلجھا رہا۔ آپ یقین کریں گے میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ اُٹھ کر بتی جلا سکتا۔ اسی شش و پنج کی حالت میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں بھی انہی اُلجھنوں میں گھرا رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں گھُپ اندھیرے کا راج تھا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اور جلدی سے کمرے میں روشنی کر دی۔ ابھی میں جاگنے کے سبب پر غور ہی کر رہا تھا کہ اچانک میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو

گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سر بھاری ہو رہا ہے۔ میں نے سہمتے ہوئے عالم تصور میں اپنے سر پر نظر ڈالی تو خوف و دہشت سے میری چیخ نکل گئی۔ انکا وہاں موجود تھی۔ اس لمحے مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ موت کے تصور سے میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ دیر تک میری یہی کیفیت رہی۔ اس عرصے میں انکا نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ مسکراتی رہی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ سے شدید نفرت اور خوف محسوس ہوا۔ بہر حال میں نے کسی نہ کسی طرح اپنے حواس مجتمع کئے اور دوبارہ مسکراتی ہوئی انکا پر نظر ڈالی جو میرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی مجھے تیکھی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

"تت۔ تم۔ تم انکا" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہاں میں" انکا نے شرارت سے کہا "کیا میں تمہیں تلاش نہیں کر سکتی تھی"

"میں تمہارا منتظر تھا" میں رندھی ہوئی آواز میں بولا اور انکا کو گھورنے لگا۔

"اتنی حیرت سے کیوں گھور رہے ہو" کیا مجھے پہلے نہیں دیکھا؟"
انکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"تمہارے بہت سے روپ دیکھے ہیں لیکن آج مجھے تم سب سے زیادہ خطرناک نظر آ رہی ہو" میں نے ہمت کر کے کہا۔

"کیوں کیا میں بری نظر آ رہی ہوں" انکا نے اٹھلا کر کہا۔

"نہیں تم تو سدا بہار ہو۔ تم اتنی ہی حسین ہو جتنی پہلے تھیں" میں نے خوشامدی انداز میں کہا۔

"جھوٹ کہتے ہو" انکا نے خالص نسوانی انداز میں کہا "خوشامد کرتے ہو"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے تمہاری خوشامد سے مجھے کیا حاصل ہو جائے گا" میں نے اداس لہجے میں کہا۔
انکا کا لہجہ پہلے سے بدلا ہوا تھا۔ مجھے اس کی یہ طنزیہ گفتگو زہر میں بجھے ہوئے کسی نشتر سے کم نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تنگ آ کر کہا۔

"کام کی بات کرو۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں اب زیادہ برداشت کی قوت نہیں رہی جو کرنا ہے کرو" —

"کیا کروں۔ تم ہی بتا دو کہ میں تمہاری قسمت کا کیا فیصلہ کروں" انکا نے اپنی روایتی شوخی سے کہا۔

"جو تمہیں تربینی نے بتایا ہو۔ تمہارے آقا نے" میں اب ہر فیصلہ سننے کو تیار تھا۔

"تربینی نے تو بہت کچھ کہا ہے" انکا سنجیدگی سے بولی۔

"تو جو کچھ کہا ہے اسے کرو" میں نے بگڑ کر کہا۔

"جی نہیں چاہتا"

"تمہارے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم تو تربینی کی غلام ہو"

"ہاں یہ تو ہے۔ پر مجھے تم سے بھی تو محبت ہے" انکا نے

اٹھلاکر کہا۔

"اب زیادہ گھاؤ نہ لگاؤ۔ جواب تک ہو چکا ہے وہی بہت ہے۔"

"تمہیں وہ دن یاد ہیں؟"

"کون سے دن؟"

"وہی جب میں تمہارے سر پر تھی۔ تم مجھ سے روٹھ جاتے تھے اور میں تمہیں مناتی تھی۔"

"وہ باتیں اب خواب بن چکی ہیں انکا۔" میں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تو انکا مسکرا دی۔

"ماضی ہمیشہ خواب ہوتا ہے' ہاں اسے بھول جانا چاہیئے۔۔۔ مستقبل پر نظر رکھنی چاہیئے۔"

"لیکن جس کا مستقبل روٹھ گیا ہو وہ غریب کیا کرے۔ مجھ سے میرے دن روٹھ گئے۔"

"مشکل باتیں کر رہے ہو۔ کہاں سے آگیا اتنا غم۔ تمہاری باتوں میں۔"

"حالات انسانوں کے لہجے متعین کرتے ہیں مگر تم آج اسقدر لگاوٹ کی باتیں کیوں کر رہی ہو۔" میں نے انکا کے انداز میں بہت بڑی تبدیلی محسوس کی تو پوچھا۔

"حالات حالات کی بات ہے۔" انکا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ پھر بولی۔"کیا تمہیں میرا بولنا ناگوار ہو رہا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے کہ اس شیریں گفتگو کے بعد تم مجھ سے کس طرح پیش آؤ گی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا کام کرو۔ مجھے حکم دو کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ تم مجھے حکم دو۔"

"میرے اندر مذاق سہنے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی ہے۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"اچھا۔ اتنے دُکھی ہو۔"

جواب میں میں خاموش رہا۔ مجھے انکا کی طول کلامی سے گھٹن ہو رہی تھی۔ انکا دیر تک یونہی دلچسپ انداز میں گفتگو کرتی رہی۔ اس کے تیور عجیب تھے۔ وہ مسکرا مسکرا کر، اٹھلا اٹھلا کر بڑی اپنائیت کی باتیں کرتی اور کبھی اس کے چہرے پر نفرت اور حقارت کے ملے جلے جذبوں کا شدید کھنچاؤ پیدا ہو جاتا۔ اس کی حسین آنکھیں اچانک شعلہ بار ہو جاتیں۔

"جانتے ہو جمیل۔ میں اس وقت تمہارے پاس کیوں آئی ہوں؟" کچھ دیر بعد وہ بولی۔

"ہاں"۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔"تمہیں تربینی داس نے بھیجا ہے۔" میں نے بچّوں کی طرح کہا۔

"خاصے سمجھدار ہوتے جا رہے ہو۔" انکا نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ پھر اُٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔"اور جانتے ہو تربینی داس مہاراج نے تمہارے حق میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"انکا۔" میرا دل بھر آیا۔ میں نے اس کی منّت کرتے ہوئے کہا۔"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم تربینی داس کے اشارے پر سنگلاخ پہاڑوں کو بھی روئی کے گالوں کی طرح اُڑا دینے کی طاقت رکھتی ہو لیکن انکا۔۔۔" میں کہتے کہتے رُک گیا تو انکا بولی۔۔۔

"مرنے سے پہلے نرگس سے ایک بار ملنا چاہتے ہو۔ کیا نرگس یاد ہے تمہیں اب تک؟"

انکا نے میرے منہ کی بات چھین لی تھی۔ میں نے کہا۔"میں تو تمہیں بھی نہیں بھولا۔ تم تو دِلوں کا حال پڑھنا جانتی ہو۔ تم نے میرے دل کو پڑھ لیا ہوگا۔"

"رہنے دو جمیل۔ بس کرو۔"

"میرے اوپر شک نہ کرو۔"

اچھا۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں۔۔۔؟" میں نے خوفزدگی سے کہا۔

"تربینی داس نے مجھے تمہیں بلانے کے لئے بھیجا ہے۔ چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ وہ ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔" انکا نے اچانک بڑی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔

"ہمارے درمیان کبھی دوستانہ مراسم بھی رہ چکے ہیں۔ تمہیں میری محبوبہ کا درجہ حاصل ہے۔ میں تمہیں اس ربط خاص کا واسطہ دیتا ہوں کہ نرگس کو ایک آخری بار۔۔۔۔"

"وقت ضائع مت کرو جمیل۔" انکا نے کسی الھڑ دوشیزہ کی
طرح کہا۔ "سنو میں ہمیشہ اپنے مالک سے وفادار رہنے پر مجبور ہوں
اپنے آقا کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ اب تم چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ"
"چلو۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "جو تمہاری مرضی۔"
راستے بھر میں انکا کے چہرے پر ابھرنے والے متضاد تاثرات
بھانپتا رہا۔ بلاشبہ اس کے رویّے میں غیر معمولی فرق تھا۔ اس سے قبل
میں نے اسے ایسی مختلف کیفیتوں سے دوچار نہیں دیکھا تھا۔ مجھے تریبنی
سے کسی خوشگوار سلوک کی توقع نہ تھی اور میں نے خود کو اس بات پر آمادہ
کر لیا تھا کہ میں اب مقتل کی طرف جا رہا ہوں۔ مقتل کی طرف جاتے
ہوئے کسی شخص کی جو حالت ہو سکتی ہے وہی میری تھی۔
"کس خیال میں الجھے ہوئے ہو جمیل!" انکا کی آواز اچانک میرے
کانوں سے ٹکرائی تو میرے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ میں نے انکا
پر نظر ڈالی جو میرے سر پر کھڑی بڑی دلنواز نظروں سے مجھے دیکھ رہی
تھی۔ اس وقت مجھے انکا کا یہ انداز بہت ظالمانہ محسوس ہوا۔ میں نے
سختی سے ہونٹ بھینچ لئے اور انکا کی طرف نگاہیں پھیر لیں۔
"ارے جمیل صاحب اتنی نفرت۔ کچھ تو میری پرانی مہربانیوں
کا خیال کیا ہوتا۔ سچ ہے مرد بڑے بے مروّت ہوتے ہیں۔"
"انکا۔ خدا کے لئے میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ میں
بڑا مجبور اور بے بس ہوں۔"
"جب تک زندہ ہو ہنستے بولتے رہو۔ موت سے کیا ڈرنا
تریبنی کو دیکھو اس کے سینے میں تمہارے خلاف انتقام کا جوالا مکھی دہک رہا
ہے۔ لیکن جانتے ہو وہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔ بمبئی کی ایک حسین
ترین ساحرہ اس کی خواب گاہ میں موجود ہے۔ وہ اس وقت بمبئی کی
سب سے حسین لڑکی کے ساتھ عیش کر رہا ہے۔ عیش۔ بالکل اسی
طرح جس طرح تم رنگ رلیاں منایا کرتے تھے۔ کیوں یاد ہیں نا تمہیں
وہ باتیں۔"
انکا کی طنز بھری باتوں کا سوائے خاموشی کے میرے پاس
کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس وقت عجیب حرکتیں کر رہی تھی۔ تمام
راستے وہ مجھے ستاتی رہی۔ مجھ پر طنز کے نشتر چلاتی رہی۔ میں نے خاموشی
ہی مناسب سمجھی۔ جو کچھ وہ کہتی جا رہی تھی میں سنتا جا رہا تھا۔ اس

آزادی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بے لگام ہو جائیں اور اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ آپ جو رویہ چاہیں اختیار کرلیں اور جو بھی جی میں آئے کر گزریں یہ پروا نہ کرتے ہوئے کہ مملکت کے دوسرے لوگوں کے مفادات کیا ہیں۔ آپ پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہے۔ اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم ایک متحد اور منضبط قوم کی طرح کام کریں۔ اب ہمیں تعمیری جذبہ درکار ہے۔ وہ جنگی جذبہ جب ہم آزادی کیلئے جنگ کر رہے تھے، اب اس کی نہیں، تعمیری جذبے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء

نے مجھے کملا نامی لڑکی کو یاد دلایا جسے بمبئی میں میں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ کملا کے شباب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نشہ بھر گیا۔ پھر اچانک اس کا تیور بدل گیا۔ میری خاموشی سے وہ بگڑ گئی۔ کہنے لگی "ہاں تم نے یہ نہیں پوچھا کہ تربینی نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

میں نے اس پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"تربینی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تمہیں اس حسین ساحرہ کے سامنے ذلیل کرے گا۔ ہوسکتا ہے وہ تمہیں زندہ آگ میں بھی جلا دے اور اس لڑکی کو اپنی غیر معمولی قوت سے متاثر کرے۔"

"میں جانتا ہوں تربینی کو پراسرار قوتوں کا سہارا حاصل ہے۔" میں نے زہر خند سے جواب دیا۔

"اور میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اس کی تابع ہوں۔ اپنے آقا کا حکم ماننا میرا فرض ہے۔" انکالنے روکھے لہجے میں کہا۔ اور پھر اس کے بعد خاموش ہوگئی۔ اس لئے کہ تربینی کا بنگلا آگیا تھا۔

انکالنے غلط نہیں کہا تھا۔ تربینی اپنے کمرۂ خاص میں اس وقت ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ مصروف عیش تھا۔ میری نظروں سے اتنی حسین صورت شاذونادر ہی گزری تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ نیم عریاں لباس میں اس کا کندن کے مانند دمکتا ہوا جسم جھلک رہا تھا۔ شراب کے نشے نے اس کی آنکھوں کو کچھ زیادہ ہی نشیلا بنا دیا تھا۔ تربینی کی گردن میں بانہیں ڈالے اور شرمیلی نظریں جھکائے وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ غالباً تربینی نے اسے میرے سلسلے میں کچھ بتا دیا تھا۔

"کیوں جمیل۔ کیسی ہے یہ لڑکی! شرمیلی، نازک، گداز، سرخ ہے نا حسین لڑکی۔" انکالنے میرے کانوں میں سرگوشی کی لیکن مجھے یہ سب سوچنے کی فرصت کہاں تھی۔ میرے اوپر تو خوف مسلط تھا۔ میں تربینی کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"آ گئے۔" اس نے ہاتھ میں گلاس کی باقی ماندہ شراب انڈیلتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "ڈفنٹے کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میں تجھے سمندر کی تہوں سے بھی ڈھونڈھ نکالنے کی شکتی رکھتا ہوں۔"

میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ انکا بدستور میرے سر پر براجمان تھی۔

"کچھ بولو جمیل احمد خان چپ کیوں ہو۔" تربینی نے میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن میں بدستور مہر بلب رہا۔ خاموشی کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا۔

"ڈارلنگ کیا یہی وہ مورکھ ہے جس نے تم سے ٹکرانے کی حماقت کی تھی۔" تربینی کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے پہلی بار کہا۔ اس کی آواز بھی اس کے خوبصورت جسم کی طرح لوچدار تھی۔

"ہاں کوشیلی، یہی وہ سورما ہے جو اپنی اوقات بھول گیا ہے۔" تربینی نے مجھے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے اور پھر اسے اور قریب کرتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تم اس کے لئے کیا سزا تجویز کروگی۔ میرے اپمان کی کیا سزا ہوسکتی ہے، کوشیلی؟"

"تمہارے اپمان کی سزا" کوشیلی شرماتے ہوئے بولی۔ "اس کی کم سے کم سزا موت ہی ہوسکتی ہے۔"

"تم حسین ہونے کے ساتھ ذہین بھی بہت ہو۔۔۔ اٹھاؤ اپنا پستول اور مار دو اسے گولی۔" تربینی نے بہکتے ہوئے کہا۔

"مم۔۔۔ میں۔" کوشیلی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم۔ مار دو اس حرامزادے کو۔" تربینی غصے سے بولا

"تمہارے کارن تو میں خود کو بھی شوٹ کرسکتی ہوں۔" کوشیلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے دستی بیگ سے اپنا بیریٹا آٹومیٹک نکالا اور لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ ڈھیلے ڈھالے باریک لباس نے بے ترتیب ہو کر اسے اور عریاں کر دیا تھا۔ لیکن میں اس کے

جسمانی نشوونما سے زیادہ اپنے انجام پر غور کر رہا تھا۔ میرے قریب آکر کوشلیا نے نفرت بھری نظروں سے مجھے سر تا پا دیکھا۔ پھر بھنویں چڑھا کر بولی "کوئی آخری اِچھا ہے تمہاری؟"

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ انکا میرے سر سے رینگ کر میرے بائیں کاندھے پر آگئی۔ اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی "جمیل۔ ہمت کرو۔ دیکھو کتنی حسین لڑکی سامنے ہے۔ اس کے ہاتھوں مرنا بھی کتنا اچھا ہے۔ میری مانو تو مرنے سے پہلے کوشلیا سے اس کا شریر مانگ لو۔ اس کے بعد کوشلیا کے ہاتھوں مرتے میں تمہیں زیادہ لطف آئے گا۔"

کوشلیا نے مجھے خاموش پایا تو بڑی نخوت سے بولی "بولتا کیوں نہیں، ارے میں کیا پوچھتی ہوں کمینے۔ بتا تیری آخری اِچھا کیا ہے؟"

میں نے کوشلیا کی انگلیوں کی گرفت پستول پر مضبوطی سے جمتے دیکھی تو میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اب اس کی ٹریگر پر رکھی ہوئی ایک انگلی کی حرکت کی دیر تھی جو میری شمع حیات گُل کر دیتی۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں۔ میں نے کسمپرسی سے پہلو بدلا تو انکا نے تیزی سے کہا۔ "ارے تم تو بہت خوفزدہ ہو گئے۔ تمہارا جھگڑا تربینی سے ہے، تم اس نازک لڑکی سے کیوں ڈر رہے ہو۔ یہ تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔"

انکا کا آخری جملہ سُن کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ جس انداز اور لہجے میں اس نے وہ جملہ کہا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوشلیا کے مقابلے میں میری مدد کرے گی۔ میں نے عالم تصور میں اس کے چہرے کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ مجھے انکا کی حسین آنکھوں میں اپنے لئے ہمدردی کا وہی جذبہ نظر آیا جو میں بارہا اس وقت دیکھ چکا تھا جب وہ میرے سر پر سوار تھی۔ پھر بھی مجھے یقین نہیں آیا۔ تربینی کی موجودگی میں انکا کا میرے ساتھ یوں ہمدردی سے پیش آنا تعجب خیز ہی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انکا بھی تربینی اور کوشلیا کی طرح میری بے بسی کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ وہ موت کے اس ڈرامے سے لطف لے رہی ہو میں یہ سوچ رہا تھا کہ انکا کی آواز دوبارہ میرے کانوں میں گونجی۔

"یہ مذاق نہیں جمیل۔ تم قطعاً نہ گھبراؤ جب تک میں تمہارے سر پر موجود ہوں، کوشلیا تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ آگے بڑھو اور

> جب میں پاکستان کے کسی طبقے پر صوبائیت کا غلبہ پاتا ہوں تو مجھے قدرتی طور پر دکھ ہوتا ہے۔ پاکستان کو ہر بُرائی سے آزاد ہونا چاہیئے یہ تو پُرانے دَورِ حکومت کی یادگار ہے۔ جب آپ محکوم، انگریزوں کے تحکم سے بچنے کے لئے صوبائی خود اختیاری اور مقامی آزادیٔ عمل پر جان دیتے تھے مگر اب جبکہ مرکزی حکومت اور اقتدار تمام تر آپ کا اپنا ہے۔ اس انداز سے سوچتے رہنا محض حماقت ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ آپ کی مملکت نئی نئی وجود میں آئی ہے اور شدید ترین اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ہے۔ اس نازک موقع پر صوبائی، مقامی یا ذاتی مفاد کو مملکت کے کسی اہم مفاد پر غالب آنے دینا خودکشی کے مترادف ہے۔
>
> قائداعظم۔ کوئٹہ ۵ مارچ ۱۹۴۸ء

اس خوبصورت لڑکی سے دو باتیں ضرور کر لو۔"

"کیا تم جو کچھ کہہ رہی ہو سچ ہے"۔ میں نے دل ہی دل میں انکا سے کہا۔

"ہاں۔ میرے اوپر اعتماد کرو۔" انکا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

انکا کے جملوں نے جیسے میرے جسم میں برقی لہر دوڑا دی۔ یک لخت مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر بے پناہ طاقت آگئی ہو۔ کچھ دیر قبل میں جس بے چارگی اور بے بسی کا شکار تھا وہ اچانک جاتی رہی۔ میں نے کوشلیا کے خوبصورت چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔

"کیا تم میری آخری خواہش پوری کرنے کا وعدہ کرتی ہو؟"

"بول! کیا چاہتا ہے؟" کوشلیا نے شہزادیوں کی طرح کہا تو میں بڑی بے باکی سے بولا۔

"اگر تم اپنی بات کی پکی ہو تو میری یہ آخری خواہش پوری کر دو میں چاہتا ہوں تم میری موجودگی میں تربینی کے منہ پر تھوک دو۔"

"منڈے۔ حرامی" تربینی شعلے کے مانند میری طرف لپکا۔ "میں تجھے بتاؤں گا کمینے۔ میں تیرے منہ پر پیشاب کرواتا ہوں۔"

کوشلیا کو بھی میرے اچانک بدلتے ہوئے طرزِ عمل پر حیرت ہوئی تھی۔ پھر جب تربینی داس کسی زخمی درندے کی طرح جھپٹ کر آگے بڑھا تو کوشلیا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ایک ثانیے کے

لئے میں بھی خوفزدہ ہو گیا مگر اسی وقت انکا نے مجھے اپنی سمت متوجہ کر کے کسی قدر جوشیلے انداز میں کہا "جمیل ۔ اس ڈرامے کو اور خوبصورت بناؤ۔ تمہیں نہیں معلوم تم نے برکاتی شاہ کے بتلائے ہوئے وظیفے پر عمل کر کے کیسی طاقت حاصل کر لی ہے۔ سنو تربینی کے مرتے ہی میں تمہاری ہو چکی ہوں صرف اس بات کی دیر تھی کہ کب تربینی مجھے خود سے جدا کرے اور میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ اب میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ مذاق نہیں، یقین کرو میرے جمیل۔ میں اب تمہاری ہوں۔ صرف تمہاری، تمہارے لئے۔"

انکا کی باتوں نے مجھے نئی زندگی کا پیغام دیا اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میری آنکھوں میں مسرت کے ہزاروں دیپ روشن ہو گئے۔ میں نے ایک بار انکا کو بڑی اپنائیت سے دیکھا۔ مجھے اس وقت وہ بہت بھولی بھالی معصوم اور دلکش نظر آئی۔ وہ مجھے اس وقت اپنے تمام خوابوں کی حسین تعبیر نظر آ رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے سر سے اتار کر اپنے دل میں رکھ لوں۔ ابھی میں انکا کی غزالی آنکھوں میں جھانک رہا تھا کہ تربینی کی کرخت آواز کمرے میں گونجی۔ وہ کوشلیا سے مخاطب تھا۔

"کوشلی۔ لاؤ یہ پستول مجھے دو۔ اس حرامزادے کو میں بھی تڑپا تڑپا کر مار دوں گا۔ تم دیکھو ابھی کیسا تماشا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس کھیل میں بہت لطف آئے گا۔"

کوشلیا اب بری طرح سہم چکی تھی۔ اس نے پستول تربینی کو تھما دیا۔ میں اب قطعاً خوفزدہ نہیں تھا۔ میرے جی میں اس صورتحال سے لطف لینے کا خیال آیا۔ میں نے تربینی کو جو انکا کے پُراسرار وجود کے میرے سر پر منتقل ہو جانے کی حقیقت سے ناواقف تھا، سنجیدگی سے دیکھا اور بھاری بھرکم لہجے میں کہا "تربینی داس۔ تم نے مجھے مِتر کہا تھا لیکن افسوس تم اپنا وچن بھول گئے، کیا تمہارے دھرم نے یہی سکھایا ہے کہ دوست بنا کر پیچھے سے اس کی کمر میں چھرا گھونپ دو۔"

"دھرم کے بچے" تربینی غراتے ہوئے بولا "میں تجھے ابھی کیڑے کی طرح مسل دوں گا۔"

"تم کچھ زیادہ بڑھ رہے ہو تربینی داس" میں نے بہت نرمی سے کہا "میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم مجھ سے معافی مانگ لو۔ میں تمہیں شما بھی کر سکتا ہوں۔"

"تو اور مجھے شما کرے گا" تربینی حیرت سے فلک شگاف قہقہے لگانے لگا۔ اسے میری صحیح الدماغی پر غالباً شبہ ہو رہا تھا۔ چند ثانیے تک وہ جھوم جھوم کر قہقہے لگاتا رہا پھر یکلخت اس پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ اس نے پستول کا رُخ میری جانب کر کے لبلبی دبا دی۔ اسی وقت انکا نے مجھے مشورے دینے شروع کر دیئے کہ میں کس سمت ہٹ جاؤں۔ پہلا وار خالی گیا۔ میں وہیں کھڑے کھڑے پہلو بچا گیا۔ میں تربینی کی بوکھلاہٹ پر مسکرایا تو اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے اس نے پستول کی باقی ماندہ گولیاں بھی میرے اوپر داغ دیں۔ انکا لمحوں میں مجھے نشانے سے بچا دیتی تھی۔ میری حالت تربینی کی گولیوں کے درمیان کسی ناچنے والی کی سی رہی۔ تربینی کا ہر نشانہ خطا گیا۔ وہ میرا بال بیکا بھی نہ کر سکا۔ پھر اچانک میں نے تربینی کو یوں چونکتے ہوئے دیکھا جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے براہ راست میرے سر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "انکا میری آ گیا ہے کہ تو اس حرامزادے شنٹے کو بے بس کر کے میرے چرنوں میں ڈال دے آج میں تیرے لئے اسی مشنڈے کا خون فراہم کروں گا۔"

"خوب۔" میں نے آنکھیں نچا کر کہا۔ مجھے تربینی کے چہرے پر وحشت کے آثار دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انکا بول پڑی۔

"جمیل اب تم یہاں سے خاموشی سے چلے جاؤ۔ کوشلیا کو دیکھ کر میرا برا حال ہو رہا ہے۔" انکا نے اپنے گلابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "کوشلیا کے جسم کو دیکھو۔ کیسا انار کی طرح سُرخ ہو رہا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ انکا کا مقصد کیا ہے۔ وہ کوشلیا پر ریجھ گئی تھی اور اس کا خون پینے کی خواہشمند تھی۔ مجھے بھلا کیا انکار ہو سکتا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے میں تربینی کو کوئی سبق دینا چاہتا تھا۔ مجھے ان مظالم کا حساب چکانا تھا جو تربینی نے میرے اوپر توڑے تھے۔ مگر انکا سے کچھ کہنے سے پیشتر ہی تربینی نے پھر انکا کو آواز دی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کے سر کے بال بکھر گئے تھے اور وہ دہشت زدہ نظر آتا تھا۔ کوشلیا سہمی دور کھڑی تھی اور اس نے ایک کوٹ سے اپنے جسم کو چھپانا شروع کر دیا تھا۔

"جمیل! مجھے اجازت دو کہ میں کوشلیا کے تازہ خون سے اپنے وجود کو سیراب کروں۔" انکا نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ کل صبح تک دوبارہ تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ تربینی سے اپنا حساب تم بعد میں چکا

لینا۔ جمیل میری بات غور سے سنو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

انکا نے کچھ ایسے ملتجیانہ انداز میں یہ درخواست کی تھی کہ میں اسے رد نہ کر سکا۔ مگر جانے سے پہلے میں نے اس سے دل ہی دل میں کہا، "ترببنی کو ایسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور یہ کوشلیا جو لباس پہن رہی ہے۔ اس سے کچھ نمٹنے کو دل کہتا ہے۔"

"دل جو کچھ کہتا ہے وہ اب خوب پورا کر لینا۔ کوشلیا جیسی ہزار لڑکیاں تمہیں ملیں گی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں ترببنی سے کوشلیا کو ختم کراؤں گی اور ترببنی کو ننگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے گا۔ تمہارے انتقام کا یہ طریقہ کیسا رہے گا۔" انکا نے کسی سمجھدار بوڑھی عورت کی طرح کہا۔

"تم بہت ذہین ہو۔ مگر مجھے اجازت دو کہ میں دو دو ہاتھ ترببنی سے ضرور کر لوں ورنہ مجھے رات کو نیند نہیں آئے گی۔" انکا سے یہ بات میں نے زبانی نہیں کہی۔ اس لئے کہ زبانی کہتا تو ترببنی کو پتا چل جاتا۔ میں دل میں اس بات کا تصور کرتا اور مجھے معلوم تھا کہ انکا دل کا احوال پڑھنے کی طاقت رکھتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ مگر جلدی کرو۔ تاکہ۔ کوشلیا کی یہاں موجودگی۔ ترببنی کا نشے میں ہونا اور پھر ایک قتل۔ یہ موقع نکل جائے گا۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔" انکا نے مجھے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔" میں انکا سے کہہ کر بہت آہستگی سے ترببنی کی طرف بڑھا جو مجھے بڑی طرح گالیاں بک رہا تھا۔ مجھے قریب آتا دیکھ کر اس کی گالیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ دوسری طرف مجھے کوشلیا دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے ترببنی کی طرف بڑھنے کے بجائے لپک کر اسے پکڑا۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ میں نے پوری طاقت سے ایک زور دار طمانچہ اس کے رخسار پر رسید کیا۔ میرے اوپر دیوانگی طاری ہو گئی تھی میں نے اس کا لباس کھینچا تو وہ فرش پر لڑھک گئی۔ اس عرصے میں ترببنی میرے اوپر کود چکا تھا۔ اس نے میری پیٹھ پر گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔ ادھر کوشلیا نے موقع غنیمت دیکھ کر اپنے شکستہ لباس کی پروا کئے بغیر میری ٹانگ میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ تکلیف کی شدت سے میں بلبلا اٹھا۔ عین اس لمحے انکا میرے سر سے اتر گئی۔ اور میں نے ترببنی کو چیختے ہوئے فرش پر لوٹتے دیکھا۔ انکا ترببنی کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ ترببنی کو اس عالم میں دیکھ کر میں پھر کوشلیا کی طرف بڑھا اور نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے جنون میں اس کا لباس نوچنا شروع کر دیا۔ جب وہ تقریباً برہنہ ہو گئی۔ اور اس نے مزاحمت ترک کر دی تو میں نے ایک لات اس کے چہرے پر ماری۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ خون کو دیکھ کر میں سنبھلا حالانکہ میں کوشلیا کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے انکا کی ہدایت یاد آ گئی اور میں نے تڑپتے ہوئے ترببنی داس کو مخاطب کیا۔

"ترببنی داس! میں جا رہا ہوں۔ تم نے آج جو سزا میرے لئے تجویز کی تھی اس کا میں خیال رکھوں گا۔ ہماری دوسری ملاقات جلد ہو گی" پھر میں نے کوشلیا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں اسے حقارت کی نظروں سے گھورتا ہوا باہر آ گیا اور تاریکی میں ملازموں کی نظروں سے بچتا بچاتا ترببنی کے بنگلے سے باہر نکل گیا۔ ہوٹل پہنچ کر جب میں اپنے بستر پر دراز ہوا تو میرے سامنے ایک طویل پروگرام تھا۔ میں اپنے اندر غیر معمولی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ میرا پورا ماضی میرے سامنے تھا۔ چہرے میری نظروں کے سامنے ابھر رہے تھے۔ ایک طویل مشقت کے بعد کہیں یہ دن آیا تھا۔ اس رات میں۔ بہت دنوں بعد سکون کی نیند سویا۔ صرف مجھے انکا کا انتظار تھا۔ دیکھیں وہ کب میرے پاس واپس آتی ہے — آنے والا کل میرے لئے بہت اہم تھا۔

ترببنی کے ساتھ جمیل احمد خاں نے کیا برتاؤ کیا۔ آنیوالے کل میں جمیل احمد خاں کی صبر آزما زندگی میں کیا تبدیلی واقع ہوئی کیا انکا حسب وعدہ اس کے سر پہ آ گئی۔؟؟
یہ دلچسپ اور پراسرار سلسلہ جاری ہے۔ بقیہ واقعات۔
آئندہ شمارے میں
میں ملاحظہ فرمائیں